جلد (۸) شمارہ (۱)

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ ماہ شہریور ۱۳۴۲ف م ماہ جولائی ۱۹۳۳ء

جلد (۸) — شمارہ (۱)

فہرست مضامین

نشان سلسلہ	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	افتتاحیہ		۴
۲	معلم کون ہے؟	جناب سید علی محمد صاحب اجلال	۵
۳	فروبل اور کنڈر گارٹن (۲)	" سید نور الحسن صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی علیگ ڈپ ایڈ سی۔ ٹی (گلاسگو)۔	۷
۴	میڈیم مانٹی سوری	جناب فیض محمد صاحب بی۔ اے۔ ڈپ ایڈ عثمانیہ	۱۵
۵	جان ڈیوی	جناب نواب میر احمد علیخاں صاحب ایم۔ اے ایم۔ ایڈ (لیڈز) لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی ٹریننگ کالج	۲۲
۶	ماڈل پرائمری اسکول	جناب مس اے ٹائیلر صدر معلمہ۔	۲۷
۷	ابیات	جناب مولوی ناظم حسین صاحب قمر	۳۲
۸	تنقید و تبصرہ		۳۴
۹	شذرات		۳۶
۱۰	تعلیم ریاضی	جناب ڈی بی بھوگلے صاحب بی۔ اے بی۔ ٹی	۹۴.۷۳ / ۵۲ ۴۱

اِفتتاحیہ

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

افسوس کہ مولانا سید علی حیدر صاحب نظم طبا طبائی المخاطب نواب حیدر یار جنگ بہادر نے ۱۸ محرم ۱۳۵۲ھ م ۱۸ امر تیر ۱۳۴۲ف کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف حیدر آباد دکن محلہ ملا پلی میں صبح کو دفعۃً سعال کی شدت میں قلب کی حرکت رک جانے سے رحلت کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ؎

آہ از نیرنگی عالم کہ ہستند درجہان
ہر کمالے را زوال و ہر بہارے را خزان

نواب صاحب مرحوم کے والد جناب میر مصطفیٰ حسین صاحب مرحوم ابن میر محمد مہدی صاحب مرحوم ابن سید مکرم خان صاحب طباطبائی فوجدار جلال آباد تھے جنکا یہ ایک شعر "سیر المتاخرین" میں درج ہے ؎
ہمنے ابتک تو ترا عشق نباہا آہا ۔ کھا کے سو طرح کے غم۔ حیف پر تو نے کسی طرح نہ چاہا آہا۔ بانی جور و ستم
آپ کی حقیقی دادی جناب ذکیہ بیگم صاحبہ مرحومہ نواب مختار الدولہ بہادر (جو نواب آصف الدولہ بہادر کے عہد حکومت میں وزیر اودھ تھے) کی حقیقی پوتی تھین آپکا سلسلہ نسب حضرت امام حسنؑ ابن علی ابن ابیطالب علیہ السّلام تک پہنچتا ہے۔ اسمعیل بن ابراہیم بن حسن بن علی بن ابیطالب علیہ السلام کا لقب طباطبا ہے اور ان کی اولاد طباطبائی کہلاتی ہے کہتے ہیں کہ اسمعیل بچپن میں قاف کا تلفظ طا سے کرتے تھے۔ عید کے لئے باپ نے پوچھا کہ تمھین کون چیز پہننے کی بنوادی جائے۔ کہا۔ "طبا طبا" یعنے "قبا قبا" اس دن سے اُن کا لقب طباطبا ہو گیا آپ کا آبائی وطن لکھنو تھا چنانچہ آپ بھی ۱۸۵۲ء مطابق ۱۶ صفر ۱۲۶۸ھ

میں بمقام لکھنو محلہ حیدر گنج قدیم میں پیدا ہوئے۔

عربی ادبیات وغیرہ آپنے ملا طاہر نحوی اعلی اللہ مقامہ سے تمام وکمال حاصل کئے فارسی اور علم عروض وغیرہ میں منشی مینڈو لال راز کے شاگرد تھے علوم منطق وفلسفہ وغیرہ آپنے علامہ مولوی محمد علی صاحب قائمۃ الدین جو علامہ مفتی میر عباس صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ سے پیشتر مفتی تھے حاصل کئے عربی اور فارسی کے تمام فنون میں آپ کو اعلی دستگاہ تھی آپ کے مختلف مضامین جو مختلف رسالون میں شائع ہورہے ہیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپنے ہر فن پر محققانہ نظر ڈالی ہے حقیقت یہ ہے اس زمانہ میں آپ کی ذات پر علامہ کا اطلاق صحیح معنون میں تھا۔

تقریباً سولہ سترہ برس کے سن تک آپنے لکھنو ہی میں تعلیم وتربیت پائی وہان سے پھر اپنے والد کے ہمراہ کلکتہ مٹیا برج میں تشریف لائے ایک مدت تک یہین رونق افروز رہے اور تحصیل علوم و مطالعہ کتب علمیہ میں مشغول رہے اس درمیان میں اکثر لکھنو بھی جایا کرتے تھے۔ مٹیا برج میں جب شاہزادوں کا مدرسہ قائم ہوا تو اس مدرسہ میں آپ بھی اعلی درسیات کے پڑھانے پر متعین ہوئے اور جبتک یہ مدرسہ قائم رہا آپ اپنی خدمت کو انجام دیتے رہے ۱۳۰۵ھ میں جب نواب واجد علی شاہ بہادر بادشاہ اودھ نے انتقال کیا اور مدرسہ شہزادگان ٹوٹ گیا تو آپ کو مولوی میر افضل حسین صاحب مرحوم میر مجلس عدالت العالیہ نے اپنے فرزند آغا سید حسن صاحب مرحوم کی تعلیم کے لئے مٹیا برج سے تار دیکر حیدرآباد دکن میں بلوایا کچھ دنون کے بعد آپ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی کے مہتمم ہوگئے اسکے بعد پرنسپل مسٹر ہڈسن کے زمانہ میں آپ نظام کالج میں عربی کے پروفیسر ہوئے تقریباً بیس سال تک اسی خدمت کو انجام دیا پھر ہمارے اعلیحضرت قوی شوکت حضور سلطان العلوم مدظلہ العالی نے شہزادگان والاشان کی اتالیقی پر مامور کرکے شرف عزت بخشا تقریباً چار سال یہ خدمت انجام دیتے رہے پھر دار الترجمہ میں بعہدۂ ناظر ادبی تقریباً آٹھ سال رہے اسکے بعد وظیفہ پر علیحدہ ہوگئے لیکن وضع اصطلاحات کی کمیٹیوں میں انتقال سے ایک روز پیشتر تک شریک ہورہے اور اپنی مفوضہ خدمت کو انجام دیا۔

مدرسہ فوقانیہ دار العلوم سے ہر سال طلبہ شعبہ عربی ودینیات سے پنجاب یونیورسٹی میں فاضل وعالم وغیرہ کے امتحان دینے جایا کرتے تھے لارڈ کرزن نے جب یہ قانون پاس کیا کہ ہر صوبے کے مدارس اسی صوبے کی یونیورسٹی کے تحت رہیں تو دار العلوم کے طلبہ جو پنجاب میں امتحانات دینے کی اس سال تیاری کر رہے تھے مایوس ہوگئے آپنے اس امر کا احساس کرتے ہوئے ڈاکٹر اگھورناتھ پروفیسر سائنس نظام کالج سے ذکر کیا چنانچہ آپ کی اور ڈاکٹر صاحب موصوف کی کوششوں سے حیدرآباد ہی میں یہ امتحانات قائم ہوگئے

اور آپ بھی منشی۔ عالم۔ فاضل وغیرہ کے ممتحن رہے۔

مدراس یونیورسٹی میں عربی فارسی کے امتحانات افضل العلماء فاضل وغیرہ جو قائم ہوئے وہ آپ ہی کی سعی مشکور کا نتیجہ ہیں۔

عربی ادب میں "بنیات۔ معربات۔ تعریب الاطفال ہیں۔ عربی علم ہیئت میں۔ تشریح الافلاک ہے اردو میں تلخیص عروض و قافیہ۔ شرح دیوان غالب۔ قابل قدر تصانیف ہیں۔

ترجمہ تاریخ طبری جلد دوم۔ شول ہسٹری آف انگلینڈ کے چار ابواب کا ترجمہ کیا ہے۔ شرح دیوان امرالقیس (غیر مطبوعہ)۔ نظم طباطبائی جزو اول نظم طباطبائی جزو ثانی (غیر مطبوعہ) دیوان طباطبائی یعنے صوت تغزل ان کے علاوہ آپ کے بہترین اور نادر مضامین مختلف عنوانوں پر شائع ہو چکے ہیں اگر وہ سب ایک کتاب کی صورت میں لائے جائیں تو ایک نادر و عجیب مجموعہ ہوگا۔

آپنے اپنے مخصوص تلامذہ کو خاص توجہ اور انہاک سے اپنے بحر علم و فن سے سیراب کیا ہے آپ شاگرد بنانے میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے اس کی وجہ آپ کی علمی مصروفیتیں تھیں پھر بھی بہت شاگرد ہیں ہر فن میں طلبہ نے آپسے استفادہ کیا ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار مصنف فسانۂ آزاد وغیرہ۔ مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم لکھنوی میر نواز شر علی صاحب لمع مرحوم۔ غلام مصطفےٰ صاحب ذہین مرحوم میجر شائق حسین صاحب مرحوم سفیر عابد مرزا صاحب بیگم میر مہدی علی صاحب شہید۔ حکیم محمد عابد صاحب عابد۔ مولوی سید علی محمد صاحب اجلال خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

مرحوم نے ادب اردو کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اُن کا احصا ناممکن ہے اور مولانا کی وفات سے ملک و قوم کو جو صدمہ پہونچا ہے اُس کی تلافی مشکل ہے۔

ہماری جناب باریتعالیٰ کے حضور میں دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

معلّم کون ہے؟

از سید علی محمد اجلال مولوی عالم مدرس مدرسہ فوقانیہ چنچل گوڑہ سرکار عالی

معلّم وہ ہے جس نے علم حاصل کرکے سمجھا ہو — وہ ہو سرمایہ دار عقل اپنے فن میں یکتا ہو
لٹائے گوہر معنی سحاب چرخ پیما ہو — وہ کانِ علم ہو بہتا ہوا حکمت کا دریا ہو
کثافت جہل کی سب قلب کے دامن سے دھو جائے
اگر پیاسا کوئی آئے تو وہ سیراب ہو جائے

معلّم وہ ہے جس کے علم کا فیضان جاری ہو — خزاں ہو عالم امکان میں یا فصل بہاری ہو
گلوں سے علم کے یوں محفل حکمت سنواری ہو — دلوں پر طالب العلموں کے کیف علم طاری ہو
بڑھے ہر ایک کی ہمت اُمنگیں دل میں پیدا ہوں
صدائے اطلبوا الحکمۃ کو یہ سب سنکے شیدا ہوں

معلّم وہ ہے جو دل میں سموئے علم و حکمت کو — اشاروں میں جو کردے منکشف راز حقیقت کو
لباسِ حسن پہنا کر دکھائے فن کی صورت کو — کشش پیدا ہو جذب دل کرے مائل طبیعت کو
حصول علم کا ہر اک کے دل میں ذوق پیدا ہو
رہ ناآشنا سے سعی کرکے خود شناسا ہو

معلّم وہ ہے جو دکھلائے علم و فن کی منزل کو — معلّم وہ ہے جو عالم بنا دے ایک جاہل کو
معلّم وہ ہے جو دل سے مٹا دے نقش باطل کو — معلّم وہ ہے جو بخشے صفا آئینہ دِل کو
جِلا دے نفس کو تدبیر ایسی وہ ریاضت کی
اُتر آئے دلِ طلاب میں تصویر حکمت کی

معلّم وہ ہے جو خود پاؤں پر اپنے ہو اِستادہ　　اَور اُس کے ساغرِ ہستی میں ہو عرفان کا بادہ
کہیں دیکھے اگر وہ تشنۂ حکمت کو اُفتادہ　　وہ ہو اِثیار فطرت سے مے پلانے پر ہو آمادہ

پلائے اِسقدر شوق طرب میں جوش آجائے
نشّے میں اِتنا وہ بیہوش ہو کہ ہوش آجائے

معلّم وہ ہے جو طلّاب کی فِطرت سمجھتا ہو　　مہذب ہو اور اَخلاق حمیدہ سے مُحلّیٰ ہو
محبت کیش ہو جذبات کی اِک دِلمیں دُنیا ہو　　مسّرت اَور خوشی کا وہ مجسّم اِک نمونہ ہو

دِل مغموم سے رنج والم کافور ہو جائے
جو آئے غم زدہ اِس بزم میں مسرُور ہو جائے

مُعلّم وہ ہے جو روحِ رواں ہو درسگاہونکی　　وہ خود بھی اِک ضیا ہو علم کی تاریک راہونکی
بڑھادے روشنی طلاب کے دِل اور نگاہونکی　　حقیقت میں وہ ہو اِک فرد قومی خیر خواہونکی

تسلّی اَور دلاسا دیکے ہمّت کو بڑھاتا ہو
پدر کیطرح مُشفق بن کے بچوں کو پڑھاتا ہو

فراہم اِس طرح سے وہ کرے سامانِ حکمت کو　　بنادے رشکِ فردوسِ بریں میدانِ حکمت کو
کرے آراستہ ہر گوشۂ ایوانِ حکمت کو　　بہار آگین بنادے ہر گلِ بستانِ حکمت کو

بسانِ توعروسِ ناز پرور جب سنور جائے
پری بن بن کے حکمت شیشۂ دِل میں اُتر جائے

فروبل اور کنڈرگارٹن

از

جناب سید نورالحسن صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) ڈپ ایڈ سی۔ ٹی (گلاسگو)

(۲)

کنڈرگارٹن کے معنی فروبل کی زندگی خصوصاً لڑکپن قید میں گذرا تھا نہ ہنسی کی اجازت تھی نہ کھیلنے کا حکم۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ محبت اور اُنسیت کے ذریعہ سے بچوں کی قوت کارکردگی کو بڑھانا چاہتا تھا بچے کام کرنے سے سیکھتے ہیں۔ کسی کام میں مشغول و منہمک ہونے کے بعد وہ خود بخود آلات و اسباب سے واقف ہوجاتے ہیں۔

عمل دماغ کی دوسری قوتوں کو استوار کرتا ہے۔

کنڈرگارٹن کے معنی بچوں کے باغ کے ہیں۔ مدرسہ مثل ایک باغ کے ہونا چاہیئے جسکے نازک پودے بچے ہیں۔ ان پودوں کو نہایت ہوشیاری سے بڑھنے کا موقع دینا چاہیئے۔

مختلف النوع آلات جو فروبل بچوں کو پیش کرتا ہے اُن کو تحفہ کے نام سے یاد کرتے ہیں اور مدرسہ کا کام کھیل کہلاتا ہے کھیل کا نام ہی بچوں کے لئے جادُو کا اثر رکھتا ہے۔ وہ کام کو کھیل سمجھکر نہایت محنت اور دلچسپی سے کرتے ہیں۔ اِسطرح سے تعلیم سے دلچسپی اور معلومات حاصل کرنے کی خواہش اُن میں بچپن سے جاگزین ہوجاتی ہے چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیر تک بیٹھنے اور کھڑے رہنیکا حکم نہ دینا چاہیئے اور اُنہیں کبھی یہ محسوس نہ ہونا چاہیئے کہ جب تک وہ

مقررہ کام کو ختم نہ کریں آزاد نہیں۔

بستانِ اطفال کے قیام کی ضرورت:- اوّل تو ہندوستان کی معاشی حالت اسقدر ابتر ہے کہ کھانے کو غذا اور پہننے کو کپڑا میسر نہیں آتا۔ آبادی کا بیشتر حصہ فاقہ کشی کی مصیبتیں جھیل رہا ہے کثرت آبادی ایسے اشخاص کی ہے جو لاعلمی کی وجہ سے زندگی صحیح معنی میں بسر کرنا نہیں جانتے ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سوائے چند مخصوص خاندانوں کے جنکو اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے کوئی بچوں کو باقاعدہ طور پر تعلیم و تربیت نہیں دیسکتا یہ ناممکن ہے کہ ہر گھر میں بہترین آلات تعلیم مہیا کئے جا سکیں۔

اگر ایسا ممکن بھی ہو تو بھی بچوں میں وہ خوبیاں پیدا نہیں ہوسکتیں جنکی بیسویں صدی میں ضرورت ہے۔ خانگی تعلیم یافتہ لڑکوں کا زاویہ نگاہ محدود ہوتا ہے۔ ان کو گنتی کے چند لوگوں کی زندگی دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ انکی ہر ضد اور ہر ہٹ گھر میں پوری کیجاتی ہے۔ گھر میں بچے کسی خاص ضابطہ اور لائحہ عمل کے پابند نہیں ہوتے۔ گھر کی تعلیم فن تعلیم کے لحاظ سے اور تربیت فن تربیت کے مطابق نہیں ہوتی۔

علاوہ بریں اجتماعی زندگی کا خواب بھی بچہ گھر میں نہیں دیکھتا۔ انفرادی زندگی کا وہ عادی ہوتا ہے اور اسی وجہ سے خود غرض اور خود پسند بن جاتا ہے جماعت کے لئے اپنی ہستی کو مٹا دینا اسکو جب ہی آسکتا ہے جب اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں۔

انفرادی زندگی کا دور گذر چکا۔ بیسویں صدی میں اجتماعی زندگی ہی معرکہ حیات ہے خانگی خامیوں کو کنڈرگارٹن آسانی سے دور کرسکتا ہے۔ یہ تربیت خانے بچوں میں خود اعتمادی پیدا کرتے ہیں۔ انکی تمام استعدادیں اور قابلیتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اجتماعی زندگی عملی طور پر بسر کرتے ہیں جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عملی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں ہندوستان کی بدبختی یہ ہے کہ چھوٹا بڑا اس ملک کا فلاسفر ہے۔ جوان ہو یا بوڑھا سب کے سب خیالی دنیا کے ساکن ہیں۔ ایک شیخ چلی کا دربار ہے جہاں خوب خوب خیالی پلاؤ پکائے جاتے ہیں۔ ہوا میں قلعے بنائے جاتے ہیں۔ اس قسم کی زندگی اس زمانہ میں غالباً بہتر ہو جب کھانے کو افراط سے موجود تھا۔ جب معاشی جد وجہد کا یہ عالم نہ تھا آج ہر شئے تیزی سے حرکت کر رہی ہے ناممکن ہے کہ پڑے پڑے سوچے اور زندگی کی دوڑ میں کامیاب ثابت ہو۔

ضرورت ہے کہ ہم اپنے بچوں کو زندگی کے اس معرکہ کے لئے تیار کریں۔ ان کو [illegible]

سماجی زندگی بسر کرنے کا عادی بنائیں۔ اُن میں روانیٔ عمل۔ سعی۔ عقلمندی اور بصیرت
جیسے جوہر پیدا کریں اِن کو قانونِ فطرت کے مُوافق تعلیم دیں جس سے اِن کے قوا، مضبوط
ہوں اور دماغی قوتوں کی صحیح طور پر نشو و نما ہوسکے۔

رہنمائی اور معاونت کے ساتھ ان کی فطری اُمنگوں کو اُبھارا جائے۔ بُستانِ اطفال
وہ طلسم ہے جس میں یہ سب خُوبیاں موجود ہیں گو ناگوں تبدیلیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ کنڈر گارٹن میں مختلف دماغ اور جسم کی بہبودی کے لئے کھیل کا انتظام کیا جاتا ہے
اِس طریقہ تعلیم کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آئندہ زندگی میں کام خوش اسلوبی اور دلچسپی سے کرتے ہیں۔
خود اعتمادی۔ صفائی۔ صحت۔ محنت۔ پُھرتی جیسے اوصاف اُن میں پیدا ہو جاتے ہیں چونکہ بچوں کو
بات چیت کرنے کی ترغیب دیجاتی ہے۔ لہذا ان کی زبان صاف ہوتی ہے۔ قوت مشاہدہ۔ قوت
اختراع و ایجاد کے اُبھارنے کی خاص طور پر کوشش کیجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عادتیں لڑکپن
میں دل و دماغ پر ثبت ہوجانے کے بعد نقش کالحجر ہوجاتی ہیں۔

نرس۔ آیا اور معلمہ کے انتخاب میں خاص طور پر احتیاط شرط ہے۔ ذرا سی لاپرواہی سے
بچہ کا ستیاناس ہوجاتا ہے۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ کنڈر گارٹن ایک طریق تعلیم ہے۔ کوئی عجوبہ
چیز نہیں۔ روح کنڈر گارٹن کو سمجھنا چاہیئے۔ مدارس میں آزادی محبت اور ہمدردی کا اگر راج
ہو تو بچے خوشی خوشی مدرسہ آئیں گے اور کام اگر دلچسپ کھیل کی شکل میں پیش کیا جائے تو بچے
ہنستے کھیلتے دن تمام کام میں مشغول رہیں گے۔ ہاں معلمہ کے لئے کام ضرور زیادہ ہوجاتا ہے۔ اُسکو
پہلے اسباق تیار کرنے پڑتے ہیں پھر اُن اسباق کو کھیل کی صورت میں تبدیل کرنا پڑتا ہے۔

بستانِ اطفال اور اوسکے آلات و اسباب۔

مدرسہ کی عمارت وسیع ہو تاکہ تازی اور خوشگوار ہوا دل و دماغ کو فرحت بخشے بچوں کی مثال
نازک پودوں اور پھولوں کی طرح ہے جنکو اگر آفتاب کی شعاعوں اور نسیم و صرصر سے محروم کردیا جائے
تو دیکھتے دیکھتے کملا جاتے ہیں خصوصاً ہندوستان کے بچے جن کے والدین شہروں میں زندگی بسر
کرتے ہیں ان نعمت ہائے عظمیٰ سے محروم ہیں۔ ان کے جسمانی اور دماغی قویٰ کمزور ہوجاتے ہیں

مدرسہ کی عمارت عام شاہراہ سے ذرا فاصلہ پر ہونا چاہیئے تاکہ خاک اڑ اڑ کر کمرے میں نہ آتی
رہے اور بے تکی آوازیں کان کے نازک پردوں پر نہ پڑیں۔

مدرسہ سے ملحق ایک باغ کا ہونا لازمی ہے۔ بچوں کو پودوں۔ درختوں۔ پھلوں اور پھولوں سے

خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ فطرت کے دلدادے اگر ایسے ماحول میں پرورش پائیں جہاں ننھے منے پرند۔ چھوٹی چھوٹی رنگین مچھلیاں ،معصوم چوپائے اور نازک خوش رنگ پودے ہوں تو جمالیاتی قوت انکی طبیعت ثانیہ ہو جاتی ہے۔ مدرسہ کے اس بڑے باغ میں بچے اپنے چھوٹے چھوٹے باغیچے خود تیار کرسکتے ہیں۔ جو درخت بچے لگائیں زیادہ تر صدا بہار ہوں۔ مدرس کی رہنمائی سے بچے نہایت آسانی سے باغ میں سیر و تفریح کرتے کرتے موسموں کی تبدیلی کے راز کو سمجھ سکتے ہیں۔ کم از کم انکی سمجھ میں یہ ضرور آجاتا ہے کہ موسم پیداوار پر خاص اثر ڈالتا ہے اور مختلف موسموں میں مختلف پیداوار ہوتی ہے۔

بستان اطفال میں کم از کم دو صاف ستھرے حمام خانے ہونے چاہئیں جنمیں صاف و شفاف پانی کا انتظام باقاعدہ طور پر ہو۔ دن میں ایک مرتبہ تمام مدرسہ کے بچوں کو مدرس کی نگرانی میں غسل دیا جائے تاکہ مدرسہ میں روز نہاتے رہنے سے وہ روزانہ نہانے کے عادی ہو جائیں مرانفرادی صفائی اجتماعی صحت کا راز ہے۔ بچوں کے بہت سے امراض جو غلاظت اور گندگی سے پیدا ہوتے ہیں اس طرح دور کئے جاسکتے ہیں۔

ہر مدرسہ میں ہاتھ منہ دھونے کا سامان ہر بچے کے لئے علیحدہ ہونا چاہیئے خصوصاً تولیہ ہر ایک کیلئے ہونا لازمی ہے۔ مدرس کی نگرانی میں یہ صفائی کے آداب کو خوشی خوشی سیکھ لیتے ہیں۔

اگر ممکن ہو تو چھوٹے چھوٹے پلنگ اور معمولی سا بستر مہیا کر دیا جائے۔ تاکہ بچوں کو سلیقہ سے بستر بچھانا اور لپیٹنا آجائے۔ تعلیم یافتہ ہونے کے بعد بھی ہمکو نوکروں کا محتاج رہنا پڑتا ہے۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ نوکر نہ رکھے جائیں بلکہ قابل تاسف یہ امر ہے کہ بغیر نوکر کے امیر گھرانے کے لڑکے اپنا ذاتی کام کرنا جانتے ہی نہیں۔

اسکے علاوہ کرسی و میز بالکل ہلکی بنی ہوئی ہوں تاکہ بچے آزادی سے انکو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجا سکیں۔ بچوں کی فطرت انکو ایک جگہ نچلا بیٹھنے نہیں دیتی۔ یہ ستم ظریفی ہوگی اگر ہم فطرت کے خلاف انکو ایک جگہ بیٹھنے کا حکم دیں۔

مدرس کی میز اور کرسی کے علاوہ کمرہ میں ایک بڑا تختہ سیاہ ہو اور دیوار پر ایسا انتظام کیا جائے کہ بچے لکیریں کھینچ سکیں۔ بچے فطرتی طور پر مصور ہوتے ہیں دن رات وہ کچھ نہ کچھ نقشے بنایا کرتے ہیں اگر انکی اعانت کیجائے تو انکا یہ جذبہ یقینی ابھارا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ فروبل کا خود قول ہے کہ "تمام تاثرات اظہار کے لئے تڑپتے ہیں" ہمیں چاہیئے کہ بچوں کے تاثرات کا حتی الامکان موقع دیں۔ چھوٹی چھوٹی نیچی نیچی الماریاں ہر درجہ میں موجود رہیں تاکہ بچے کھلونوں کو اٹھا کر رکھ سکیں۔

مدرس کا فرض ہے کہ سجاوٹ اور سلیقہ کو ہر وقت مدنظر رکھے اور جو بچہ بے ڈھنگے طور پر الماری میں رکھتا ہے اُسپر خاص نظر رکھے تاکہ اُسکو اشیا رکا باترتیب طریقہ سے اُٹھانا رکھنا آجائے۔

عکسی اور قلمی تصاویر رنگارنگ کی ہونی چاہیئے۔ تصویر بچوں کی توجہ کو جذب کرتی ہے۔ اُنمین تصویر کے بابت سوالات کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اس شوق کو بڑھانا اور اچھی تصاویر جمع کرنے کا ذوق پیدا کرنا مدرس کا فرض ہے۔ متحرک تصاویر اور طلسمی فانوس کے ذریعہ سے نہایت کارآمد تعلیمی تصاویر بچوں کو دیکھائی جا سکتی ہیں اور اسطرح معلومات میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

دیگر آلات ؛ مٹی جس سے والدین بیحد گھبراتے ہیں اور جس سے بچہ کو قدرتی طور پر لگاؤ ہوتا ہے بستان اطفال کے لیئے ضروری چیز ہے۔ فطرت اسکو مجبور کرتی ہے کہ وہ مٹی میں کھیلے۔ مٹی بچہ کے اعضائے بدن کو تقویت پہونچانے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ علاوہ بریں مٹی پر بچہ طرح طرح کی تصاویر بناتا ہے۔ نئے نئے حروف لکھتا ہے۔ مختلف قسم کی عمارات تیار کرتا ہے۔ یہ ہی ایک چیز ہے جہاں تاثرات کے اظہار کا موقع ملتا ہے ہماری کوتاہ بینی اور لاعلمی اس حقیر چیز کے استعمال سے بھی اُس کو روکتی ہے۔ ہم اندھی محبت کے جوش میں بچے کو قیمتی لباس میں ملبوس کرتے ہیں اور لباس کے خراب ہونے کے ڈر سے بچے کی آزادی کو سلب کرتے ہیں اسکو اس قصور پر کہ قیمتی لباس کو مٹی میں کھیل کے خراب کیوں کیا سزا دیجاتی ہے بہتر یہ ہوتا کہ بچہ کو موٹے سے موٹا کپڑا سستا دیکھکر بنایا جاتا اور آزادی سے کھیلنے کو دنے کی اجازت دیجاتی۔

بچوں کو خاص دلچسپی قصہ کہانی سُننے سے ہوتی ہے اوّل تو مدرس کو اس فن کا اُستاد ہونا چاہیئے دوسرے معہ تصاویر کے کہانی کی کتابیں مدرسہ میں ہونا ضروری ہے۔

ترنم۔ بچہ کے کان سُریلی آوازوں کے سُننے کے اگر عادی نہوں تو زندگی کا آدھا لُطف جاتا رہتا ہے وہ مشرقی اور مغربی ترنم سے لُطف اندوز ہو ہی نہیں سکتے۔ ترنم کی تعلیم پر سقراط اور افلاطون نے جس قدر زور دیا ہے تعلیم یافتہ طبقہ پر ظاہر ہے۔ اس کی ہندوستانی مدارس میں باقاعدہ تعلیم نہونیکا یہ اثر ہے کہ جب صبح کے وقت مدارس میں تعریف گائی جاتی ہے تو کوئی مدھم اور کوئی پنچم سُر میں الاپتا رہتا ہے۔ اگر آلات ترنم مدرسہ میں موجود ہوں اور جن بچوں کو قدرت نے خوش گلوی عطا فرمائی ہے بچپن سے بہترین راگ سنین اور خود گائیں تو نہ صرف یہ کہ اوقات فرصت میں یہ فن دل بہلائی کا بہترین ذریعہ ہوگا بلکہ دوسروں کو محظوظ کر سکیں گے۔

بُستان اطفال میں ماڈل، ریل گاڑیاں، موٹریں، مختلف قسم کے جانور ماڈل گڑیوں کے گھر

اور دیگر ممالک کی طرز زندگی کے ماڈل پیش کیے جا سکتے ہیں۔

تربیت حواس ۔ میڈم میریا مانٹیسوری نے "تربیت حواس" کے لیے خاص آلات ایجاد کیے ہیں جنکے توسط سے قوت لامسہ قوت باصرہ۔ اور قوت سامعہ کو ترقی دیجا سکتی ہے۔ واقعی یہہ آلات اپنا جواب نہیں رکھتے لیکن گران ہونے کی وجہ سے ہندوستان سا مفلس و نادار ملک اپنے مدارس میں ان آلات کی فراہمی کا کفیل نہیں ہوسکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اساتذہ اختراع و ایجاد کی قوت کو کام میں لائیں اور ہندوستانی ماحول کو پیش نظر رکھکر اسی قسم کے آلات تیار کریں۔

فروبل کے تحفے ۔ فروبل نے بیس "تحفے" "بستان اطفال" کے واسطے منتخب کیے۔ فروبل کے تحفے، آجکل مقبولیت کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے غالباً اس وجہ سے کہ موجودہ دنیا مادیت کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہ "تحفے" روحانیت کے قائل اور صوفی منش عالم کی ایجاد ہیں۔

ان تحفوں میں مثلث، مربع، مستطیل شامل ہیں۔ مختلف رنگ کی لکڑیاں۔ دائرے اور نصف دائرے ناپ چھلے۔ نقشہ کشی کے آلات۔ سینے پرونے کے آلات۔ کاغذ کاٹنے کے آلات۔ کاغذ چڑھانے کا سامان۔ ماڈل کا سامان۔ وغیرہ۔

خواہ فروبل کے تحفے مقبول ہوں یا نہوں لیکن "بستان اطفال" کا مفہوم دنیا نے سمجھ لیا اور اور یہ اسکے نام کی بقا کے لئے کافی ہے۔ بچوں کو آزادی دیکر فروبل نے نسل انسانی پر ایک گراں بہا احسان کیا۔ اسکا یہ مقولہ بستان اطفال کے ہر معلم و معلمہ کو یاد رہنا چاہیئے کہ "تعلیم عملی زندگی بسر کرنے کی دنیا ہونی چاہیئے تاکہ کتابوں کی اور مدرسہ کی خود ایک چھوٹی سی دنیا ہو جسمیں بچہ عملی زندگی بسر کرے۔"

بچہ کی زندگی کا پہلا تجربہ عمل ہوتا ہے اور عمل ہی سے وہ سیکھتا، سمجھتا اور معلومات حاصل کرتا ہے لہذا بستان اطفال کی بنیادیں اور پوری عمارت عملی زندگی ہے۔

میڈم مانٹی سوری

از

جناب فیض محمد صاحب بی۔ اے۔ ڈپ۔ ایڈ (عثمانیہ)

انیسویں صدی عیسوی میں جبکہ حکومت نے ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لی تھی، اسکا انتظام خلق اللہ سے محبت رکھنے والوں نے اپنے ذمہ کر لیا تھا اور مالدار اور ذی اثر لوگ حسب حوصلہ دل کھولکر اس کار خیر میں ہاتھ بٹاتے رہے لیکن حکومت کی سرپرستی اور چند مالداروں کی اعانت و دستگیری میں زمین و آسمان کا فرق ہے اسی باعث اس زمانہ میں کم خرچ بالانشین کے اصول کے مطابق ایک مدرس طلباء کی کثیر تعداد کو تعلیم دیا کرتا تھا کیونکہ ظاہر ہے کہ اقتصادی حالات کے تحت اساتذہ کی تعداد کو زیادہ کرنا ایک مشکل بلکہ ناممکن کام تھا۔ اس خصوص میں جو زنٹ رنکا سٹر کا کارنامہ بہت ہی اہم بالشان ہے۔ اس نے "خلیفائی نظام" کی مدد سے طلباء کی ایک کثیر تعداد کو تعلیم دینے کی مشکلات کو بہت بڑی حد تک حل کیا لیکن ان حالات کے ماتحت ضبط اور تدریس دونو میکانیکی تھے اور یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ طلباء کی ایک کثیر تعداد ایک ہی کام کر سکتی ہے۔

لیکن جب حکومت نے ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ کی تو اس کی صورت بالکل بدل گئی آج یہی وجہ ہے گذشتہ صدی کے تعلیمی طریقوں میں ہمیں نمایاں تبدیلیاں اور ترقیاں نظر آتی ہیں۔ اگرچہ اب بھی اجتماعی تعلیم کا طریقہ رائج ہے اور اس کی تائید میں یہ کہا جاتا ہے کہ طلباء کی کثیر تعداد کو ایک ہی قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے تاہم بیسویں صدی سے تعلیم میں انفرادیت کا خیال زیادہ کیا جانے لگا اور نفسیات اور مطالعہ اطفال کے مدنظر ماہرین فن تعلیم نے اس حقیقت سے آگاہی حاصل کی کہ طلباء میں انفرادی تفرقات بہت زیادہ ہوتے ہیں اور کسی جماعت کے طلباء کے لئے ایک ہی قسم کا مواد مضمون مقرر کرنا اور سب مضامین کے لئے تمام کو ایک ہی وقت دینا ایک لغو اور فضول سی بات ہے اسی باعث اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ طلباء پر انفرادی طور سے توجہ دیکر ان کی

انفرادی مشکلات کو حل کیا جائے۔

اِس حقیقت کا بے نقاب ہونا بچوں کے لئے آیہ رحمت ثابت ہوا۔ بہت سے لوگوں نے اِس سلسلہ میں نمایاں کام انجام دیے لیکن اٹلی کی مایہ ناز خاتون ڈاکٹر سیریا مانٹی سوری کا طریقہ تعلیم اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک خاص اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اِسی وجہ سے بچوں کی تعلیم کی حد تک اُس کو عہد حاضر کی بہت ہی ممتاز ماہر تعلیم تصور کیا جاتا ہے۔

ابتدائی حالات۔ میڈیم مانٹی سوری پیشہ کے لحاظ سے پہلے ایک ڈاکٹر تھی۔ علم طب کی تکمیل کے بعد اُس کا زیادہ رجحان بچون کے علاج کی طرف رہا اور عرصہ دراز تک اس کام کو انجام دینے کی وجہ سے وہ بچوں کی عام و خاص بیماریوں اور اُن کے معقول علاج سے کما حقہٗ واقف ہوگئی اِس کے بعد اس نے معذور بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ دی۔ اِس معاملہ مین وہ آئیٹارڈ Itard اور سیگوئین Seguin کی اِن تحقیقات کی رہین منت ہے جو اُنھون نے معذور بچون کیلئے کی تھین۔ یہ دونو مختلف تجربات کے بعد انفرادی دماغی قابلیتون کا مطالعہ کر کے اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ دماغی قابلیت میں اگر خامی یا کمی ہو تو اُس کو دور کر کے اس میں ترقی دیجا سکتی ہے۔ یہ نتیجہ ڈاکٹر موصوفہ کے لئے راہ نما ثابت ہوا۔ چنانچہ آئیٹارڈ کے متعلق اُس کا خیال ہے کہ "آئیٹارڈ کی تعلیمی تصانیف بہت دلچسپ اور تعلیمی جدوجہد اور تجربوں پر مشتمل ہیں اور آج بھی جو کوئی اُن کو پڑھتا ہے یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اصل میں تجرباتی نفسیات پر اس کی کوشش پہلی کوشش تھی۔"

آئیٹارڈ اور سیگوئین کے خیالات کی روشنی میں مانٹی سوری بچون کی تعلیم کی طرف ایک خاص مطمح نظر کے ساتھ رجوع ہوئی۔ وہ بچون کی بیماریوں کے چڑھاؤ اُتار سے پوری طرح واقف تھی اِسی باعث اس کو بچون کی تعلیم کے لئے مناسب و موزوں طریقے وضع کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کا خیال ہے کہ بچوں کی تعلیم میں سب سے زیادہ اہم چیز دلچسپی ہے۔ تا وقتیکہ یہ برقرار نہ رہے تعلیم کوئی عمدہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ اِس خیال کے مدنظر مانٹی سوری نے اپنے جو تعلیمی آلات ایجاد کئے ہیں وہ نہ صرف دلچسپ ہی ہیں بلکہ بچے از خود اُن سے کام کرتے ہیں گویا اس طرح سے وہ اپنے آپ کو تعلیم دیتے ہیں۔ یہ تربیت خالص موضوعی نہیں ہے بلکہ اُس کا منشاء بچون کے ذہنی قویٰ کو ایک عام ترقی دینا ہے۔ یہان یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید یہ سست طریقے نصاب سے بہت ہٹے پڑے ہون گے لیکن مانٹی سوری نے آلات کی تشکیل کچھ اس انداز سے کی ہے کہ نصاب کے مقاصد اور نصاب العین کو اُس سے کسی قسم کا صدمہ نہیں پہونچتا بلکہ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ بچے عام طریقہ سے جلد اِس طریقہ

تعلیم سے تحتانیہ سے نکلکر وسطانیہ میں داخل ہونے کے قابل بن جاتے ہیں۔ یہ بھی بجائے خود
مانٹی سوری کے اصول تعلیم کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ ہے۔

ڈاکٹر موصوفہ کے اصول معذور بچوں کے ساتھ ساتھ صحت مند بچوں کے لئے بھی وہی اہمیت
رکھتے ہیں اور اُن کے ذہنی قویٰ کی اسی طرح عمدگی اور خوبی سے نشوونما ہوتی ہے۔ گویا سب طرح کے بچے
اس کے اصول سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ ۱۹۰۷ئہ میں روما کے ایک ضلع نسان لارنسزو میں اُس نے
ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس کا نام اُس نے بجائے "مدرسہ" کے "خانہ اطفال" رکھا۔

آلات تعلیمی۔ مانٹی سوری نے بچوں کی تعلیم کے لئے جو تعلیمی اشیا رتیار کی ہیں اُن کو تعلیمی آلات
کہا جاتا ہے۔ اُن کو ایسی جگہ رکھا جاتا ہے جہاں بچوں کا ہاتھ آسانی سے پہونچ سکے۔ بچوں کو میز کرسی
دیجاتی ہے اور انہیں اختیار ہے کہ اگر وہ چاہیں تو فرش پر بھی کام کریں۔ استاد کی ہدایت (نہ کہ حکم)
اور اپنی مرضی کے مطابق بچے کام کرتے ہیں۔ آزادی اور خود مختاری کی تعلیم خاص مطمح نظر ہے۔ البتہ صرف
اتنی روک ٹوک کی جاتی ہے کہ ایک بچہ دوسرے کے کام میں خلل انداز نہ ہو اس طرح بچوں میں خود ضبطی
بھی پیدا ہوجاتی ہے۔

قبل اس کے کہ مانٹی سوری آلات کی تفصیل پیش کی جائے اس کے چند تعلیمی خیالات
کو واضح کردینا نامناسب نہ ہوگا۔ مانٹی سوری سزا و جزا کی قائل نہیں ہے بلکہ اُس کا خیال ہے کہ
سزا اور انعامات مصنوعی یا جبری کوششوں کی طرف محرکات کا کام دیتے ہیں یعنی اُسکا مطلب بچوں کو
فطری ترقی یا سعی کی طرف مائل کرنا ہے۔ وہ بچوں کے لئے ترقی جماعت کو انعام کا نعم البدل تبلاتی ہے
اور حقیقت میں بچوں اور بالغوں دونوں کے لئے یہ ایک اچھا انعام ہے۔ نیز ڈاکٹر موصوفہ کا خیال
ہے کہ اگر ماحول میں آزادی کی اسپرٹ ہو اور طلبا رکے لئے اُن کے مدارج عمر کے لحاظ سے کام کرنے
کے واسطے بہت سی چیزیں مہیا ہوں اور وہ خوشی سے اپنا کام انجام دینے پر تیار ہوں تو پھر سزا و جزا
کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ بچے ہنسی خوشی مشکل سے مشکل کام بھی خود انجام دینے میں دریغ
نہ کرینگے۔ مانٹی سوری کے کم وبیش تمام تعلیمی آلات میں بھی آزادی اور ذاتی سعی کی روح کارفرما نظر
آتی ہے۔

تعلیمی آلات کی تفصیل۔ مانٹی سوری کے خیال کے مطابق ابتدائی مدراج میں تعلیم کا اصول یہ
ہونا چاہیئے کہ اس سے حسی تربیت اور انفرادی آزادی کا منصوبہ پورا ہو، نیز بچہ میں ذاتی سعی و حسی
امتیاز پیدا ہو مانٹی سوری کے تمام تر آلات اسی قسم کی تعلیم کے لئے ہیں۔ ان کا تفصیلی ذکر بہت

طول ہے اس لئے مُشتے نمونہ از خروارے چند آلات کی تفصیل یہاں درج کیجاتی ہے جس سے اُسکے اُصولوں کی بڑی حد تک وضاحت ہوجائیگی۔ تفصیل کے لئے خود مانٹی سوری کی لکھی ہوئی کتابیں ہر مدرس اور ماں باپ کے لئے مُفید ثابت ہونگی۔

شکل (۱) میں مختلف قطر اور بلندی کے دس اسطوانے ہیں اُن کا مقصد حِسِ بصری کی تربیت اور ابعاد کا اِدراک ہے۔ لکڑی کے کندے میں جو سُوراخ ہیں اُنہیں یہ اسطوانے چست بیٹھتے ہیں ہر اسطوانے کے سرے پر ایک گنڈی ہے تاکہ اُسکو بآسانی نکالا جاسکے۔ پہلے سیٹ sets میں اسطوانوں کی بلندی یکساں اور قطر مختلف ہیں، دوسرے میں قطر مساوی اور بلندی مختلف ہے حتیٰ کہ آخری اسطوانہ قرص کے مانند ہے۔ تیسرے سیٹ میں اسطوانہ مختلف قطر اور مختلف بلندی کے ہیں۔

جب بچہ ان اسطوانوں کو دیکھتا ہے تو فطری طور پر اُن کو نکالنے کی ایک خواہش اُس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور جب بچہ سب اسطوانے باہر نکال لیتا ہے تو پھر اُن کو جمانے کے لئے وہ کوشش کرتا ہے اور یہ اُس کے لئے بہت دلچسپ کام ہوتا ہے اور وہ انجان طور پر بصری اِدراک سے کام لیتا ہے۔

شکل (۲) میں دس ذو اربعتہ الاضلاع منشور ہیں۔ یہ بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور بچہ انکو ترتیب دیکر زینہ بناتا ہے اِس طرح سے بچہ کو مختلف موٹائیوں کا اِدراک ہوتا ہے۔ پہلے آلہ میں سوراخ ایک حد تک بچہ کی رہبری کرتے ہیں کیونکہ اگر وہ چھوٹے سُوراخ میں بڑا اسطوانہ داخل کرنا چاہے تو ایسا ممکن نہ ہوگا برخلاف اِسکے یہاں آنکھ کو ترتیب کی خامیوں کو محسوس کرنے کا موقع ملتا ہے اور حِس بصری کی کماحقہ ترتیب ہوتی ہے۔

شکل (۳) میں مینار کی تصویر ہے۔ جسامت کے اِدراک کی مشق کے بہ نسبت مفید ہے۔ لکڑی کے کندوں سے بچہ مینار بناتا ہے جس کے لئے اُسے خاصی ورزش کرنی پڑتی ہے اور ہوشیاری سے کام لینا پڑتا ہے۔

طول کے اِمتیاز کے لئے بچہ کو مختلف طول کی سلاخیں دیجاتی ہیں سب سے بڑی سلاخ کا طول ایک میٹر اور چھوٹی کا ایک ڈیسی میٹر ہوتا ہے ہر ایک سلاخ کو ایک ایک ڈیسی میٹر کے فاصلہ سے دو رنگوں مثلاً سُرخ و نیلگوں سے رنگا جاتا ہے اور بچوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ رنگ کے لحاظ سے انہیں جمائیں۔ اِس طرح وہ حساب کی ابجد سے تھوڑا بہت واقف ہوجاتے ہیں، ایک سے دس تک

گننا سیکھتے ہیں اور اعشاریہ کے بھی تھوڑے بہت تصورات اُنہیں حاصل ہو جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے آلات ایسے ہیں جن کے ذریعہ دیگر حواس کے ساتھ ساتھ ادراک کی بھی کماحقہ تربیت ہوتی ہے مثلاً مختلف رنگوں کی پہچان کے لئے رنگین ریشمی ڈوریاں استعمال کی جاتی ہیں۔ حسّ سماعت کی تربیت و امتیاز کے لئے مختلف بند اسطوانی ڈبے لیکر ان میں کنکر ڈالتے جاتے ہیں جس سے آوازیں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

حروف مختلف وضعوں کے خوبصورت ہوتے ہیں۔ سنہری، سفیدی، سیاہ، بچہ ان سے فطری طور پر دلچسپی لیتا ہے اور ساتھ ہی مختلف قسم کے رسم الخط سے واقف ہوجاتا ہے۔ یہ حروف نہایت خوبصورت اور جاذب نظر ڈبوں میں رکھے ہوتے ہیں۔

مانٹی سوری نے اپنے آلات میں خاص طور پر ورزش جسمانی کا خیال ملحوظ رکھا ہے، اشکال ۲۵، ۲۶، ۲۷ سے واضح ہوگا کہ ایک فریم کے اندر کپڑے رکھے ہوتے ہیں۔ بچے گنڈیاں لگانے اور ڈوریاں باندھنے کی مشق کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ مانٹی سوری کے طریقہ پر جن بچوں کی تعلیم ہوتی ہے وہ کپڑے پہننے اور اُتارنے کے معاملہ میں عام بچوں سے زیادہ چالاک ثابت ہوتے ہیں اور اُس کام کو بہت جلد سیکھ لیتے ہیں۔

ہم نے یہاں صرف چند آلات تعلیمی کا ذکر کیا ہے لیکن اُن کے تفصیلی جائزہ سے حیرت ہوتی ہے کہ اُس پر تعلیم نے اپنی تعلیم میں زندگی کے تقریباً تمام شعبوں کی خاص رعایت رکھی ہے حالانکہ مدرسہ کی تعلیم خواہ وہ کسقدر رہی مکمل کیوں نہ ہو، اس عام تعلیم کا تتمہ ہوسکتی ہے جو بچہ اپنے گھر اور باہر کے سماجی اور طبعی ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ مدرسہ کی تعلیم کا مقصد تعلیم کے تمام وسیع میدان پر حاوی نہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب بچہ مدرسہ میں شریک ہوتا ہے تو اس وقت وہ بہت کچھ تعلیم حاصل کیا ہوا ہوتا ہے چنانچہ زبان کی مثال کو لیجئے۔ بچہ بہت کچھ گھر ہی میں سیکھ کر آتا ہے اور سب بچے یکساں سیکھے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ ان کے اکتساب کا معیار اُن کے گھروں کی عام حالت کے متناسب ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مدرسہ کا مقصد مکمل تعلیم دینا نہیں بلکہ وہ عام تعلیم کا ایک تتمہ ہے بنابریں یہ درست طور پر کہا جاسکتا ہے کہ گنڈیاں لگانا اور ڈوری باندھنا سکھلانا فضول اور زائد کام ہیں لیکن مانٹی سوری اپنے خیال کی تائید اسطرح کرتی ہے کہ اس قسم کے کھلونوں کے استعمال سے بچے از خود کپڑے پہننے اور اُتارنے کی حرکات سے واقف ہوتے ہیں اور مزید و مکرر مشق سے اُن کو استعمال بھی کرسکتے ہیں لیکن ڈاکٹر موصوفہ کا یہ خیال کسیقدر مبہم ہے کیونکہ ہم اپنی ٹائی آسانی سے باندھ سکتے ہیں لیکن

جب میز پر رکھی ہوئی ٹائی کو گرہ دینی ہو تو پھر ذرا دِقت ہوتی ہے۔ اِس کے برخلاف اگر میز پر رکھی ہوئی ٹائی کو گرہ دینے میں مشق ہو تو خود اپنی ٹائی باندھنے میں دِقت ہوتی ہے۔ اِسی لئے فریم میں کھچے ہوئے کپڑوں پر مشق کروانا کچھ زیادہ بہتر نہیں بلکہ اگر بچوں کو خود کپڑے پہننے کا موقع دیا جائے تو احسن ہوگا۔

اگرچہ میڈیم مانٹی سوری اِس معاملہ میں بہت دُور نکل گئی ہے تاہم اس کی مشق کوئی بُری چیز بھی نہیں ہے چنانچہ ہمارے یہاں تو اس چیز کی سخت ضرورت ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں اور افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں امیروں کے بچوں کو بڑی عمر میں بھی کپڑے پہننا اور اُتارنا برابر نہیں آتا۔

یہاں تک تو ہم نے مانٹی سوری کے سادہ اور آسان آلات تعلیمی کا ذکر کیا ہے، اَب اعلیٰ تعلیمی آلات کو لینگے لیکن اُس سے قبل یہ مناسب ہوگا کہ فروبل کے تحائف اور اُس کے تعلیمی آلات میں جو مشابہت یا اختلاف ہے اس کا اندازہ لگالیں۔

سرسری نظر میں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مانٹی سوری کے آلات فروبل کے تحائف اور مصروفیات کی ایک ترقی یافتہ صورت ہیں اور دونوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ دونوں میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ مانٹی سوری تعلیم میں بچہ کی ذاتی سعی کا بہت زیادہ خیال ملحوظ ہے۔ اور بچہ کو مکمل آزادی دیجاتی ہے برخلاف اِسکے گو کنڈرگارٹن یا بالک باغ میں آزادی کی جھلک نظر آتی ہے تاہم اِس پر اجتماعی تدریس کا رنگ بہت کچھ غالب ہے کیونکہ ایک ہی وقت میں ایک ہی تحفہ لیکر پوری جماعت ایک ساتھ کام کرتی ہے۔ مثلاً پہلے تحفہ میں اُستاد بچوں کو گولے دیتے ہوئے کہتا ہے۔

بچو مجھے اپنے چھوٹے ہاتھ بتلاؤ
میں تمہیں ایک چھوٹا گولہ دوں گا
اَب اسے بند کرو اور چھوڑ دو
ایک پرندے کیطرح جو اپنے گھونسلے میں ہو

بچے آپسمیں گولوں کا تبادلہ کرتے ہوئے گاتے جاتے ہیں، گو یہاں بھی آزادانہ عمل کا کچھ شائبہ نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بچے ایک دوسرے کے ساتھ ملکر اجتماعی طور پر کام کرتے ہیں اور اُستاد اُن کی رہبری کرتا ہے۔ برخلاف اِس کے مانٹی سوری بچوں کو کامل آزادی دیتی ہے اور ذاتی سعی و مصروفیت کا بہت خیال رکھتی ہے چنانچہ بچوں پر کسی قسم کا جبر و تشدد نہیں کیا جاتا

اور نہ اُن سے کچھ کہا جاتا ہے بالفاظ دیگر بالکلیۃ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں اس نے ایک واقعہ قلمبند کیا ہے جو بہت ہی دلچسپ ہے۔

مانٹی سوری کے یہاں ایک سالہ بچی تھی جس کی عادت یہ تھی کہ کھلونوں اور دیگر تعلیمی آلات کو توڑ پھوڑ کر بنچ کے نیچے جاکر چھپ جایا کرتی تھی کئی دن تک یہی حال رہا اور نگرانکار ڈاکٹر موصوفہ نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ لیکن ایک روز وہی بچی بجائے تعلیمی آلات کو توڑنے پھوڑنے کے ان سے کھیلنے لگی اور اس کے بعد سے وہ بہت اچھا کام کرنے لگی۔ مانٹی سوری اسی قسم کی خودروی چاہتی ہے کیونکہ اس کا یہ درست خیال ہے کہ جب تک بچہ میں کام کرنے کی دلی خواہش پیدا نہ ہو کام مسرت کا باعث نہیں بلکہ بیگار ہو جاتا ہے۔

فروبل کے یہ ایک تحفہ کو لیکر مانٹی سوری کے آلہ تعلیمی سے بحث کرنا ایک طویل کام ہے اسلئے ہم دونو کے مقابلہ سے جس نتیجہ پر پہونچے ہیں وہ یہ ہے کہ حسی تربیت کے نقطہ نظر سے فروبل نے تحفوں کے انتخاب میں غیر واضح فلسفیانہ خیالات اور مبہم اُصولوں سے کام لیا تھا اور میڈیم مانٹی سوری نے آئیٹارڈ اور سنگوئیں کی ترقی یافتہ اور تجرباتی کوششوں کو پیش نظر رکھکر اس بات کا خاص لحاظ رکھا کہ وہی آلہ انتخاب کیا جائے جو بچہ کے لئے سب سے زیادہ مفید ہو چنانچہ اُس کے آلات میں جدید اُصولوں کی جھلک پائی جاتی ہے۔
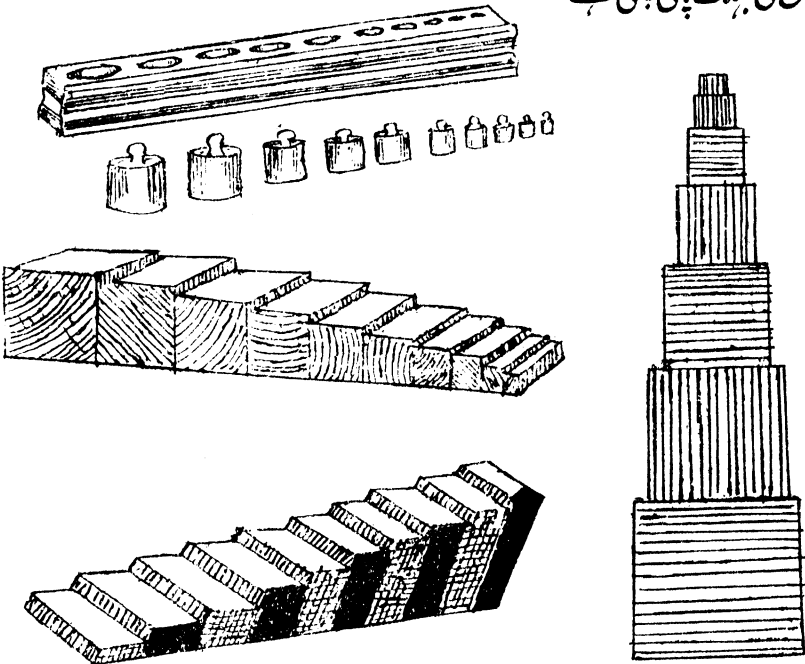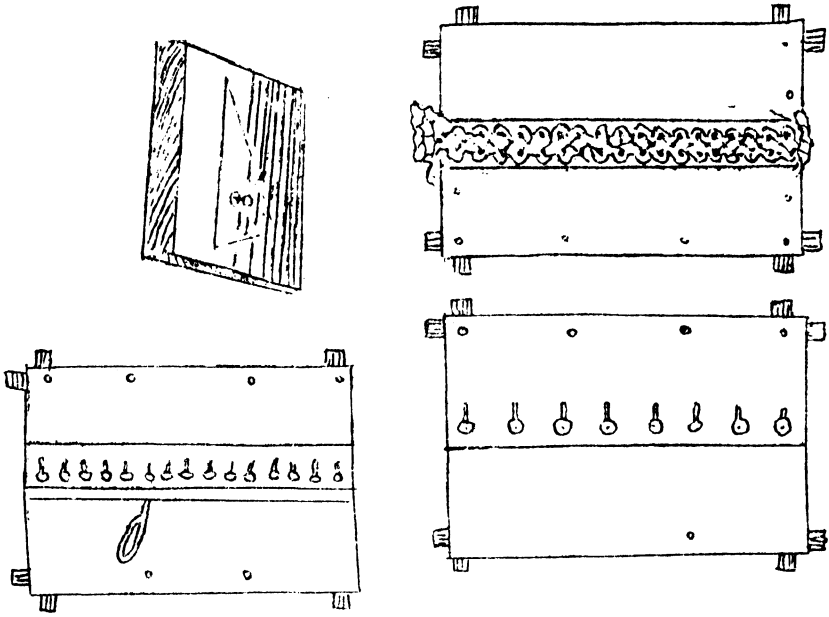
اعلیٰ تعلیمی آلات ۔ اِس مقابلہ کے بعد اب ہم اعلیٰ تعلیمی آلات کو لینگے ابتدائی کورس میں مانٹی سوری نے ایسی مشقیں رکھی ہیں جن سے ہندسی اشکال کا اِدراک ہوتا ہے ۔ اِس مقصد کے لئے لکڑی کے تختے میں ہندسی اشکال کاٹ کر بٹھائی گئی ہیں ۔ جن کو دستے کے ذریعہ اُٹھایا جاتا ہے شکل ( ) بچہ نہ صرف اُن اشکال کو اُٹھانے پر اکتفا کرتا ہے بلکہ اس کے اطراف اُنگلیاں پھرا کر اس کا مکمل اِدراک کرتا ہے اِس طرح سے اس کی عضلی نشو ونما بھی ہوتی ہے ۔ اِس کے علاوہ وہ اُن اشکال کو کاغذ پر رکھکر پنسل سے اُن کے اطراف لکیریں کھینچتا ہے اور پھر ان میں رنگ بھرتا ہے اس سے نہ صرف مختلف ہندسی اشکال کا واضح ورک میں ہوتا ہے بلکہ اِس طرح کی حرکت میں مشق ہو جانے سے لکھائی میں بڑی مدد ملتی ہے ۔

لکھائی کی مشق کے لئے بڑے بڑے حروف میں رنگ بھرنے کا موقع دیا جاتا ہے اور ان حروف کے ساتھ ایسی اشیاء کی تصاویر ہوتی ہیں جن کے نام کا سرِ حرف ، یہ حرف ہوتا ہے ۔ بچے پہلے تو ان حروف پر اُنگلیاں پھیرتے ہیں اِس طرح سے کہ گویا وہ لکھ رہے ہیں ۔ اِس کے بعد ایک لکڑی قلم کی طرح اِستعمال کی جاتی ہے ، اُس سے نہ صرف عضلات کی حسّی قوت تربیت پاتی ہے بلکہ بصری حس کو بھی بڑی

تقویت بہم پہونچتی ہے۔ اِسی لکھائی کے متعلق میڈیم مانٹی سوری نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔

"ڈسمبر کے مہینہ میں ایک دن جب کہ آفتاب نکلا تہا اور ہوا بھی پُرکیف تھی میں بچوں کو لیکر چھت پر گئی۔ وہ آزادی کے ساتھ کہیل رہے تھے۔ اُن میں سے چند میرے اطراف جمع ہوگئے میں مکان کی "چمنی" کے بازو بیٹھی ہوئی تہی۔ پانچ سال کا ایک بچہ میرے بازو بیٹھا ہوا تہا۔ اُس کے ہاتھ میں چاک کا ایک ٹکڑا دیتے ہوئے میں کہنے لگی اس چمنی کی تصویر تو بناؤ' اُس نے فوراً میرے کہنے کی تعمیل کی اور کویلو پر چمنی کی تصویر بناری۔ میں اپنے دستور کے مطابق اس کے کام کی تعریف کرکے ہمت افزائی کرنے لگی۔ بچہ نے میری طرف دیکھا، مسکرایا اور کچھ دیر تک اِس طرح خاموش کھڑا رہا گویا فرط انبساط سے مدہوش ہوکر کوئی بیساختہ حرکت کرنے کو ہے اس نے چلاکر کہا "میں لکھ سکتا ہوں، میں لکھ سکتا ہوں" اور گھٹنوں کے بل بیٹھکر چھت پر اس نے لفظ "HAND" لکھا۔ اِسی جوش میں اُس نے چمنی، چھت وغیرہ حروف لکھے اور لکھتے لکھتے وہ کہتا جارہا تہا "میں لکھ سکتا ہوں میں لکھنا جانتا ہوں"۔

دوسرے لڑکے اُس کی آواز سُنکر اُس کے اطراف جمع ہوگئے اور ذرا حیرت سے اُسکے کام کو دیکھنے لگے۔ ان میں دو تین جذبات کے دباؤ سے کانپتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے "مجھے بھی چاک دو میں بھی لکھ سکتا ہوں" فی الحقیقت اُنہوں نے مختلف الفاظ لکھے مثلاً ماں، ہاتھ، جان، چمنی وغیرہ وغیرہ۔

اُن میں سے ابتک کسی نے بھی چاک یا اس قسم کی کوئی دوسری چیز لکھنے کے لئے نہیں لی تہی۔ یہ پہلا وقت تہا جو اُنہوں نے لکھنا شروع کیا ہاں البتہ اُنہوں نے ہاتھ ضرور پھرایا تہا۔

اِسکے بعد تو لڑکوں کی خوشی کا یہ عالم ہوگیا کہ وہ چوطرف لکھنے لگے اور تختہ سیاہ کے پاس ایک بھیڑ سی لگ گئی اور چھوٹے بچے تپائیاں رکھکر لکھنے لگے۔ دوسرے لڑکے جن کو یہاں موقع نہ ملا دروازوں اور کھڑکیوں کی طرف لپکے۔ ان دنوں تمام فرش پر چوطرف لکھت ہی لکھت نظر آتی تہی، گھروں میں بھی یہی عالم رہا یہانتک کہ اکثر ماؤں نے اپنے فرش اور دیواروں کو کالا ہونے سے بچانے کے لئے اپنے بچوں کو کاغذ اور پنسل دلوادیں

میڈیم مانٹی سوری کہتی ہے کہ "یہ بچہ کی نشو ونما کا فطری طریقہ ہے" اِس طریقہ سے مانٹی سوری اُصول پر جن بچوں کی تعلیم دیگئی تجربہ سے ثابت ہوا کہ پانچ سال کا بچہ جو کچھ لکھ سکتا ہے وہ عام مدرسہ کا سات سال کا بچہ نہیں لکھ سکتا۔

اِسی طرح مانٹی سوری نے حساب میں گنتی کے لئے منکوں سے کام لیا ہے جو تاروں میں پروئے ہوئے

ہوتے ہیں۔ پہاڑوں کو یاد دلانے کے لئے بھی مقرون طریقوں سے کام لیا گیا ہے۔ حساب کے سوالات کو وہ مجرد نہیں بلکہ مقرون طور پر یعنی لین دین اور بیوپار کے ذریعہ سکھلانا اچھا سمجھتی ہے۔ چنانچہ اِس مقصد کے لئے اس نے مختلف ممالک کے مصنوعی سکے تیار کئے ہیں تاکہ لین دین کے حسابات میں عملی کام ہو سکے گرامر اور تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم میں بھی مقرون طریقہ کو ترجیح دیگئی ہے۔

اِس طریقہ تعلیم سے یہ دیکھا گیا ہے کہ جس عمر میں عام طور پر بچہ تحتانیہ تعلیم کو ختم کر دیتا ہے اُس سے دو سال قبل اس اُصول کی مدد سے وہ لائق ترقی ہو جاتا ہے۔ یہ بھی گویا مانٹی سوری کے اُصول تعلیم کی کامیابی کی نمایاں دلیل ہے۔

بہر حال مانٹی سوری کا نظام تعلیم ابتدائی تعلیم کے باب میں ایک درخشان حیثیت رکھتا ہے۔ یہہ اس کا ایک ایسا مہتم بالشان کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک اُسے زندہ رکھے گا۔

جان ڈیوی

از

جناب نواب احمد علیخاں صاحب ایم ۔ اے ۔ ایم ۔ ایڈ (لیڈز) لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی ٹریننگ کالج

امریکہ کے مصلحین تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت ڈیوی کو دیجا سکتی ہے کیونکہ اُس کے خیالات نہ صرف جدید تعلیمی نظریہ کے ہر شعبہ سے متعلق ہیں بلکہ عام فہم ہونیکی وجہ سے وسیع پیمانہ پر اُن کا استعمال ہو رہا ہے۔ ڈیوی فلسفی بھی ہے، ماہر نفسیات بھی اور مصلح تعلیم بھی چنانچہ اُس کے خیالات میں فلسفہ کی گہرائی، اور نفسیات کی بینائی پائی جاتی ہے۔ ڈیوی ایک سائینس داں کہلائے کا مستحق ہے کیونکہ وہ مشاہدہ اور تجربہ کا قائل ہے اور اِس نقطہ نظر سے اس کے خیالات میں سائینس کی دانائی بھی موجود ہے لہٰذا اُس کے تعلیمی خیالات ہر صورت سے مفید خیال کئے جا سکتے ہیں اور اِن تمام سے زیادہ اہم خصوصیت ڈیوی کے خیالات کی یہہ ہے کہ یہ نہایت ہی عملی ہیں، عمل سے اخذ کئے گئے ہیں اور نہ صرف موجودہ حالات سے مطابقت رکھتے ہیں بلکہ اُن میں اِسقدر گنجائش ہے کہ زمانہ مستقبل میں بھی ممکن العمل اور مفید ہو سکیں۔

ڈیوی کا سماجی کارکردگی کا مقصد فرد اور سماج میں موافقت و مطابقت پیدا کرنے کے دائمی

سوال کا جدید حل ہے۔ انفرادی خصوصیات و رجحانات کی نشوونما کے ذریعہ فرد کی آزادی کی تحصیل اور مختلف اداروں کی ترقی کے بدولت سماجی استواری کی تکمیل ایک ہی مقصد کے دو علیحدہ پہلو اس سماجی کارکردگی میں مضمر ہیں۔ سماج اور فرد میں مطابقت پیدا کرنے کا کوئی خاص زمانہ نہیں ہوتا۔ شروع ہی سے فرد کی تعلیم و تربیت میں اُس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے فرد اپنی شخصیت کو زائل کئے بغیر اپنے آپ کو سماج سے مطابق کر سکتا ہے چونکہ جس ماحول میں اُسکی زندگی کا آغاز اور خاتمہ ہوتا ہے وہ سماجی ہے اور اُس کے توارث میں سب سے زیادہ موثر ورثہ اُس کو سماج ہی سے ملتا ہے۔ لہٰذا تعلیم میں اس ورثہ کو نظرانداز کر دینا یا اُس کی اہمیت کو گھٹانا سراسر غلطی ہے۔

ابتدائی تعلیم کی اہمیت محض اس وجہ سے ہے کہ اس زمانہ میں آئندہ کا موزون پایہ رکھا جا سکتا ہے جامعۂ شکاگو کے تجرباتی ابتدائی مدرسہ کی ہفت سالہ خدمت کے دوران میں ڈیوی اسبات پر متوجہ ہوا کہ شروع ہی سے بچّہ کو اُسکے مختلف ماحول سے مطابق کر لینے میں مدد دیجائے۔ اس ضمن میں اسبات پر اصرار کرنا ضروری ہوا کہ بچّہ اور ماحول دونوں بدلتے رہتے ہیں اور تعلیم و تربیت اسطور پر دیجائے کہ بچّہ میں مناسب لچک ہو تاکہ وہ آئندہ اپنے ماحول سے بہ آسانی مطابقت پیدا کر لے۔ اگر بچہ کی قوتوں اور رجحانات کو قائم تصور کر لیا جاتا اس قسم کی تعلیم و تربیت ناممکن ہو جاتی۔ اِسکے برخلاف ارتقاء اور بالیدگی کا قبول کرنا مطابقت کے مقصد کی تائید اور آئندہ کی ترقی کی اُمید کو تازہ کرنا ہے۔ اِن خیالات کی عملی تائید ڈیوی کے تجرباتی مدرسہ کے مشاغل اور مصروفیات سے پوری طور پر ہوتی ہے۔

مدرسہ میں گھر جیسی فضا پیدا کرنا اور بچوں کے دلوں سے مدرسہ کی ہیبت کو دور کرنا تعلیم کے لوازمات میں سے ہے۔ ڈیوی جیسے تجربہ کار اور روشن دماغ ماہر گھر اور مدرسہ میں تعلق پیدا کرنے کو کبھی غیر مفید نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن ساتھ اسکے تعلیم اور مدرسہ کے ماحول کو محض طلباء کی خوشنودی کے مدنظر ترتیب و تنظیم دینے کے یہ معنی ہونگے کہ زندگی کے کڑے، پیچیدہ اور حقیقی پہلوؤں کو نظرانداز کر کے طلباء آرام پسند بنا دئے جائینگے، حقیقی زندگی سے بے بہرہ ہو جائینگے اور مشقت سے جی چرا کر زندگی کو کامیاب بنانے سے قاصر رہینگے۔ تعلیم کا مفید مقصد وہی ہے جس میں دلچسپی اور کوشش بروقت اکسائی جائے۔ ڈیوی کے تجرباتی مدرسہ میں اس مقصد سے کام لیا گیا اور نہ صرف گھر کی محبت اور ہمدردی مدرسہ کی فضا میں داخل کئے گئے بلکہ قوم یا سماج کے اہم مصروفیات اور مقاصد کی نمایندگی یہاں کی گئی۔

اس قسم کی نمایندگی ضروری بھی تھی کیونکہ گھر یا خاندان کے محدود ماحول سے مطابقت کر لینا کافی نہیں بلکہ اس سے زیادہ وسیع ماحول سے مطابقت کرنا اس ماحول میں اپنی زندگی کو کامیاب بنانا اور سماج کی

ترقی کا باعث ہونا بہت زیادہ اہم ہے۔ مگر ممکن نہیں تھا کہ ابتدائی تعلیم کے دوران میں طلبار کی اِسقدر وسیع تیاری ہوسکے
اول تو ابتدائی تعلیم کا تعلق طلبار کی عام نشو و نما سے ہے، دوسرے اِس تعلیم کا زمانہ کم اور تیسرے طلبار کی
محدود قابلیت اُس وسیع مقصد کی تحصیل سے قاصر ہے۔ اِن تینوں چیزوں کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی ایسی تدبیر
اختیار کرنی پڑی جو اِس مقصد کی تحصیل میں بطور تمہید کے کام دے۔ اِنقلابی کہلائے جانے سے بچکر اپنے
مفید اُصول کو مقبول بھی بنانا، نئے اِصلاحات کا خیال بھی کرنا اور تعلیمی رواج کی ایک حد تک پابندی بھی
کرنا ناگزیر ہوا۔ چنانچہ ڈیوی کے مشاغل میں جدید نفسیات کی روشنی بھی پائی جاتی ہے، حالیہ تعلیمی رجحانات
کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے اور قدیم رواج کا بھی اثر موجود ہے۔

جدید نفسیات کا مرکز کم و بیش طالب علم ہے جسکے فطری رجحانات کا مطالعہ اِس کا اساسی پایہ اور اُن رجحانات
کی تربیت اُس کا اولین مقصد ہے۔ ارتقار کی یہ معتقد اور تعلیمی مضامین و مصروفیات کے انتخاب، تنظیم و درجہ
بندی میں طالب علم کے نقطہ نظر کو اہمیت دیتی ہے۔ ڈیوی کے مشاغل میں اِس نفسیات کی مناسبت سے
بچوں کی ذہنیت و قابلیت کا خیال رکھا گیا ہے۔ جہاں سماجی یا قومی زندگی کی نمایندگی مقصود ہے وہاں
پہلے یہ دریافت کرلیا گیا ہے کہ آیا سماجی یا قومی مصروفیات بچوں کے اُن کے خاص حالات کے مدنظر موزوں بھی
ہیں اور کیا انکو وہ سمجھ سکتے اور اُن پر عمل کرسکتے ہیں اور کیا بچوں کی عام نشو و نما میں اُن سے مدد مل سکتی ہے۔

ذاتی عمل اور خود روی کے بغیر کام میں نہ تو سلسلہ قائم رکھا جاسکتا ہے اور نہ اسکا اثر بچوں کے عادات
و تربیت پر مستقل ہوسکتا ہے۔ ذاتی عمل اور خود روی کو اکسانے کی ضرورت ہے کہ تعلیمی مشاغل و مصروفیات کا
تعلق بچوں کی ضروریات سے کیا جائے۔ ڈیوی اور اُس کے ساتھی اپنے تجرباتی مدرسہ کے آغاز
کرنے میں اِس اہم مسئلہ کے حل میں منہمک رہے کہ کونسی تدابیر اختیار کی جائیں جنسے مضامین و مصروفیات تعلیم
بچوں کی روزمرہ اور عملی زندگی میں بھی کارآمد ثابت ہوں نہ کہ صرف مدرسہ تک ہی انکا تعلق رہے۔ موضوعی
مضامین کی تنظیم و تعلیم بھی اسی خیال سے ہوتی رہی۔ یہیں سے پراجکٹ میتھڈ کی اختراع بھی ہوئی جس میں طلبا
کے غور و فکر، ذاتی سعی اور انہماک پر زور دیا جاتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے آخر سے جمہوریت کے اثرات میں اضافہ ہوتا گیا یہانتک کہ بیسویں صدی کے
آغاز سے قبل ہی اسکے اثرات تعلیمی دائرہ میں نمایاں ہونے لگے۔ ہر ایک کو تعلیمی مواقع دینے کی تدابیر وقوع میں
آئیں اور ہر ایک کو اپنی اہلیت و قابلیت کی مناسبت سے ترقی کرنے کی آزادی کی طرفداری میں اضافہ ہوا۔
مدرسہ کی فضا اور کاروبار کے ذریعہ جماعتی احساس پر اہمیت دی گئی۔ آزادی، اشتراکیت، شہریت، مساوات
ڈیوی کے سماجی کارکردگی کے مقصد کے مشتملات ہیں جو جمہوریت کی حقیقی خصوصیات ہیں۔

جدید رجحانات کا اہم پہلو حقیقی تعلیم و معاشی رہبری سے متعلق ہے۔ ابتدائی تعلیم میں ممکن نہیں کہ صنعتی تعلیم باقاعدہ طور پر شروع کیجائے لیکن اسبات کی کم ازکم ضرورت ہے کہ بچوں کو عملی کاروبار سے واقف کرایا جائے۔ اس کے لئے مفید ترین مواد قوم کی اس مصروفیت سے حاصل ہوسکتا ہے جس کی کامیابی پر قوم کی ترقی کا انحصار ہے۔ اِس ضمن میں ڈیوی کے مدرسہ میں شاپ ورک رکھا گیا تھا جس میں لکڑی اور اوزار سے کام لیا جاتا پکانا سکھلایا جاتا اور سینے اور بُننے سے بچوں کو واقف کرایا جاتا تھا۔ اِن چیزوں کے سلسلہ میں بچے تاریخی جغرافی اور علمی معلومات ایک حدتک حاصل کرلیتے اور اُن کے مفاد سے روشناس ہوجاتے اور اُن کی آئندہ تعلیم کا پایہ ڈالا جاتا۔ ذرا غور کرنے سے معلوم ہوجائیگا کہ ڈیوی نے ان مشاغل کی تنظیم میں ارتباط باہمی کے مسئلہ کا عملی حل بھی پیش کیا ہے۔ اِس سے بڑھکر ڈیوی مرکزیت کے اُصول کی تائید کرتے ہوئے سماجی زندگی کو مرکز قرار دیتا ہے جس کے ضمن میں مدرسہ کی دوسری مصروفیات کارآمد شمار کی جاتی ہیں۔ ہمیں یہہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈیوی خصوصی تعلیم و تربیت کی ضرورت کو واضح کرتا ہے مگر ساتھ اسکے اِس تعلیم و تربیت کو محدود نہیں کرنا چاہتا بلکہ شائستگی اور مفاد کے مقاصد کی تحصیل ساتھ ساتھ کرنے پر توجہ دلواتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مقاصد پر ابتدائی تعلیم میں عمل نہیں کیا جاسکتا لیکن آئندہ تیاری کے لئے پایہ ڈالنے پر توجہ کی جاسکتی ہے کیونکہ فطری رجحانات پیدائشی ہیں جنکا مشاہدہ شروع ہی سے کرا کے کارآمد تربیت کا چارہ کار اختیار کیا جاسکتا ہے۔

جدید نفسیات کے باوجود اس بات کی ضرورت ہمیشہ لاحق ہوتی رہیگی کہ ابتدائی زمانہ میں خصوصاً اور تمام موضوعی تعلیم کے دوران میں عموماً مقصد، نظم و نسق و طریقہ تعلیم کے اختیار کرنے، رواج دینے، اور عمل میں لانے کی ذمہ داری طلباء سے باہر کسی ذریعہ یا ذرائع پر عائد کیجائے چاہے یہ ذریعہ خاندانی ہو، مذہبی ادارہ ہو یا کہ ریاست یا اُنکے نمائندے۔ طلباء کبھی نہ کبھی اپنے سے زیادہ تجربہ کار، جہاں دیدہ اور قابل اشخاص کی رہبری، رائے و مشورہ کے محتاج رہینگے۔ مثل قدیم رواج کے مقتدر شخصیت کی اہمیت برقرار ہے اور اُس کے وجود کا اعتراف کرنا پڑیگا، البتہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ایسی شخصیتوں کے بیجا اثرات طلباء کی انفرادیت کو فرو کرنے کے کم مجاز رہینگے لیکن یہہ ذرائع اپنے اثرات بالکل ہی زائل نہیں کرسکتے۔ حالیہ مصلحین و مفکرین تعلیم نہ صرف اُن ذرائع کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ اُن کے تعلیمی پروگرام کی کامیابی اُن ذرائع کی امداد اور کارکردگی پر منحصر ہے۔ مثل زمانہ ماقبل کے معلومات کا حاصل کرنا، معلومات کا بہم پہونچانا اور معلومات کی اشاعت آجکل بھی اہم ہیں اور آئندہ بھی اُن کی اہمیت برقرار رہیگی چونکہ جسقدر زیادہ علم جو رکھتا ہو اُسیقدر عام طور پر وہ عملی کام بخوبی انجام دیسکیگا۔ مشتملات تعلیم سے معلومات خارج نہیں کئے جاسکتے البتہ طلباء کی نفسیات کا لحاظ کرکے اُن کی پیش کشی اور اُن کے انکشاف کے طریقوں پر توجہ ہوتی رہیگی۔ مواد تعلیم کے سلسلہ میں آجکل

ضروری غیر ضروری، مُفید اور غیر مُفید پر بحث ہوتی ہے مگر باوجود اسکے زمانہ ماقبل کے زیبائش کے خیال نے اپنا اثر زائل نہیں کیا چنانچہ موجودہ زمانہ کے ماہرین تعلیم نے ادبی اور اخلاقی عناصر کو نظرانداز نہیں کیا اور درحقیقت اُن کا نظرانداز کردینا گویا قوم کی ترقی کو محدود کردینا ہے۔ حالیہ تعلیمی نصابات میں ادبی مضامین پر کافی اہمیت دیجاتی ہے جو شائستگی کی طرفداری کی دلیل ہے۔ ڈیوی کا تعلیمی نصاب فائدہ اور شائستگی کے مدنظر تنظیم دیا گیا ہے ڈیوی قدیم اور جدید مقاصد کو ایک جگہ کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے تعلیمی مشمولات میں وہ مضامین شامل ہیں جو ایک زمانہ سے مدارس کا نصاب رہے ہیں۔ طلبار کی تعلیم و تربیت میں رہبر اور رہبری کو ضروری خیال کرتا ہے گو طلبار کی نشوونما میں انفرادیت اور آزادی کے پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے۔ جمہوریت کے باوجود مساوات عمل میں ناممکن ہے ڈیوی جیسے مصلحین سب کو یکساں تعلیمی مواقع دینا چاہتے ہیں مگر قدیم خیال کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ سب کے لئے یکساں ترقی ممکن نہیں۔ چنانچہ اعلیٰ بچے، غبی بچے، کند ذہن بچے، اسبات کا ثبوت دیتے ہیں کہ قدیم رواج کی مطابقت اس حد تک کرنی لازمی ہے کہ انفرادی خصوصیات کی مناسبت سے جو زیادہ اہل ہیں اُن کو کامیابی کے زیادہ مواقع دیئے جائیں، کہ یکساں سب کو موقع دینے کے خیال سے اُن کی ترقی محدود ہوجائے۔

سائنس انسان کی زندگی کے تقریباً ہر شعبہ کو متاثر کررہا ہے۔ تعلیم میں بھی نہ صرف مشاہدے، تجربے اور تحقیقات کی اہمیت بلکہ اُن کی ضرورت کا احساس دن بدن ترقی پر ہے اور جان ڈیوی ان چیزوں پر زور دیکر ترغیب دلاتا ہے کہ اُس کے خیالات کو عمل میں لانے سے قبل مقامی اور قومی حالات کی مناسبت سے اُن کی جانچ کیجائے۔ یہی طریقہ دراصل کامیابی کا باعث ہوگا نہ کہ کسی کی اندھی تقلید۔

ماڈل پرائمری اسکول

از مس ۔ اے ۔ ٹائیلر ۔ صدر معلمہ

اِس مدرسہ کا قیام تجربہ کی غرض سے عمل میں آیا ہے۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ایک ہندوستانی مدرسہ جس میں آب وہوا اور مختلف حالات کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے۔ اِن نئے اُصول پر جو امریکہ اور انگلستان کے موجودہ اور جدید قسم کے اکثر مدارس میں رائج ہیں کس طرح چلایا جا سکتا ہے اس کے متعلق یہاں چند ضروری باتیں قابل ذکر ہیں۔

(۱) **لڑکوں اور لڑکیوں کا باہم مل جل کر تعلیم پانا۔** لڑکے اور لڑکیاں باہم اِسطرح مل جُلکر کام کریں کھلیں کودیں گویا ایک ہی خاندان میں رہتے سہتے ہیں فرق اتنا ہوتا ہے کہ لڑکے مردانہ کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور لڑکیاں سینے پرونے کا کام کرتی ہیں لڑکے فٹ بال کھیلتے ہیں اور لڑکیاں بیاڈمنٹن میں شریک ہوتی ہیں لڑکیاں آٹھ سال کی عمر تک رہتی ہیں لیکن لڑکا دس یا گیارہ سال کی عمر تک رہ سکتا ہے کیونکہ اِس مدرسے کی حیثیت نہ صرف کنڈرگارٹن کی بلکہ ایک کمل پرائمری اسکول کی ہے۔

(۲) **انفرادی کام۔** اس سے مراد وہ کام ہے جو بچہ اپنی مرضی کے مطابق جتنی دیر میں چاہے اتنی دیر میں انجام دے جسمیں وقت کا تعین ازروئے قواعد نہ کیا گیا ہو۔ اس طرح پر کام لیا جائے تو جماعت میں کوئی لڑکا ایسا نہ ملیگا جو بیوقوف کہلائے اکثر حالتوں میں بیوقوف لڑکے سے اگر اسکی مرضی کے مطابق کام لیا جائے تو وہ بھی دوسرے لڑکوں کی طرح چالاک ثابت ہوگا قصور لڑکے کا نہیں بلکہ مدرسے میں شریک ہونے سے پہلے یا تو اسکی تعلیم ناقص ہوئی ہے یا کوئی دوسرے اسباب ایسے پیش آئے ہیں جنکی وجہ سے وہ جماعت میں پیچھے ہے اور اس معیار تک جو اس کے ہم عمر بچوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے نہیں پہونچ سکتا ہے لڑکوں کو اُن کی استعداد کے مطابق ایک جماعت سے دوسری جماعت میں منتقل کرنیکا خیال کوئی نیا نہیں ہے لیکن ہندوستان میں یہ ایک نئی بات سمجھی جائیگی۔ فرض کیجیے کہ آپ کا بچہ اُردو میں جماعت سوم کے قابل ہے حساب میں جماعت دوم میں چل سکتا ہے۔ اور صرف

انگریزی میں اسکی استعداد ایسی ہے کہ وہ دونوں جماعتوں میں سے کسی جماعت میں بھی رکھا جا سکتا ہے اس طرح
پر اگر اس کو انہیں لڑکوں کے ساتھ رکھا جائے جو اس کے ہم استعداد ہیں تو اسکی تعلیم کی بنیاد اچھی قائم ہوتی ہے
نہ وہ کام کو زیادہ سخت پاکر پست ہمت ہوتا ہے اور نہ اپنی استعداد سے گھٹے ہوئے کام سے اُس میں کاہلت کا
مادہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک بہت ہی چالاک لڑکا اُن لڑکوں کے ساتھ مل کر کام کر سکتا ہے جو اُس سے بہت زیادہ
عمر کے ہیں۔ اگر آپ کا بچہ کسی مضمون کی کمزوری کی وجہ سے نیچے کی جماعت میں روک لیا گیا ہے تو آپ کو ہرگز کسی
قسم کا اندیشہ نہ کرنا چاہیئے اور نہ یہ خیال کرنا چاہیئے کہ اگر وہ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ نہ رہے تو اس کی کچھ بھی
تعلیم نہ ہوگی۔

(۳) ہمارے طریقہ ہائے تعلیم:۔ کنڈرگارٹن میں ہم مانٹی سوری کے طریقوں پر کاربند ہوتے ہیں اس
طریقہ تعلیم میں حواس خمسہ کی تربیت ہوتی ہے اور عمل کے ذریعہ سے تعلیم دیجاتی ہے مانٹی سوری کے طریقہ تعلیم کے لئے
جن جن آلات اور سامان کی ضرورت ہے وہ سب یہاں موجود ہیں اور جیسی جیسی ضرورت پیش آتی ہے اُن میں ہم
اپنی ایجادات کا بھی اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ کنڈرگارٹن کے لئے جو معلمہ صاحبہ مامور ہیں اُنہوں نے اطالیہ میں خود
ماڈیم مان ٹیسوری سے مان ٹیسوری طریقہ کی ٹریننگ حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ ایک معلمہ انگلستان میں کنڈرگارٹن
کی ٹریننگ یافتہ، ایک فزیکل کالج کا تعلیم یافتہ میٹرک کامیاب مدرس، اور ایک۔ ایف۔ اے کامیاب ٹرینڈ مدرس
بھی یہاں موجود ہے۔ موازنے میں دو اور ٹرینڈ مدرسین کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ جس وقت طلبہ کی تعداد
بڑھ جائیگی اُن کا بھی تقرر کر لیا جائیگا غرضکہ اس پرائمری اسکول کا جملہ اسٹاف ماہر فن ٹرینڈ مدرسین پر مشتمل ہے۔ جب بذریعۂ
عمل کنڈرگارٹن میں بچوں کو تعلیم دلوائی جائیگی تو بڑے ہونیکے بعد اُستاد کی مار کا خوف یا انعام کی ہوس اُنہیں تعلیم
پر مائل نہ کریگی بلکہ اُن میں خود تعلیم کا اصلی شوق پیدا ہوگا۔ ہم بچوں کو کھیل کود کے ذریعہ سے تعلیم دیتے ہیں۔ امریکہ میں
یہی طریقۂ تعلیم رائج ہے اور انگلستان میں بھی میں نے اُس کو نہایت کامیابی کے ساتھ چلایا ہے۔ میں یہاں بھی
اسی طریقہ کا تجربہ کرنا چاہتی ہوں اور اس خصوص میں آپ حضرات کی مدد کی خواہاں ہوں۔

جس طریقہ تعلیم کا میں نے ذکر کیا ہے وہ اسطرح آسانی سے آپ کی سمجھ میں آجائیگا۔ مثلاً آپ میں اکثر
حضرات ایسے ہونگے جو کوئی نہ کوئی دلچسپی کا مشغلہ ضرور رکھتے ہونگے اور اسمیں اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ خوشی خوشی
صرف کرتے ہونگے۔ آپ کا بہت سا وقت ٹینس میں یا اسٹامپ جمع کرنے میں یا فوٹوگرافی میں یا موسیقی میں یا کسی اور
دوسرے مشغلے میں صرف ہوجاتا ہے اور اسی سلسلے میں آپ کو بہت ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ آپ کو ان
مشغلوں میں وقت صرف کرنیکا ذرہ بھر بھی افسوس نہیں ہوتا اور جیسے ہی آپ اپنے دن بھر کے کاموں سے
فراغت پا جاتے ہیں فوراً اُن مشغلوں میں لگ جاتے ہیں۔ اسیطرح بچہ کی دلچسپی کا مشغلہ بھی کھیل ہے۔ لیکن

اُس کے لئے کھیل تضیع اوقات کا باعث نہیں جیسا کہ آپ کی دلچسپی کا مشغلہ آپ کے لئے تضیع اوقات کا باعث ہے ۔
بچے کو جو الفت کھیل سے ہوتی ہے اُسی کو ہم تعلیم کے کام میں لاتے ہیں جس سے اُس کے اسباق اُس کے لئے دلچسپی کا مشغلہ بن جاتے ہیں جو کچھ بھی وہ کرتا ہے رضا، و رغبت سے کرتا ہے نہ کہ جبر و اکراہ سے کام اُس کے لئے خوشگوار بن جاتا ہے جس قدر زیادہ کام ہو اسیقدر خوشی سے وہ اُس کو کرتا ہے۔ آپ حضرات میں سے کتنے ہی ایسے ہونگے جنہوں نے جغرافیہ کے شوق میں اپنے کھیل کود کے اوقات اور گیمس کے گھنٹوں کو نظر انداز کر دیا ہے یہاں بھی جماعت دوم میں بالکل ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ اُستاد کے پڑھانے کے بعد بھی بچوں نے جغرافیہ کو جاری رکھا اور یہ درخواست کی کہ انہیں بھی کام کرنے کی اجازت دیجائے گھر پر بھی اُن کو یہی کام دیا جائے اور کھیل کے وقت میں بھی اُن سے یہی کام لیا جائے۔ کیا آپ میں سے کسی کو یاد ہے کہ آپ نے کبھی اس شوق و رغبت سے ہوم ورک دینے کی اُستاد سے درخواست کی ہو؟ جغرافیہ کے نمونے بچوں کے آگے دوسرے لوگوں کی زندگیوں کا مرقع پیش کرتے ہیں چنانچہ جغرافیہ کے جس قدر اسباق ہیں اُن میں ہم اسی انسانی زندگی کے عنصر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ یعنے ہم بچوں کو یہ بتلاتے ہیں کہ انسان کیا کھاتے ہیں کیا پہنتے ہیں کیسے گھر ہوتے ہیں کس طرح بود و باش کرتے ہیں اور ہم میں اُن میں فرق کیوں ہے۔ تاریخ میں ڈرائنگ کے نمونوں اور ڈراموں کے ذریعے سے کام لیا جاتا ہے کسی ایک پرانے زمانے کے واقع کو ڈرامے کی شکل میں لڑکوں کے سامنے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ قدیم زمانے کے لوگوں کی زندگی کا مرقع ہو بہو اُن کے سامنے آجائے اور سنین ماضیہ کا تصور خود بخود اُن کے دل میں پیدا ہو جائے ۔ اس امر کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اُن کو سنین رٹوائے جائیں۔

کیا آپ اس طریقہ کو پسند نہیں کرینگے کہ علم حساب میں طول کا تصور گز یا کے گھر کے ذریعہ سے بچے کے دل میں پیدا کروا دیا جائے اور مٹھائی کی خرید و فروخت سے یہ بتلایا جائے کہ پیسے آنے اور پائی کی قیمت کیا ہوتی ہے اور بقدر قیمت اُن کو کتنی مٹھائی ملیگی۔ اس مٹھائی کی خرید و فروخت میں اوزان کا اندازہ بھی ہوگا اور چھوٹے چھوٹے سوالات بچے خوشی خوشی حل کرلینگے مثلاً اگر سیر کی قیمت چار روپئے ہوتی ہے تو ایک اونس مٹھائی کی کیا قیمت ہوگی۔ علم حساب میں بعض غیر دلچسپ مسائل بھی ہیں۔ لیکن یہ مسائل بھی تاش کے پتوں اور اعداد کے تختوں اور ٹکڑوں کے جوڑنے اور علیحدہ کرنے کے ذریعے سے جسمیں خوش رنگی کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے دلچسپ بنائے جا سکتے ہیں۔

یہاں مختلف قسم کی دستکاریاں بھی بچوں کی تعلیم میں داخل ہیں مثلاً کلے ماڈلنگ (مٹی کے نمونے بنانا) نشانات کا کام نقاشی، ڈیزائین، ڈرائینگ، مقوے اور کاغذ کے نمونوں کا کام (اس سے مراد بے کار طریقوں پر کاغذ کو موڑنا نہیں بلکہ کھلونے بنانا ہے) ابتدائی نجاری۔ اجتماعی طور پر کام کرنا وغیرہ۔

آپ تمام کمروں میں جاکر لڑکوں کے کام کا معائنہ فرمائیں لیکن اِس اَمر کو یاد رکھیں کہ بچہ اپنا کام آپ کرتا ہے اساتذہ کا اسمیں کوئی دخل نہیں۔ اساتذہ صرف سکھلاتے ہیں۔ خود کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ لڑکا غلطیوں ہی سے کام سیکھتا ہے۔ اُس کو غلطیوں سے منع کرکے کام نہیں سکھایا جاتا۔ یہاں آپ یہ نہیں دیکھینگے کہ مدرس کسی چیز کا نقشہ بورڈ پر کھینچ دے اور لڑکے بیٹھے ہوئے اُس کی نقل اُتار دیں بلکہ وہ اصلی چیز کو دیکھ کر اسکی نقل اُتارتے ہیں صرف اُنکی غلطیاں اُن کو تبلادی جاتی ہیں۔ اور حتی الوسع اُنہیں سے اُن کی اِصلاح کروائی جاتی ہے۔ اگر غلطی کی اِصلاح لڑکے کی دسترس سے باہر ہو تو پھر دوبارہ اس سے وہی کام کروایا جاتا ہے۔ بچوں سے پاٹرن Pattern بنانے اور لکڑی کے چھاپے کا کام بھی کروایا جاتا ہے جن کو آپ گڑیا گھر کی دیواروں اور آلو کے بلاک اور چھاپے کے کام میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

اعلیٰ پیمانے کی دستکاری جس میں وقت کا صرفہ زیادہ اور الماریوں کی زینت کے سوا کوئی فائدہ نہیں یہاں نہیں سکھلائی جاتی۔ جو کچھ ہم سکھلاتے ہیں اوسمیں اولاً اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ کہاں تک کارآمد ہے اور ثانیاً یہ کہ خود بچے اس کو بنا سکیں اور ثالثاً جہاں تک ممکن ہو چیز اچھی بنے۔ ان ابتدائی مراحل میں تعلیم صرف بچوں سے کام کروانیکا ایک طریقہ ہے۔ اعلیٰ صفت کے نمونوں سے ہم کو غرض نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بچہ اعلیٰ صفت کے کام نہ خود کرتا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔ وہ کام جو بے نقص اور اعلیٰ قسم کا ہو معلمین کا ہو سکتا ہے نہ کہ بچوں کا۔

ورزش جسمانی کے لحاظ سے بھی جہانتک میرا خیال ہے ہمارا اسکول دوسرے پرائمری مدارس سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ یہاں ہر ایک بچے کے لئے روزآنہ ایک پیریڈ ڈرل کا ایک گیمس کا اور ایک باغبانی کا رکھا گیا ہے۔

حاضری کے بعد ہر ایک بچہ اپنا بیلچہ کھرپی اور پانی کا ہزارہ لئے ہوئے باغ میں کام کرنے کے لئے چلا جاتا ہے اور پیریڈ کے آخر میں اپنے آلات و اوزار کو صاف بھی کرلیتا ہے۔ اُس سے بچوں کو اس بات کا سبق ملتا ہے کہ محنت کوئی ذلت نہیں بلکہ ایک تفریح بخش شغلہ ہے۔ اس سے بچوں میں خود اختیاری کا مادہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ کسی کام میں دوسروں کے محتاج نہیں رہ سکتے۔

گذشتہ چھٹیوں میں بچے اپنے اپنے باغوں کی اپنے ہاتھ سے بوئی ہوئی ترکاریاں مثلاً گاجر، گوبی، ساگ اور مرچیں وغیرہ اپنے گھر لے گئے۔ آپ قیاس کرسکتے ہیں یہ چیزیں کیسی مزیدار ثابت ہوئی ہونگی۔

باغبانی کے بعد حساب کا پیریڈ آتا ہے اس کے بعد دو پیریڈ اردو کے اور اُن دو کے بیچ میں

کھیل کے لئے کسیقدر وقفہ دیا جاتا ہے اس کے بعد ڈرل ہوتی ہے پھر انگریزی یا قصہ گوئی کا سبق یا دینیات ایک گھنٹہ کھانے اور کھیلنے کے لئے رکھا گیا ہے۔ دوپہر کے بعد انگریزی، دستکاری اور گیمس ہوتے ہیں۔ کنڈرگارٹن کے لئے قبل دوپہر ایک آرام کا پیریڈ رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی وقفے رکھے گئے ہیں۔ ٹائم ٹیبل ایسا تیار کیا گیا ہے جو حفظ صحت اور نفسیات کے نقطہ نظر سے نہایت ہی مکمل سمجھا جا سکتا ہے۔

کنڈرگارٹن کے شعبہ سے جسقدر دلچسپی بچوں کی ماؤں اور عورتوں کو ہوسکتی ہے وہ آپ حضرات کو نہیں ہوسکتی۔ لیکن میرا یہ دعویٰ ہے کہ جہاں تک مجھے علم ہے یہی ایک کنڈرگارٹن ہے جو ایک ٹرینڈ مانٹی سوری مدرس کی نگرانی میں چلایا جا رہا ہے۔ اس جماعت میں اس بات کی کوشش نہیں کی جاتی کہ بچے انگریزی میں بات چیت کریں ایک چھوٹے بچے کو دوسری کسی زبان میں بات چیت سیکھنے سے قبل خاص اپنی مادری زبان میں بات چیت کرنی چاہیئے۔ مانٹی سوری طریقہ تعلیم کا ہر ایک ضروری سامان یہاں موجود ہے۔ علاوہ ازیں مدرسین نے بھی اپنی اختراعات کا اُس میں اضافہ کیا ہے۔ حواس خمسہ کی تربیت کے متعلق ہم ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کا اضافہ ہی کرتے رہتے ہیں اور ہمارے مدرسین ان چیزوں کے بنانے میں بڑی جانفشانی سے کام لیتے ہیں میں چاہتی ہوں کہ آپ وہ چند چیزیں ملاحظہ فرمائیں جو یہاں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد آپ کو خود اندازہ ہوگا کہ بچوں کو اُن کے ذریعہ سے کس طرح تعلیم دیجاتی ہوگی۔

انگریزی میں چند اشیاء کے نام اور گنتی کھیل کے طور پر سکھلائی جاتی ہے۔ سات سال سے کم عمر والے بچوں کو انگریزی مضمون میں صرف سادہ اوامر اور چھوٹے چھوٹے خلیقانہ جملے سکھائے جاتے ہیں اگر آپ بعض تعلیمی سازوسامان کو ملاحظہ فرمائیں تو اُن طریقوں کا علم ہوسکتا ہے جو یہاں استعمال کئے جاتے ہیں جب انگریزی الفاظ سے بچوں کے کان مانوس ہونے لگتے ہیں تو پڑھائی شروع کرادی جاتی ہے۔ اُن کو کتابیں نہیں پڑھائی جاتیں بلکہ بڑے بڑے جلی الفاظ میں لکھے ہوئے تختوں سے پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ اُنہیں بڑے بڑے تختوں کے ذریعہ سے بچوں میں خواندگی کی اس قدر استعداد پیدا کرادی جاتی ہے کہ جب وہ اس کے بعد درجے میں جہاں لکھنا پڑھنا دونوں شروع کرا دیے جاتے ہیں پہونچتے ہیں تو کتابیں پڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

کل حقیقی تعلیم شروع سے آخر تک اُردو میں دیجاتی ہے لیکن اوپر کے درجوں میں بچے انگریزی میں اچھی طرح بات چیت کرنے کے قابل بنا دیئے جاتے ہیں۔ گو ایسی زیادہ روانی کے ساتھ گفتگو نہیں کرسکتے تاہم اس بات کی مشق کروائی جاتی ہے کہ تلفظ درست ہو اور کانوں کو بھلا معلوم ہو۔

(مترجمہ اللہ بخش صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی)

ابیات

جناب مولوی سید کاظم حسین صاحب قمر

ذیل میں جو ابیات درج کی جارہی ہیں وہ قمر صاحب نے موزوں کی ہیں۔ مقصد یہہ ہے کہ ان کو یاد کرنے سے بچوں کو مولوی سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے کے قاعدہ اُردو کے حروف یاد ہو جائیں۔ قمر صاحب اِن ابیات کو نرسری رائم سمجھتے ہیں اور ہمارے لائق دوست جناب جی۔ اے چندا ورکار صاحب ایم۔ اے ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اُن کے تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ بچے ان ابیات کو خوشی خوشی اور جلد یاد کر لیتے ہیں ہمیں ان کو نرسری رائم ماننے میں تعذر ہے اور یہ بھی شکایت ہے کہ بعض ابیات میں ثقیل اور مشکل الفاظ ٹھونس دیے گئے ہیں۔ البتہ اگر اُن سے بچوں کو واقعی سہولت ہوئی ہے تو ہمارے نزدیک یہ مناسب ہوگا کہ دوسرے مدارس کے معلمین کرام بھی ان ابیات سے اِستفادہ فرمائیں۔ مگر ہم یہ رائے ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگر تھوڑی محنت اور کی جاتی تو اُن سے بہتر، اُن سے زیادہ دلکش، پُراثر، معنی خیز اور سبک ابیات منظوم ہو سکتی تھیں۔ فقط

مدیر

آم آم ہی کیسا ہرا رسیلا — کھٹا، میٹھا لال اور پیلا
سبز اگر ہو کھٹا ہو گا — لال اور پیلا میٹھا ہو گا

کان کانوں سی ہم سنتے ہیں باتیں — سنتے ہیں ان سی ہم آوازیں

گائے گائے نہ ہو تو کس کے بس کا — دودھ، دہی، بالائی، مسکا

دو ۲ ایک میں گر ایک ۱ اور ملا دو — ایک سی پھر بن جائینگے دو ۲

دس ۱۰ دس بجنی پر مدرسہ آنا — چار بجے پھر گھر کو جانا

کالا بال اور حبشی رات اور کوّا — ان چاروں کا رنگ ہی کالا
لال دیکھو سیب ہی کیسا پیارا — خوب بڑا اور لال انگارا
ڈول ڈول بناتے ہیں لوہے کا — پانی کھینچتے ہیں پینے کا
ورق ورق سے ہی بنتی ہیں کتابین — اُن میں رہتی ہیں کام کی باتین
گاڑی دو پہیوں کی ہی یہ گاڑی — بیلوں سے چلتی ہی اگاڑی
آرا دانت ہیں آرے کے چھوٹے چھوٹے — کٹتے ہیں شہتیر اُس سے مُوٹے
ڈاٹ ڈاٹ بھی ہی اِک قسم کی لکڑی — نرم بہت ہوتی ہی یہ لکڑی
دوا جاتی ہی بیماری دوا سے — اس کو پی کر ہوتے ہیں اچھے
دری دری ہی سوت کی پیاری پیاری — رنگ ہی اسمیں کیا گلناری
کارڈ کارڈ پہ اپنا مطلب لکھ کر — بھیجتے ہیں ہم شہر کے باہر
دوات ہی یہ دوات ایک آنہ والی — اس میں سیاہی ڈالی ہی کالی
درزی سیتا ہی درزی کپڑے ہمارے — اچھے سُتھرے صاف اور پیارے
وردی اُون کی ہی یہ کالی وردی — اُس میں کم لگتی ہی سردی
دروازہ دروازہ ہی یہ اِک گھر کا — بنا ہوا ہی کاریگر کا

تنقید و تبصرہ

۱۔ آئینہ معرفت ۔ یہ جناب سید اعجاز حسین صاحب اعجاز۔ ایم۔ اے۔ لکچرار شعبہ اُردو الہ آباد یونیورسٹی کی قابل قدر تصنیف ہے۔ کتاب کا موضوع "اُردو شاعری میں تصوف" ہے قابل مصنف نے پہلے آئین تصوف اور صوفی کی تعریف کی ہے اور مشرق و مغرب کے مشہور مصنفین اور فلسفیون کے اقوال پیش کئے ہیں پھر صوفیوں کے مختلف فرقوں کے عقیدے اور حالات قلمبند کئے ہیں جملہ مسائل تصوف فاضلانہ انداز سے بیان کرکے آخر میں فاضل مصنف نے مختصر طور پر اُردو شاعری پر تصوف کے نتائج بیان کئے ہیں جو فی الحقیقت قابل داد و ستائش ہیں۔ اِس موضوع پر غالباً یہ پہلی کتاب ہے جسکی تصنیف کا سہرا ممدوح کے سر رہا۔

سچی بات یہ ہے کہ مصنف موصوف نے بڑے اہم موضوع پر قلم اُٹھایا یہ بڑی تحقیق و نظر کا کام تھا اگرچہ ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس موضوع پر یہ کتاب کافی نہیں ہے لیکن پھر بھی مصنف نے تصوف کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور حتی الامکان مختصر اور مفید ثابت کر دکھایا ہے۔ اُردو زبان میں یقیناً یہ قابل قدر اضافہ ہے شائقین ادب ضرور ملاحظہ فرمائیں، ہمارے مدارس کے کتب خانون میں یہ کتاب رہنے کے قابل ہے۔

قیمت ۱۲؍۔ ناشر رام نرائن لال۔ کٹرہ روڈ۔ الہ آباد۔ (۱ جلال)

۲۔ ممدوح ادب ۔ یہ مولوی سید حیدر عباس صاحب حیدر منشی کامل رانسگر بنارس اسٹیٹ کی تالیف ہے اس کتاب میں قابل مؤلف ان اکثر الفاظ کو جو اُردو میں لوگ غلط بولتے اور استعمال کرتے ہیں صحیح کیا ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ یہ کام بڑی تحقیق اور ذمہ داری کا ہے یقیناً مولانا نے ایک حد تک اس اپنی سعی میں کامیابی حاصل کی ہے لیکن پھر بھی بعض مقامات پر تسامح ہو گیا ہے۔

صفحہ ۲۰ لفظ قدوم کے متعلق یہ لکھا ہے کہ یہ قدم کی جمع نہیں ہے یہ بالکل صحیح ہے اسلئے کہ قدم کی جمع زبان عرب میں اقدام ہے اگر اسی پر اکتفا کیجاتی تو بات بنجاتی لیکن اسکے بعد ہی یہ بھی لکھدیا ہے کہ "قدمانے بھی اسکے آگے میمنت لزوم لگا کر خوب لکھا" مگر واضح ہو کہ اِس مقام پر قدوم قدم کی جمع نہیں ہے بلکہ قدوم

عربی میں مصدر ہے اور اس کے معنی "آنا" کے ہوتے ہیں لہذا مطلب یہ ہوگا کہ آپکا آنا برکت کے آنے کو لازم ہے۔

صفحہ ۲۵ حاشیہ ۲ لفظ نورچشمی پر یہ لکھا ہے کہ "ممکن ہے کہ کوئی نکتہ چین اعتراض کرے کہ نورچشمی میں "ی" متکلم کی ہے تو جواب میں یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ پھر دختر کے ساتھ تخصیص کیسی لڑکوں کو بھی یہی القاب لکھ سکتے ہیں لیکن اسپر کوئی عمل نہیں ہوتا"

اعتراض کا یہ جواب نہیں ہوسکتا بلکہ یوں ہونا چاہیئے کہ فارسی میں "ی" متکلم کی نہیں ہے فارسی میں متکلم کے لئے میم مخصوص ہے یعنی سرم اور اسپم کہینگے سری اور اسپی نہیں کہتے چشم فارسی ہے اسمین بھی متکلم کی "ی" نہیں لگ سکتی یائے متکلم عربی میں آتی ہے اور عربی الفاظ میں یائے متکلم لگاکر فارسی میں استعمال کرتے ہیں جیسے مجسی مشفقی وغیرہ بہرحال اُردو ادب کے لئے ایسی کتابوں کی بہت سخت ضرورت ہے خصوصاً طلبہ کے لئے ایسی کتابونکا مطالعہ لازمی ہے ہمارے نزدیک ایسی کتاب کو ہر طالبعلم ہر وقت اپنے پاس رکھے اور صحت الفاظ کرکے صحیح لکھے اور صحیح بولے۔ قیمت ۸

۲۔ محشرستان - یہ جناب محشر عابدی صاحب بی۔ اے کی تالیف ہے اسمین بارہ افسانے ہیں جو چار حصوں پر منقسم کئے گئے ہیں پہلے حصے کے افسانے "زائرین فلک" کے عنوان سے موسوم ہیں انہیں خواب وخیال کی آسمانی سیر ونمیں بُری بھلی تصویریں دکھائی گئی ہیں دوسرا حصہ "اصنام محبت" کے زیرعنوان ہے ان افسانونمیں عشق ومحبت کی ناکامی کا تذکرہ ہے تیسرے حصے کی سرخی "کشتی حیات" ہے اسمین تعیش کی مختلف صورتون کے المناک نتائج ہیں چوتھا حصہ اسکا عنوان "نقوش تخیل" ہے اسمین تخیلات کے تعجب خیز اور حیرت انگیز اثرات اور انجام میں حسرت وافسوس کی ناکام تصویرین دکھائی گئی ہیں۔

انسانی فطرت غم کے بعد راحت۔ عسر کے بعد یسر کا نہایت بے چینی کے ساتھ انتظار کرتی ہے جس کو ٹریجیکل کامیڈی کہتے ہیں۔ اور یہی شئے یعنے انجام میں کامیابی انسانی جذبات کو برانگیختہ کرکے ہمت میں تقدیم کی اور جرات میں تہور کی روح پھونک دیتی ہے۔ غالباً اسی غرض کے پورا کرنے کے لئے بلکہ اس مطلب میں اُمید سے زیادہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے افسانے کی ایجاد کی گئی ہے۔ ورنہ تاریخ بھی اپنے دامن میں اسی سے ملتے ہوئے گلہائے مراد لئے ہے لیکن واقعات کی پابندی اور نتائج کا حسب دلخواہ نہ ہونا تاریخ کو ہمارے مقصد سے پیچھے ہٹا کر افسانون کو ان مع العسر یسرا کا زبردست اور مسرت خیز کارنامہ بناکر اور قیود تاریخ سے آزاد کرکے رہنمائے ہمت بنادیتا ہے۔

ہم یہ کہکر قابل مؤلف کے جذبات کو صدمہ نہیں پہونچانا چاہتے کہ یہ کتاب اس معیار سے گری ہوئی ہے اس کے علاوہ اکثر ترجمہ کرنے میں اور عبارت آرائی میں زبان کی غلطیاں ہوگئی ہیں بعض مقامات پر کاتب کی طرف

ان غلطیوں کا انتساب کیا جاسکتا ہے بہرحال آئندہ ایڈیشن میں صحت ہوسکتی ہے ہمیں یقین ہے کہ آئندہ اردو زبان کیلئے ایسے افسانے بہت زیادہ مفید ثابت ہونگے۔ قابل مولف کی توجہ اُردو ادبیات کیطرف قابل قدر ہے ؎

گر اسی رفتار سے چلتے رہے تو ایکدن
حسرت منزل نوید جانفزا ہو جائیگی

شذرات

۱۔ سالانہ کانفرنس و نمائش انجمن اساتذہ بلدہ حیدرآباد دکن بابتہ ۱۳۴۲ف سالانہ کانفرنس انجمن اساتذہ بلدہ بابتہ ۱۳۴۲ف بروز جمعہ و شنبہ بتواریخ ۲۴ و ۲۵ آبان ۱۳۴۲ف مطابق ۲۹ و ۳۰ ستمبر ۱۹۳۳ء بمقام سٹی کالج بلدہ منعقد ہوگی۔ عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر معتمد تعلیمات عدالت و کوتوالی و امور عامہ نے ازراہ کرم کانفرنس کی صدارت قبول فرمائی ہے کانفرنس کے انتظامات میں جناب مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ و میر مجلس انجمن اساتذہ و دیگر اراکین منہمک ہیں اور کانفرنس کو دلچسپ و ہر لحاظ سے کامیاب ثابت کرنیکی کوشش کیجارہی ہے۔ ضروری انتظامات کے لئے تین کمیٹیاں مقرر ہوئی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) پروگرام کمیٹی

(۱) ریورنڈ جی سندرم بی۔ اے پرنسپل متھڈسٹ بائز ہائی اسکول۔ صدر
(۲) مسٹر نورالحسن۔ ایم۔ اے معتمد

ارکان:۔ (۱) جناب مولوی فیض محمد صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ (۲) جناب مولوی غلام دستگیر صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی
(۳) " " محمد سلطان صاحب۔ (۴) جناب مولوی اللہ بخش صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔
(۵) ریورنڈ جارج بی گارڈن ایم۔ اے۔ (۶) مسٹر جی سندریا راؤ بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی۔
(۷) مسٹر ڈی۔ ڈی۔ ہارڈیکر بی۔ اے۔

(۲) استقبالیہ کمیٹی

(۱) جناب مولوی شیخ ابوالحسن صاحب۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ اسپیشل مددگار نظامت تعلیمات۔ صدر

(۲) مسٹر جی۔ اے چنداورکر ایم۔ اے۔ معتمد

ارکان:۔

(۱) جناب مولوی سید مجتبیٰ حسین صاحب نقوی بی۔ اے۔

(۲) " " عبدالنور صاحب صدیقی بی۔ اے۔ بی ٹی

(۳) " " سعادت اللہ خاں صاحب

(۴) " " حبیب خاں صاحب بی۔ ایس۔ سی۔ ڈپ ایڈ۔ عثمانیہ

(۵) " " سید محمد رضا صاحب بی۔ اے

(۶) " " ناظم صاحب صدیقی بی۔ ایس۔ سی

(۷) " " سردار خاں صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔

(۸) " " یوسف حسین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔

(۹) " " عبدالوہاب صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔

(۱۰) " " محمد صدیق صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔

(۳) نمائش کمیٹی۔

(۱) مس ڈی۔ ولبسٹر۔ ہیڈ مسٹرس پری پرٹیری سکشن گرامر اسکول۔ صدر

(۲) مولوی سید نذیر حسین شریف صاحب۔ معتمد

ارکان:۔

(۱) مس اے۔ ٹیلر ہیڈ مسٹرس ماڈل پرائمری اسکول

(۲) مس ڈی نندی

(۳) مس رِیڈ

(۴) مسز گارڈن

(۵) مس ہامش

(۶) مسز سدا پورکر

(۷) مسز گنگا دھر پاٹک

(۸) مسٹر نثار علی صاحب

اب تک مذکورہ بالا کمیٹیوں کے متعدد جلسے ہو چکے ہیں گذشتہ کانفرنس میں کنڈر گارٹن و بہسٹڈی بچوں کی

دو کمیٹیاں مقرر ہوئی تہیں جن کے ارکان حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کنڈر گارٹن کمیٹی۔

(۱) جناب مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ — صدر

(۲) " " عبدالنور صاحب صدیقی۔ — معتمد

ارکان:۔

(۳) مس ڈی۔ ولبسٹر

(۴) مس اے۔ شیلر

(۵) مسز گارڈن

(۶) مس ریڈ

(۷) مس ڈی ننڈی

(۸) مس اطنس

(۹) مس شامرٹ

(۲) بیاک ورڈ چلڈرن کمیٹی:۔

(۱) جناب مولوی سالم بن سعید صاحب — صدر

(۲) " " غلام دستگیر صاحب — معتمد

(۳) " ڈاکٹر شنڈر کر صاحب

(۴) " فیض محمد صاحب

(۵) " مولوی نور الحسن صاحب

(۶) " " سید فخر الحسن صاحب

مندرجہ بالا کمیٹیوں کے صدر و ارکان اِسوقت تک مختلف مدارس تحتانیہ و ثانویہ کا معائنہ کر چکے ہیں بعد تحقیق و تدقیق رپورٹ تیار کر کے سالانہ کانفرنس میں پیش کی جائینگی اور مشاہدہ و تجربہ پر مبنی ہونے کے سبب سے یقین ہے کہ نہایت دلچسپ ہونگی آئندہ سال کے لئے دو مضامین (۱) امتحان اور (۲) اسکولی حفظان صحت مرکزی انتظامی کمیٹی نے منتخب کئے ہیں۔

سالانہ کانفرنس کے ضمن میں بروز پنجشنبہ مورخہ ۲۳ آبان ۱۳۴۲ ف کو بمقام متھڈسٹ بائیز ہائی اسکول نمائش کا افتتاح ہوگا۔ نمائش میں کنڈر گارٹن کا ایک علیحدہ کمرہ ہوگا۔ اُسی روز شام گو گولکنڈہ کے متعلق طلسمی لالٹین

کے ساتھ تقریر ہوگی جس کے لئے جناب مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم محکمہ آثار قدیمہ سے استدعا کیجا رہی ہے بروز جمعہ ۲۴ آبان ۱۳۴۲ف کانفرنس کا جلسہ آغاز ہوگا۔ جناب مولوی شیخ ابوالحسن صاحب اُردو میں اور مسٹر چنداورکر انگریزی میں خطبۂ استقبالیہ پڑھینگے۔

معتمد عمومی کی رپورٹ کے بعد عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر خطبۂ صدارت پڑھینگے۔ کنڈرگارٹن پروگرام کے بعد انگریزی میں پروفیسر اسپیٹ کی تقریر ہوگی دوپہر کو بصدارت مولوی سید علی اکبر صاحب کنڈرگارٹن کا ضمنی جلسہ بصدارت ریورنڈ ایف سی فلپ سست ذہن طلبہ پر انگریزی میں ضمنی جلسہ ہوگا شب کو گرامر اسکول میں مشاعرہ ہوگا جس کے انتظام کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر ہوئی ہے جس کے معتمد مولوی سعادت اللہ خاں صاحب ہیں۔

طرح مصرع:۔ زلف برہم تھی مزاج یار اگر برہم نہ تھا

بروز شنبہ اجلاس اول میں جناب مولوی محمد عثمان ٹی ڈی (لندن) وائس پرنسپل ٹریننگ کالج بلدہ تختہ انضباط اوقات تعلیم پر مضمون پڑھینگے سست ذہن طلبہ کی تعلیم پر اُردو ضمنی جلسہ ہوگا و زیر صدارت مسز انگلر کنڈرگارٹن کی انگریزی سکشنل میٹنگ ہوگی۔ دوپہر کو تقاریر ہونگی اور کنڈرگارٹن ڈرل کا مظاہرہ ہوگا معتمد نمائش کمیٹی کی رپورٹ پڑھی جائیگی و انعامات تقسیم ہونگے اور جناب صدر نشین صاحب کی اختتامی تقریر کے بعد شام کے پانچ بجے عصرانہ ہوگا۔

۲۔ **روئداد جلسہ تعلیمی مدرسہ تحتانیہ درجہ اول دامرگدہ ضلع گلبرگہ شریف۔** بتاریخ ۲۸ شہریور ۱۳۴۲ف زیر صدارت جناب مولوی سید جعفر علی صاحب ناظر تعلیمات گلبرگہ شریف مدرسہ تحتانیہ دامرگدہ میں جلسہ تعلیمی منعقد کیا گیا۔ باوجود بارش کے قصبہ کے سیٹھ ساہوکار و رعایا کثیر التعداد میں جمع ہوئے۔ طلبا کے علم دوست عالم و جاہل پر اُردو و تلنگی میں دلچسپ مکالمے ہوئے۔

انباجی راؤ صاحب نے منجانب رعایا تقریر کی و مدرسہ کی موجودہ اطمینان بخش حالت کا اظہار کیا۔

۳۔ **ماڈل پرائمری اسکول۔** ماڈل پرائمری اسکول کو کھلے ہوئے کچھ ہی اُوپر ایک سال ہوا ہے۔ یہ مدرسہ سرکاری ہے اور تعداد طلبہ فی الوقت ۶۲ ہے۔ اسمیں تین اور چھ سال کے بچوں کی تعلیم کے لئے خاص طور پر انتظام کیا گیا ہے اور جدید ترین آلات تعلیم خصوصاً مانٹی سوری کے آلات مہیا کئے گئے ہیں۔ صدر معلمہ مس اے نائیلر نے بچون کی تعلیم کا وسیع تجربہ ولایت میں حاصل کیا ہے۔ ان کے علاوہ مدرسہ میں دو ہندوستانی خواتین بھی ہیں۔ ان میں سے ایک نے تو اطالیہ میں قیام کرکے خود مادام مانٹی سوری سے ٹریننگ حاصل کی ہے

اور دوسری نے انگلستان میں کنڈر گارٹن کی تعلیم پائی ہے جن اُصول پر تعلیم دیجاتی ہے اُن کا صدر معلمہ صاحبہ نے اپنی رپورٹ میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مدرسہ کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) یہ مدرسہ خالص تحتانی مدرسہ ہے اور اس سے ملحق خصوصی کنڈر گارٹن اور رمانٹی سوری شعبے ہیں۔

(۲) ذکور و اُناث کی مشترکہ تعلیم۔

(۳) باغبانی، دستی مشاغل، اور ورزش جسمانی پر خاص توجہ کی جاتی ہے۔ اِس مدرسے میں ایک اعلیٰ قابلیت کا معلم ورزش ہے۔

(۴) ذریعہ تعلیم اُردو ہے مگر کوشش کی جاتی ہے کہ انگریزی کا وہی معیار رہے جو ان مدارس کا ہے جہاں بچوں کو انگریزی کے ذریعہ تعلیم دیجاتی ہے۔

مدرسے نے ۳۱ جولائی ۱۹۳۳ء کو بروز دوشنبہ اپنا جلسہ منایا۔ باوجود مسلسل بارش کے عہدہ داران تعلیمات اور اولیاء طلبہ کا کثیر مجمع تھا۔ اِس جلسہ کی ایک شان یہ بھی تھی کہ بچوں کے ہاتھ کا بنایا ہوا کام نمائش کے لئے سجایا گیا تھا۔ کنڈر گارٹن کے شعبہ میں مانٹی سوری کام کا مظاہرہ بچوں نے کیا معائنہ اشیاء کے بعد بچوں نے رام اور سیتا کا ڈرامہ دکھایا جس کو حاضرین جلسہ نے بیحد پسند کیا اِس کے بعد کنڈر گارٹن کے بچوں نے نظم خوانی کی۔

مدرسے کی صدر معلمہ مس اے ٹائیلر نے رپورٹ پڑھکر سنائی جو ہم نے دوسری جگہ چھاپی ہے اسکے بعد حضور مہاراجہ بہادر نے مختصر سی تقریر انگریزی میں فرمائی اور جو کچھ مدرسہ میں ملاحظہ فرمایا تھا اس پر اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا اور مس ٹائیلر کے حسن کارگزاری پر مبارکباد دی۔

جلسہ کے اختتام پر مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے صدر مہتمم تعلیمات بلدہ نے مہاراجہ بہادر اور دوسرے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور اِس امر کی طرف اِشارہ کیا کہ مدرسہ اس غرض سے کھولا گیا ہے کہ ہندوستانی حالات کا پورا لحاظ کرتے ہوئے بچوں کی تعلیم کے تجربات کرنے میں سہولتیں بہم پہونچیں۔ یہ بات طمانیت بخش ہے کہ مدرسہ اطمینان بخش طور پر اپنا کام انجام دے رہا ہے۔ دوسرے مدارس کے معلمین کو بھی موقعہ دیا جاتا ہے کہ وہ ماڈل اسکول کا معائینہ کریں اور جو تجربات زیر مشق ہوں اسکا مطالعہ کریں۔ مولوی سید علی اکبر صاحب نے یہ بھی ذکر فرمایا کہ سر مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت بہادر کو ابتدائی تعلیم سے بیحد دلچسپی ہے اور ممدوح کو چھوٹے بچوں کے ساتھ بیحد شغف ہے۔

ایک ہندسی ضرب میں ان سے زیادہ حاصل ضرب کی ضرورت نہیں ہوتی، لہذا تختہ مذکور میں دی ہوئی باتیں یاد رکھی جائیں تو چھوٹے بچوں کے لئے کافی ہے ۔

پہاڑوں کی تعلیم دیتے وقت بچوں کو کسی قدر ضرب کا تصور ہو سکتا ہے ۔ وہ اگر پہاڑوں کا تختہ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے خود مرتب کر کے اعادہ و ملاحظہ کے لئے اپنے پاس رکھیں تو ان کو ضرب کے سوالات حل کرنے میں بہت کچھ مدد اس تختہ سے مل سکتی ہے پہاڑے یاد ہو جانے کی صورت میں تختہ مذکور کی ضرورت نہیں ۔

چونکہ بچے اب پہاڑے جانتے ہیں مضروب اور مضروب فیہ اگر ایک ہی ہندسہ والے اعداد ہوں تو مندرجۂ ذیل قسم کے مشقی تاش ان کو دے کر ان سے سوالات حل کرائے جا سکتے ہیں ۔

مشقی تاش جبکہ مضروب اور مضروب فیہ ایک ہندسے والے اعداد ہوں

	۵	۷	۴	۹	۶	۸	۲	۳	
۲									
۴						۳۲			
۶			۲۴						
۷									
۸									

افقی اور عمودی قطاروں میں سے کسی ایک قطار کے ہندسوں کو مضروب سمجھ کر دوسری قطاروں کے ہندسوں کو مضروب فیہ سمجھا جائے اور حاصل ضرب متعلقہ خانوں میں بچوں سے لکھوایا جائے ۔ اس طرح کافی مشق ہونے کے بعد بچوں کو ایسے سوالات دئے جائیں جن میں مضروب دو ہندسوں کا عدد ہو اور مضروب فیہ ایک ہندسہ والا عدد ہو لیکن عمل میں حاصل لینے کی ضرورت نہ ہو ۔ اور مضروب فیہ کا پہاڑہ بچے جانتے ہیں ۔

ضرب بلا حاصل

بچوں کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ضرب جمع کی ایک خاص قسم ہے ۔ اسی بنیاد پر ذیل کی مثال بچوں سے حل کرائی جائے ۔

مثال ۲۳ × ۲

جمع کے ذریعہ تو بچے سوال مذکور کا جواب صحیح ضرور بتائیں گے یہی سوال ان کو ضرب کی صورت میں لکھنے کے لئے کہا جائے اور مدرس بھی اس کو تختہ سیاہ پر لکھے اب بچوں سے یہ سوال کیا جائے کہ اس سوال کے حل میں کیا عمل

دہائی	اکائی
۲	۳
	۳ ×
۶	۹

اختیار کیا جائے اور یہ بات اُن سے اخذ کرائی جائے کہ ۳ اکائیاں ۳ مرتبہ لینے سے ۹ اکائیاں ہوں گے جو اکائیوں کے خانہ میں لکھدیجائیں اور ۲ دھائیاں ۳ مرتبہ لینے سے ۶ دہائیاں ہوں گی جو دہائیوں کے خانہ میں لکھدیجائیں اور جواب ۹۶ بتایا جائے۔ ایسے سوالات کو سمجھانے کے لئے چیزوں کی چنداں ضرورت نہیں البتہ اشکال سے کام لیا جائے۔

دہائیاں اکائیاں

دہائیاں	اکائیاں
۲ ooo	۳
۲ ooo	۳
۲ ooo	۳
۶	۹

۹ اکائیاں ۶ دہائیاں

بچوں کو اگر ۳۲ کا پہاڑہ آتا ہو تو اس کی تصدیق پہاڑے سے ۳ ۲ تیے ۹۶ کہکر ہوسکتی ہے +

اس کے بعد ایسے سوالات دئے جائیں کہ مضروب دو ہندسے والا عدد ہو اور مضروب فیہ ایک ہندسے والا عدد ہو لیکن عمل میں حاصل لینے کی ضرورت ہو۔

ضرب حاصل والی

مثال ۴۳ × ۷

بچے ۴۳ کا پہاڑہ نہیں جانتے اس لئے بچوں کو اس سوال کے حل میں کسی قدر مشکل معلوم ہوگی۔

تختہ سیاہ

دہائی	اکائی	
۴	۳	
	۷	×
۲۸	۲۱	

پھر یہ سوال لکھکر بذریعہ سوال وجواب بچوں کی مدد سے اس کو حل کرایا جائے ۴۳ کی تحویل کرکے اکائی اور دہائی کے درجے میں متعلقہ ہندسے لکھدئے جائیں اور بچوں کی مدد سے یہ نتیجہ نکلوایا جائے کہ ۳ اکائیاں ۷ مرتبہ لینے سے ۲۱ اکائیاں ہوتی ہیں اور ۴ دہائیاں ۷ مرتبہ لینے سے ۲۸ دہائیاں ہوتی ہیں۔ اب بچوں سے یہ سوال کیا جائے کہ ایا جواب اسی حالت میں

لکھدیا جائے گا کہ ۲۱ اکائیوں کی ۲ دہائیاں بنتی ہیں جو ۲۸ دہائیوں میں ملائی جائیں اور ایک اکائی اکائی کے درجے میں لکھدیجائے۔ یہ جدید بنی ہوئی دو دہائیاں حاصل کی کہلاتی ہیں جو ۲۸ دہائیوں میں ملانے سے ۳۰ دہائیاں ہونگی جن کے ۳ سینکڑے بن سکتے ہیں۔ دہائی میں کچھ نہیں رہتا۔ لہذا جواب ۳۰۱ ہوا۔ اس قسم کے سوالات کی کافی مشق کرائی جائے۔ عبارتی سوالات دئے جائیں۔ لیکن کافی مشق کے بعد سوال کا عمل حسب ذیل ہوگا۔

۷ تیئے ۲۱ کا ۱ حاصل آئے ۲　　　۴۳

۷ چوکے ۲۸ ۲۸ اور ۲ برابر ۳۰　　　۷ ×

۳۰ کے ۳۰ جواب ۳۰۱ جواب　　　۳۰۱

مثال ۶۸ × ۴ اس کا عمل حسب ذیل ہوگا۔

اکائی　دہائی　سیکڑہ

۶　۸ = ۶۸

۴ × ۴ ×

مساوات کی صورت میں

۲۷۲ = ۴ × ۶۸　　　۷ ۲۴ ۳۲ = ۲۷۲

۲۷ ۲ =

۲ ۷ ۲ =

زبانی عمل ۔ ۴ اٹھے ۳۲ ۲ ۳ کے ۲ حاصل آئے ۳ اکائیوں کے خانہ میں ۲ لکھدئے جائیں ۴ چھکے ۲۴ ۲۴ اور ۳ = ۲۷ ، ۲۷ کے ۲۷ دہائیاں۔ دہائیوں کے خانے میں ۷ لکھدئے جائیں اور سیکڑے کے خانہ میں ۲ لکھدے جائیں۔ جواب ۲۷۲ بتایا جائے حقیقت میں حساب کے بنیادی اصول کا عمل ضرب سے شروع ہوتا ہے یہ اصول اکثر قانون انقلابی (COM MUTATIVE LAW) اور قانون انقسامی (DISTRIBUTIVE LAW) سے نامزد کئے جاتے ہیں۔

جمع کا قانون انقلابی یہ ثابت کرتا ہے کہ جمع کے سلسلہ میں ارکان کی ترتیب بدلی جاسکتی ہے۔ یعنے ارکان جملہ کو جس ترتیب سے چاہو لکھ لو جملہ میں کچھ فرق نہیں آتا۔ مثلاً ۴ + ۵ = ۵ + ۴ ،
۴ + ۵ + ۷ = ۷ + ۵ + ۴ = ۴ + ۵ + ۷ = ۵ + ۷ + ۴ = ۵ + ۴ + ۷ وغیرہ

ضرب کا قانون انقلابی یہ ثابت کرتا ہے کہ اجزاء ضربی کو بدل دینے سے حاصل ضرب کی

قیمت میں کچھ فرق نہیں آتا مثلاً (۴+۵ = ۵ × ۴ ، ۴ + ۵ × ۷ = ۵ × ۴ × ۷ = ۷ × ×
۴ × ۵ = ۵ × ۷ × ۴ وغیرہ۔

پہاڑوں کی تعلیم دیتے وقت اس اصول کو بچے ذاتی تجربہ سے خود معلوم کر چکے ہیں کہ ۳ × ۴
= ۴ × ۳

۴ × ۵ = ۲۰ ۳ × ۴ = ۱۲

۲۰ = ۵ × ۴ ۱۲ = ۴ × ۳

اگرچہ کہ ان کو اس قانون کا نام معلوم نہ ہو۔

اس اصول کا عمل درحقیقت ضرب میں بہت کارآمد ہوتا ہے۔

میکانی سوالات میں مناسب (موزوں) مضروب فیہ کا انتخاب کرنا گویا عقلی تربیت کی آزمائش ہے مثلاً ۹ کو ۱۴ میں ضرب دینا ہو تو ۹ × ۱۴ یعنے ۹ چودہ مرتبہ گننے میں کسی قدر دقت پیش آئے گی کیونکہ ۹ کا پہاڑہ ۱۴ تک گننا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن بموجب قانون انقلابی ۹ × ۱۴ کا حاصل ضرب ۱۴ × ۹ کے حاصل ضرب کے برابر ہوگا لہذا ۹ ضرب ۱۴ کو ۱۴ × ۹ کی صورت میں بدل سکتے ہیں۔ اور یہ ترتیب ضرب کے عمل کے لئے زیادہ آسان ہے۔

قانون انقسامی کی تشریح حسب ذیل ہے۔

(۱) ہندسوں میں۔ ۴ (۵ + ۳ + ۲) = ۴ × ۱۰ = ۴۰

= ۴ × ۵ + ۴ × ۳ + ۴ × ۲ = ۲۰ + ۱۲ + ۸ = ۴۰

(۲) الفاظ میں

اگر کسی عدد (۴) کو کثیر التعداد کے حاصل جمع (۱۰) میں ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب وہی ہوگا جو ضروری حاصل ضربوں (۲۰ + ۱۲ + ۸) کو جوڑنے سے ہوگا۔ یعنے جملہ وحدانی کو کثیر الارکان میں ضرب دینے کا قاعدہ یہ ہے کہ جملہ کثیر الارکان کے ہر ایک جزو کو جملہ وحدانی میں ضرب دیا جائے اور ان جزوی حاصل ضربوں کو جمع کیا جائے۔ یہ لمبی ضرب کی بنیاد ہے۔

اوپر بتایا گیا ہے کہ ضرب کیلئے پہاڑوں سے پوری واقفیت جمع میں پوری مہارت ضروری ہے۔ ضرب میں بچوں کو اس طرح عادی بنایا جائے کہ وہ فوراً ضرب بھی کر سکیں اور حاصل آنے والے اعداد اسی وقت (بغیر کسی جگہ لکھنے کے) جزوی حاصل ضرب میں ملا کر عمل کر سکیں۔ اس کے لئے حسب ذیل قسم کی زبانی مشق کسی قدر کار آمد ہوسکتی ہے مثلاً (۶ × ۷) + ۵ = ؟ (۵ × ۹) + ۶ = ؟ (۶ × ۳) + ۴ = ؟ وغیرہ۔

تحریری عمل عجلت و صحت

اگر عجلت و صحت کی عادت بچوں میں پیدا کرنی ہو تو مشقی تاش بہت کار آمد ہوتے ہیں ایک ہی کارڈ سے متعدد بار کام لیا جا سکتا ہے مشقی کارڈ بچوں میں تقسیم کرکے جواب تحریری ان کی سلیٹ یا کاپی پر بتانے کے لئے ان سے کہا جائے۔ اس بات کی احتیاط رکھی جائے کہ بچے جوابات حفظ یاد نہ کریں بلکہ سمجھ کر سوالات حل کریں۔ مشقی کارڈ کے سوالات مختلف ترتیب سے حل کرائے جائیں۔ مشقی تاش کا نمونہ ذیل میں بتایا ہے۔ مشقی تاش کی عدم موجودگی میں تختہ سیاہ سے کام لیا جائے لیکن عین وقت پر سوچنے میں زیادہ وقت صرف ہونیکا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے پہلے سے ہی سوچ سمجھ کر سوالات کا مرتب ہونا مناسب ہے۔

ضرب (بلا حاصل) کا مشقی کارڈ

۱۲ × ۴	۲۳ × ۳	۲۴ × ۲
۳۲ × ۳	۲۲ × ۴	۴۳ × ۲

ضرب (باحاصل) کا مشقی کارڈ

۱۲ × ۶	۲۵ × ۴	۱۳ × ۵	۱۵ × ۷
۱۷ × ۴	۲۸ × ۳	۳۲ × ۸	۵۳ × ۴

اس کے بعد ایسی مثالیں دی جائیں جن میں مضروب تین یا چار ہندسے والا عدد ہو اور مضروب فیہ ایک ہی ہندسہ والا عدد ہو۔

مثال ۲۴۳۷ × ۴

اس مثال میں مضروب کی تحلیل کرکے سوال مذکور حسب ذیل حل کیا جائے

بلحاظ قانون انقسامی

۲۴۳۷ × ۴ کا حاصل ضرب وہی ہوگا۔ جو جزوی حاصل ضربوں کو یعنے ۷ × ۴ + ۳۰ × ۴ + ۴۰۰ × ۴ + ۲۰۰۰ × ۴ کو جمع کرنے سے ہوگا۔

۲۰۰۰ × ۴ = ۸۰۰۰
۴۰۰ × ۴ = ۱۶۰۰
۳۰ × ۴ = ۱۲۰
۷ × ۴ = ۲۸

۲۴۳۷ × ۴ = ۹۷۴۸

یا ۲۰۰۰ + ۴۰۰ + ۳۰ + ۷
۴ ×
۸۰۰۰ + ۱۶۰۰ + ۱۲۰ + ۲۸

۸ ۴ ۷ ۹ = ۹۷۴۸ جواب

اس کے بعد یہی مثال تختہ سیاہ پر مروجہ صورت میں لکھی جائے۔ اور حاصل کا اصول سمجھا کر کے سوال حل کر کے بتایا جائے

ہزار	سیکڑہ	دہائی	اکائی
۲	۴	۳	۷
			۴
۸	۱۶	۱۲	۲۸
۹	۷	۴	۸

↶ سے حاصل کی علامت سمجھی جائے

بچے اب حاصل کا اصول آسانی سے سمجھ سکیں گے۔

۲۴۳۷
۴
۹۷۴۸

اور ایک سوال اسی قسم کا بچوں کی مدد سے تختہ سیاہ پر سمجھایا جائے۔

اس کے بعد ایسی مثالیں دیجائیں جن میں مضروب فیہ دو ہندسے والا عدد ہو۔

۱۰ کی ضرب دس کے پہاڑے کیطرف بچوں کی توجہ مبذول کرا کے یہ بات ان کے ذہن نشین کرائی جائے کہ جب کسی عدد کو ۱۰ میں ضرب معلوم ہوتا ہے مثلاً ۳ × ۱۰ = ۳۰، ۷ × ۱۰ = ۷۰، ۱۲ × ۱۰ = ۱۲۰ وغیرہ یعنے دس میں ضرب دینے سے مضروب کے ہر ایک ہندسہ کا ایک ایک درجہ بڑھتا ہے یعنے اکائی کا ہندسہ دہائی اور دہائی کا ہندسہ سیکڑہ سیکڑہ کا ہزار بنتا ہے۔ علیٰ ہذا۔

۱۰ کے ضعف کی ضرب کسی عدد کو ۲۰، ۳۰، ۴۰ وغیرہ سے ضرب دینا۔ ایسی صورت میں مضروب کو دہائی کے ہندسے میں مثلاً ۲، ۳، ۴ وغیرہ میں ضرب دیگر جو حاصل ضرب آئیگا اس کی دائیں طرف ایک صفر لگا دیا

جائے تو جواب مطلوبہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اس میں زبانی مشق کافی طور پر کرائی جائے۔

اسی طرح ۱۰۰ اور ۱۰۰۰ کے ضعف میں ضرب دینے کا طریقہ بتانے کے بعد ایسے سوالات دیے جائیں جن کے مضروب فیہ میں ۲ یا زیادہ ہندسے ہوں مثلاً ۷۸۵۶ × ۲۳۴ ۔

مثال مذکور میں بجائے مضروب کی تحلیل کے مضروب فیہ کی تحلیل کرنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ بچے اب ضرب کے ایسے سوالات آسانی سے حل کر سکتے ہیں مضروب دو یا زیادہ ہندسے والا عدد ہو اور مضروب فیہ ایک ہندسہ والا عدد ہو۔ اسی اصول کی بنیاد پر مندرجہ بالا قسم کے سوالات بچوں سے حل کروائے گئے۔

مثال مذکور میں مضروب فیہ کو حسب ذیل درجوں میں منقسم کریں گے۔

۲۳۴ = ۴ + ۳۰ + ۲۰۰ یعنے ۲ سیکڑے ۳ دہائیاں ۴ اکائیاں ان میں سے ہر ایک ہندسے سے الگ الگ ضرب دیکر جزوی حاصل ضربوں کو جمع کریں گے۔ حاصل جمع مطلوبہ حاصل ضرب ہوگا۔

سوال مذکور کا عمل مختلف طریقوں سے ہو سکتا ہے جن میں سے چند ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی طریقہ جماعت کی استعداد کے لحاظ سے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ طریقے بتائے جائیں اور بچوں سے کافی مشق بھی کرائی جائے۔

(۱) ۲۳۴ × ۷۸۵۶

۳۱۴۲۴ = ۴ × ۷۸۵۶	۷۸۵۶
۲۳۵۶۸۰ = ۳۰ × ۷۸۵۶	۲۳۴
۱۵۷۱۲۰۰ = ۲۰۰ × ۷۸۵۶	۳۱۴۲۴
	۲۳۵۶۸
	۱۵۷۱۲
۱۸۳۸۳۰۴ = ۲۳۴ × ۷۸۵۶	۱۸۳۸۳۰۴

اوپر کے حل میں بائیں طرف جو عمل بتایا گیا ہے اس میں یہ بات نظر آئے گی کہ اکائی کے ہندسے میں جو ضرب دیگئی ہے اس کا حاصل ضرب اکائی کے درجے سے لکھا گیا ہے۔ دہائی کے ہندسے میں جو ضرب دیگئی ہے اس کا حاصل ضرب دہائی کے درجے سے لکھا گیا ہے۔ لہذا اکائی کا درجہ کا خالی معرّیٰ چھوڑ دیا گیا ہے سیکڑے کے درجہ میں جو ضرب دیگئی ہے اس کا حاصل ضرب سیکڑے کے درجہ سے لکھا گیا ہے لہذا اکائی و دہائی کے درجے خالی (معرّیٰ) چھوڑ دیے گئے ہیں۔ اور تینوں جزوی حاصل ضربوں کو

اون کے درجوں کے لحاظ سے جمع کیا گیا ہے۔

دائیں طرف جو عمل بتایا گیا ہے وہ زیادہ واضح ہے اور اس میں مضروب فیہ کے ہر درجہ کے ہندسوں کو اکائیوں کی صورت میں ظاہر کرکے ضرب کا عمل کیا گیا ہے۔ اور جزوی حاصل ضربوں کو جمع کیا گیا ہے۔

دونوں عمل میں جزوی حاصل ضربوں کے ہندسے تو وہی ہیں فرق صرف صفر جوڑنے میں ہے۔ ۳۰ کی ضرب میں اکائی کے درجے میں ایک صفر اور ۲۰۰ کے ضرب میں اکائی اور دہائی کے درجوں پر ایک ایک صفر لگایا گیا ہے لیکن دونوں صورتوں میں نتیجہ وہی آیا ہے۔

(ii) ۷۸۵۶ × ۲۳۴

۷۸۵۶ × ۲۰۰ = ۱۵۷۱۲۰۰

۷۸۵۶ × ۳۰ = ۲۳۵۶۸۰

۷۸۵۶ × ۴ = ۳۱۴۲۴

۷۸۸۶ × ۲۳۴ = ۱۸۳۸۲۰۴

۷۸۵۶
۲۳۴
۱۵۷۱۲(۰۰)
۲۳۵۶۸(۰)
۳۱۴۲۴
۱۸۳۸۲۰۴

اوپر کے عمل میں بائیں طرف جو عمل کیا گیا ہے اس میں اول سیکڑے کے ہندسے میں ضرب دی گئی ہے اور اس کا حاصل سیکڑے کے درجے سے لکھنا شروع کیا ہے۔ بعد میں دہائی کے ہندسے میں ضرب دی گئی ہے جس کا حاصل ضرب دہائی کے درجے سے لکھنا شروع کیا ہے اور آخر میں اکائی کے ہندسے میں ضرب دی گئی ہے جس کا حاصل ضرب اکائی کے درجے سے لکھا گیا ہے سیکڑہ اور دہائی کے ہندسوں میں ضرب دیتے وقت حاصل ضرب میں جہاں اکائیاں اور دہائیاں نہیں ہیں۔ وہاں بریکٹ (قوس) میں صفر رکھدے ہیں۔ تاکہ عمل بچوں کو ٹھیک طور پر سمجھ میں آجائے کافی مشق کے بعد صفر لکھنے کی ضرورت نہیں جزوی حاصل ضربوں کو جمع کیا گیا۔

دائیں طرف بھی وہی عمل زیادہ واضح طور پر بتایا گیا ہے۔ اس میں مضروب فیہ کی تحویل کے ہر درجے کے ہندسوں کو اکائیوں کی صورت میں بتاکر ضرب کا عمل کیا گیا ہے دونوں صورتوں میں نتیجہ مساوی پایا جاتا ہے۔

اس قسم کی ضرب میں (جس میں مضروب فیہ دو یا زیادہ ہندسہ والا عدد ہوتا ہے) دو سوال

پیدا ہوتے ہیں (۱) ضرب کا عمل چھوٹے درجے کے ہندسے سے شروع کیا جائے یا اعلیٰ درجہ کے ہندسے
(۲) دہائی یا دہائی کے اوپر کے درجے میں ضرب دیتے وقت سطر کے آخر میں صفر رکھنا ضروری ہے یا نہیں۔

عام رواج تو یہ ہے کہ مضروب فیہ کے اکائی کے ہندسہ سے عمل شروع کرتے ہیں اور دہائی یا دہائی کے اوپر کے درجہ میں ضرب دیتے وقت صفر نہیں لگائے جاتے بلکہ وہ جگہ خالی چھوڑ دیتے ہیں زمانہ حال کے مدرسین طریقے مذکور کو پسند نہیں کرتے وہ اعلیٰ درجہ کے ہندسے سے ضرب کا عمل شروع کرتے ہیں۔ اور دہائی اور دہائی کے درجوں کے ہندسوں میں ضرب دیتے وقت صفر بھی رکھدیتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے۔

جدید طریقے پر عمل کرنے سے حسب ذیل فواید نظر آتے ہیں۔

(۱) بڑے درجے کے ہندسے سے ضرب کا عمل شروع کرنے میں بڑا جزوی حاصل ضرب جلد معلوم ہو سکتا ہے۔

(۲) زیادہ مشکل مضروب فیہ کے اعلیٰ درجہ کے ہندسہ میں ضرب دینے کا عمل پہلے ہی ہوجاتا ہے۔

(۳) جواب کا تقریباً اندازہ لگانے میں سہولت ہوتی ہے تخمیناً جواب لانے کی صورت میں یہ طریقہ زیادہ کارآمد ہو سکتا ہے۔

سب کے اعلیٰ درجہ کے ہندسہ سے ضرب دینا زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ اس میں ہندسوں کو ہٹانیکا کام زیادہ ہوتا ہے۔ سَو کے درجے میں ضرب دینی ہو تو حاصل ضرب سَو کے درجہ سے لکھنا شروع کرنا چاہئیے یعنے اکائی سے دو درجے بائیں طرف سے عمل شروع کرنا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اکائی اور دہائی کے درجوں پر صفر رکھنے سے آیندہ مضروب فیہ کے ہندسوں سے (دہائی اور اکائی سے) ضرب دیتے وقت غلطی ہونیکا اندیشہ (حاصل ضرب کے ہندسہ سے لکھتے وقت) بہت کم ہوتا ہے۔ اس سے عمل بھی واضح اور صاف پایا جاتا ہے۔

اور ایک سوال جدید طریقہ پر بتایا جاتا ہے۔ مثال ۲۶۸۷ × ۲۴۵

۲۶۸۷
۲۴۵
۵۳۷۴۰۰
۱۰۷۴۸۰
۱۳۴۳۵
۶۵۸۳۰۵ جواب

مدرس بچوں سے سوالات حل کراتے وقت ان کے عمل کو غور سے دیکھتا رہے اور اس بات کی احتیاط رکھے کہ بچے ہندسے بالکل صاف اور باترتیب لکھیں ۔ صاف ۔ سادہ ۔ اور باترتیب ہندسے جواب کی صحت کیلئے ضروری ہیں ۔ بچے ذیلی عمل اپنے دل میں کیا کریں اس کو کاغذ یا سلیٹ پر لکھنے کی ضرورت نہیں ۔ ان کا عمل اس قدر صاف ہو کہ اس سے ان کے خیالات کا اندازہ صحیح طور پر ہو سکے ۔

مدرس اور طلبار کو یہ خیال ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ ضرب گویا ایک میکانی عمل ہے ۔ ضرب کے سوالات حل کرنے میں بھی ذہنی قویٰ کو اچھی ورزش مل سکتی ہے ضرب کے مختصر طریقے طول طویل طریقوں سے ہی اخذ کئے ہوئے نتائج ہوتے ہیں ۔ ضرب کے طول طویل عمل پر حاوی ہونے کے بعد طلبار کو مندرجہ ذیل مختصر طریقے ان کی ذاتی کوشش سے دریافت کرنے کی ترغیب دلائی جائے ۔

(۱) ایسی ضرب جس کا عمل تفریق کی مدد سے آسان ہو سکتا ہے مثلاً ایسی ضرب جس میں مضروب فیہ ۹، ۹۹، ۹۹۹ وغیرہ ہو۔

جو طالب علم ۳۷۴۲ × ۹۹ کو حل کر سکتا ہے وہ اس بات کو جانتا ہے کہ ۹۹ = ۱۰۰ - ۱ یہ ذاتی کوشش سے سوال مذکور کو حسب ذیل حل کرتے تو اس کو یہ ترکیب پسند آئے گی کیونکہ اس ترکیب سے سوال جلد آجائے گا ۔

۳۷۴۲ × ۹۹ کا حل ۔ چونکہ ۹۹ = ۱۰۰ - ۱

لہذا ۳۷۴۲ × ۹۹ = ۳۷۴۲ × ۱۰۰ - ۳۷۴۲ × ۱ =

= ۳۷۴۲ (۱۰۰ - ۱) = ۳۷۴۲۰۰ - ۳۷۴۲

= ۳۷۰۴۵۸ جواب

تصدیق ۳۷۴۲

× ۹۹

۳۳۶۷۸

۳۳۶۷۸

۳۷۰۴۵۸ جواب

(۲) ایسی ضرب جس میں ضرب کا عمل اور جزوی حاصل ضربوں کی تعداد مضروب فیہ کے ہندسوں مقابلہ کرنے سے کسی قدر کم ہو سکتی ہے ۔ مثلاً مضروب فیہ اگر ۳۵۷ ہو تو مضروب کو ۷ میں ضرب دینے سے جو حاصل ضرب آئے گا اسی کو ۵ میں ضرب دینے سے ۳۵ کا حاصل ضرب معلوم ہو سکتا ہے ۔ اس طرح

بجائے تین سطروں کے ضرب کا عمل دو سطروں میں ہو سکتا ہے یعنی جزدی حاصل ضرب کی تعداد تقدر ایک کم ہوئی۔ مثال - ۳۵۷ × ۱۸۳۵ -

- ۵۰ × (۷ × ۱۸۳۸) + (۷ × ۱۸۳۵) = ۳۵۷ × ۱۸۳۸

تفصیلی عمل حسب ذیل ہے -

۱۸۳۵

۳۵۷

۷ × ۱۸۳۵ = ۱۲۸۴۵

۳۵۰ × ۱۸۳۵ = ۵۰ × ۱۲۸۴۵ = ۶۴۲۲۵(۰)

۳۵۷ × ۱۸۳۵ = ۶۵۵۰۹۵ جواب

مثال ۳۶۱۲ × ۲۳۴۷

مثال مذکور میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ مضروب فیہ کے آخری دو ہندسے (۳۶) اپنے پہلے دو ہندسوں (۱۲) کا سہ گنا ہیں لہذا اس ضرب کا عمل دو سطروں میں ہو سکتا ہے -

۲۳۴۷

۳۶۱۲

۱۲ × ۲۳۴۷ = ۲۸۱۶۴

۳۰۰ × ۲۸۱۶۴ = ۸۴۴۹۲(۰۰)

۳۶۰۰ = ۲۳۴۷ =

۳۶۱۲ × ۲۳۴۷ = ۸۴۷۷۳۶۴ جواب

ضرب کے جوابات کی جانچ میں بھی یہ طریقہ کارآمد ہو سکتا ہے -

ضرب بذریعہ اجزاء ضربی

یہ عمل عام استعمال میں نہیں ہے۔ تاہم بچوں کو سمجھانے میں ہرج نہیں ہے مثلاً کسی عدد کو ۱۲ میں ضرب دینا ہو تو اس کو پہلے ۴ میں ضرب دیکر بعد میں اس حاصل ضرب کو ۳ میں ضرب دینے سے نتیجہ معلوم ہو سکتا ہے یہاں ۱۲ کے اجزاء ضربی ۴ اور ۳ لئے ہیں۔ مثال ۲۵ × ۱۲ = ۲۵ × ۴ × ۳

= ۱۰۰ × ۳ = ۳۰۰ جواب

مثال ۳۶ × ۱۸ = ۳۶ × ۶ × ۳

(i) ۶۴۸ = ۲۱۶ × ۳ =

۱۸ × ۳۶ = ۳۶ × ۳ × ۳ × ۲

= ۱۰۸ × ۳ × ۲

(ii) ۶۴۸ = ۳۲۴ × ۲ =

عمل (i) میں ۱۸ کے اجزا ضربی ۶ اور ۳ لئے ہیں

عمل (ii) میں ۱۸ کے اجزا ضربی ۳، ۳، ۲ لئے ہیں۔

دونوں صورتوں میں نتیجہ وہی آیا ہے۔

بعض وقت یہ بھی تجربہ ہوتا ہے کہ مضروب فیہ کے اجزا ضربی تو آسانی سے معلوم ہو سکتے ہیں لیکن عمل میں آسانی نہیں پائی جاتی۔ مثلاً (۲۸ × ۶۳) میں ۶۳ کو ۲۸ میں ضرب دینے میں تقریباً اتنا ہی وقت صرف ہوگا جتنا کہ ۶۳ کو پہلے ۴ میں دیکر اس حاصل ضرب کو ۷ میں ضرب دینے میں صرف ہوتا ہے۔

ابتدا میں بچوں کو ضرب کا طول طویل (تفصیلی) عمل بتایا جائے۔ اور ان سے اس قدر مشق کرائی جائے کہ سوالات کے جواب عجلت اور صحت کے ساتھ دے سکیں اور اس کے بعد کسی صورت میں ضرب بذریعہ اجزا ضربی بتانا مناسب ہوگا جبکہ وہ اعداد کے اجزا ضربی سے واقف ہوں

Hygiene.

'Hygiene and Health Education' by M. B Davis.

'The Hygiene of the School Child' by Terman and Almack.

General English.

'The Writing of English' by P. J. Hartog.

Reference (General.)

'The Editoral' by Leon Nelson Flint.

Reports.

'A Report on the use of the Mother tongue as the Medium of Instruction and Examination in certain subjects for the Matriculation Examination of the Bombay University' by M. R. Pranjpe.

Indian Statutory Commission Interim Report on Education

Report of The Punjab University Inquiry Committee.

Miscellaneous.

'Carpentry for Beginners' by Evans Brothers, Ltd., London.

'What Life should mean to You' by Alfred Adler.

Additions to the Teachers' Library.

Education (General).

'Teaching Dull and Retarded Children' by Inskeep.

'The New Senior School' by T. Payten Gunton.

'Developing a Project Curriculum for Village Schools in India' by William J. McKee.

'The Evolution of Educational Theory' by John Adams.

'Education in Denmark' by Andreas Boje etc.

'Emile: or Concerning Education' by Jean Jacques Rouseav.

'How to Study' by McMurray.

'Educational Movements and Methods' by John Adams.

'Socrates persists in India' by F. L. Brayne.

'Problems for the Schoolroom' by Herbert McKay.

'Schools with a Message in India' by D. J. Fleming.

'The Young Teacher's Primer. by J. L. Davis.

'School Organisation' by S. E. Bray.

'Teaching: its Nature and Varieties' by B. Dumville.

'Citizen Training in School' by G. S. Krishnayya.

'Schools of Tomorrow' by John Dewey and Evelyn Dewey.

'The Education of Mentally Defective Children' by Alice Descoendres.

Educational Methods.

'Teaching by Projects' by McMurry.

'Science Teaching' by F. W. Westaway.

'The Teaching of Elementary Mathematics' by D.E. Smith.

'The Teaching of Elementary Mathematics' by Godfrey and Siddons.

'Classroom Management' by Bagley.

'Modern Developments in Educational Practice' by J. A. Adams.

'The Teaching of History' by C. H. Jarvis.

'How to teach Geography' by L. D. Stamp.

Child Education.

'The Child His Nature and Nurture' by W.B. Drummand.

'Practical Kindergarten for Infant Schools' by Mrs. E. Martimer.

'The Advanced Montessori Method I' by Maria Montessori.

'The Advanced Montessori Method II' by Maria Montessori.

'The Montessori Method' by Maria Montessori.

'Early Childhood Education' by Pickett and Boren.

Examinations and Tests.

'Systems of Examinations' by Ziauddin Ahmad.

'Mental and Scholastic Tests' by Cyril Burt.

'Intelligence' by P. L. Boynton.

'Handbook of Tests' by Cyril Burt.

'How to Measure' by Wilson and Hoke.

Psychology.

'How We Think' by John Dewey.

'Problems of Subnormality' by Wallin.

India.

'Medieval India' by A. Yusuf Ali.

Geography.

'The Countries of the World' by A. M. Dell.

General Science and Mathematics.

'An Introduction to Mathematics' by A. N. Whitehead.

new words to those already learnt in Readers I to VI, Dr. West has brought a great English book within the reach of the Matriculation students. Price Rs. 1/4.

(3) "**England and the English People**" by C. E. Eckersley, (Price Rs. 2/6/6). Though difficult, this book is a good introduction to a few great names in English literature.

(4) "**A Wonder Book**" and "**Kidnapped**" (Price Rs. 1/3/3 each) in the Simplified English Series are books which the pupils of High School classes can read and understand without the aid of a dictionary.

(5) "**The New Age Poetry Books I, II, and III**" contain many poems suitable for class recitations. These poems are simple not only in language but also in metre and thought.

(6) "**Pioneers of Progress**" by Higham. (Price Re. 1). Social history receives scanty attention in the ordinary history text-books. "Pioneers of Progress" is an attempt to supply this gap. It contains stories dealing with the great changes which have taken place in social conditions in England and with the development of moral ideas during the last two centuries. Besides being full of useful information, the book is written in a simple and attractive style and is well illustrated. It should find a place in the library of every High School. It is also suitable as a prize book.

The Hyderabad Teacher.

ADVERTISEMENT RATES.

Space.	Whole year.		Six months.		Per Issue.	
	B. G.		B. G.		B. G.	
	Rs.	As.	Rs.	As.	Rs.	As.
Full page ...	12	0	6	0	4	0
Half page	6	0	3	8	2	0
Quarter page	3	0	1	12	1	0
Per line ...	0	10	0	8	0	6

SUBSCRIPTION RATES.

For the Nizam's Dominions O. S. Rs. 3 annually, (including postage).
For British India B. G. Rs. 3 a year (including postage).
Single copy O. S. As. 12 for H. E. H. the Nizam's Dominions.
Single copy B.G. As. 12 for British India.

The Urdu Section is published separately also. Subscription Re. 1 As. 14 a year.

Members of the Hyderabad Teachers' Association can obtain back numbers of THE HYDERABAD TEACHER at a reduced price.

Apply to **S. M. KHAIRATH ALI, Manager,**
"The Hyderabad Teacher"
Gun Foundry, Hyderabad-Deccan.

Reviews

"Citizen Training in School" by Dr. G. S. Krishnayya (Oxford University Press, Price Rs. 2).

The author Dr. G. S. Krishnayya needs no introduction to the readers of *The Hyderabad Teacher*. In this book he has stressed the need for treatingextra-curricular activities as essential elements of every school. Sir Philip Hartog has rightly pointed out in his Foreword that "it is only by such activities that those two correlatives, individual character and the corporate spirit, can be effectively developed". The value of Dr. Krishnayya's work lies in the fact that, besides describing how extra-curricular activities are carried on in the Western countries, he has given practical hints and concrete suggestions on the organisation, supervision and financing of such activities in Indian schools. There are useful and interesting chapters on The Student Council, The School Assembly, School Publications, Excursions and Parties, Clubs and Societies, Athletics and Boy Scouting.

While athletics, Boy Scouting, excursions, the school assembly and clubs and societies have been successfully introduced in many secondary schools in India, school publications and students' self-government present serious practical difficulties, the former on financial grounds and the latter on account of the lack of teachers who can give the right direction to the movement. The author does not, however, suggest that every extra-curricular activity described in the book should be inaugurated without regard to the peculiar conditions of each school. His main purpose is to help institutions "to direct these desirable efforts so that the maximum good may be secured". Any one who reads the book will agree that it fulfils this purpose admirably. The style and the arrangement of the matter are excellent. We strongly recommend this book for the libraries of all secondary schools.

Books received from Messrs. Longmans Green & Co., Ltd.,

(1) The New Method Reader VI by Dr. M. West (Price Re. 1) This book will be found particularly useful in schools where the New Method Readers I-IV are being taught. While retaining all the good features of the previous readers, it contains, besides, discussions on the meanings of English words, thus giving the pupils practice in the intelligent use of a dictionary.

(2) The New Method Reader VII (*The Vicar of Wakefield*) is the final work of the serries. By adding merely 471

Editorial

OURSELVES.

With the publication of this issue, *The Hyderabad Teacher* begins the eighth year of its existence. We regret to say that owing to his transfer to Aurangabad, Dr. Krishnayya has had to resign from the editorial staff. We thank him for the assistance which he gave to the journal during his stay in Secunderabad and hope that, though he is no longer able to serve on the editorial staff, he will continue to help us with his valuable contributions.

The Forthcoming Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

Arrangements are being made for the 7th Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association, which will be held in the City College on the 29th and 30th September, 1933, under the presidency of Nawab Zulcader Jung Bahadur, M. A., Barrister-at-Law, Home Secretary. The afternoon session on the first day and the morning session on the second day will, as usual, be devoted to Sectional Meetings, which will deal with Backward Children, Kindergartens and The School Time-table, respectively. There will be two lectures—one on "The Meaning of Japan" by Professor E. E. Speight and one on "The Role of the Teacher in the light of Modern Psychology and the changing conditions of the World" by Professor Khalifa Abdul Hakim. Along with the Conference, an educational exhibition will be held in the Methodist Boys' High School Assembly Hall, and it will be opened by the President of the Conference on the 28th September at 5 p. m. A feature of the Exhibition will be the introduction of a separate Kindergarten Section where a demonstration of Montessori and other Kindergarten apparatus will be organised. There will also be a *mushaira* on the night of 29th September.

is indebted to the school for the work it has done to improve the sanitary condition of the city and to free the place from the periodic attacks of cholera and typhoid.

The school boys take the hospital patients in their boats to cheer them up and to give them fresh air and change. The charity boxes that are kept in the classrooms serve not only to help the poor students of the school but also to support a number of widows. The pupils of the school are sometimes seen carrying weights for old men and women. They are also well known for their sympathy towards animals.

It is interesting to observe that out of every ten Government employees nine are ex-students of this school. I had the opportunity to meet and converse with some of the old students of the school and was much impressed by their character and spirit of service. They are scouts in the true sense of the term, though they do not wear the scout dress nor belong to the scout organisation.

Unlike most educational institutions in India, the C. M. S. School at Srinagar does not merely prepare its students for examinations but does all it can to build up their character, so that they may become useful citizens. Every student when he leaves the school, goes out into the world surcharged with the idea of service to his fellow-beings and to his country. Besides being well-informed and cultured, he is honest and truthful and is always prepared for self-sacrifice. Such is the education the Kashmir youth is fortunately receiving. It is earnestly to be hoped that other schools in India will follow in the footsteps of this institution to fulfil the real object of education.

of school. It is through the example of the masters that the boys are encouraged to go out to do all sorts of jobs of social service. There are countless stories of kindness, un-selfishness and bravery of these wonderful men of the staff.

Character Form.—There is a Character Form which is a combined health and character report. In the form the character side is divided into mind, body and soul and marks are allotted for each sub-heading under these three main heads. Before the form is signed by the Principal, the boy and the teacher in charge are asked questions, if necessary. Apart from other advantages, this method enables the Principal to find out whether the teacher has been taking interest in his pupils. Inspiring mottos such as the following are displayed in different parts of the school building.

1. " Trust in God. "
2. " Honest labour is worship. "
3. "Say little, do much, be careful. "

Social Service.—A Knight Errant Society has been formed in the school whose members take a pledge to help womanhood. There have been thousands of instances where these Knight Errants, present and past students of the school, have done chivalrous deeds in the way of the moral protection of women.

The school boys have on various occasions served as the best fire brigade and saved the public from heavy loss. Fires are of common occurrence in Kashmir, for the houses are mostly built of wood.

The staff and the students have done much in the direction of marriage reform and have been instrumental in bringing about a few widow re-marriages. Another achievement of the school is dress reform. 'Pherans' are being gradually replaced by more sensible dress. The municipality

The punishment for dirty tricks is to perform the objectionable tricks in the school compound repeatedly, standing on a perch called the " Monkey Pole".

A money box is kept in each class and the classes compete as to which one will give most in charity every month. On one occasion the Principal came to open the boxes before the assembled school and found all the boxes empty. The school doors were closed and every boy was searched. The culprit was caught with 76 copper coins. A blacksmith was sent for and a necklace ordered out of the coins to fit the neck of the culprit which he had to wear for 76 days.

Boards of Honour.—Black boards, called Boards of Honour, are hung at different parts of the school building on which the names of those who have shown special grit, for example, swimming across the Wullar Lake (about 4 miles broad) or jumping into the river from the school roof (50 ft. high) are written. On another board the names of the winners of Lord Lamsdown's medal are written, the winner being voted by his school fellows to have best upheld the traditions of his school in body, mind and soul. On a third board the names of the boys who have done acts of extraordinary bravery are written in golden letters. On a fourth board the names of those boys are written who have sacrified their lives for others.

Prizes.—In years gone by there used to be an annual prize distribution, and the clever boy used to carry the day. It has now been abolished, for it is believed that individual prizes put a premium on bookishness and cramming. Now a prize is given to the class which gets the highest number of marks in the year. Thus it is the interest of the clever boy in the class to help the dull and stupid ones.

The Staff and its Duties.—Most of the members of the staff are old students of the school. They have a pretty busy time. Their work is not over with the closing of the class rooms. Every master is the tutor of about 25 boys whom he must get to know thoroughly by visiting them at home and by watching the kind of company they keep out

were scrubbed with soap and water, and ointment was applied. Thanks to these measures, the dirty disease has now been completely stamped out of the school.

Swimming.—Swimming is compulsory in the school. Formerly, except the prefessional swimmers called Hanjees (boatsmen), nobody in Kashmir knew swimming, for it was believed that the waters were haunted by hob-goblins. This fear was overcome by numerous demonstrations, and every boy is now taught swimming and life-saving. The school has produced thousands of swimmers who have saved many from being drowned. Every Tuesday afternoon boating competitions, 'Regattas', are held between different schools. At least 8 schools are represented with caps and pedals of different colours. This spectacular race, with music at the bank of the Dull Lake, attracts a huge crowd. At a certain signal each boat is sunk in the lake, whereupon the members of the rowing team dive to pick up the boat which is finally rowed to the goal.

Punishments.—The school has no rules except the rule "Behave as gentleman". The methods of punishment employed are sometimes ingenious. The Principal neither believes in impositions nor in the use of the cane. He looks upon the cane as a surgeon's knife to be used only when other methods fail. As the surgeon does not wish to use his knife twice for the same operation, so here the same attempt is made to limit the use of the cane in order that it may be a curative rather than a temporary measure. The punisment given in a particular case is made to fit the crime committed. A few instances may be worth mentioning.

Boys who talk too much are made to stand on a "parrot perch". There they must talk for a given period of time. They may talk whatever they choose. This is watched and kept going by a peon.

If a boy is found copying in an examination, he is made to consult all the books he wants and is expected to secure cent per cent. marks. The slightest mistake gets him a zero for the whole paper and he fails.

which take place during each week in different parts of the world is pasted on a notice board and also explained by the teachers to their respective classes. This practice helps to take the eyes of the pupils from the narrow limits of Kashmir and helps them to realise the vastness and variety of the world.

Health Supervision.—The health of the pupils receives special attention. A room is maintained in the school where medicines for emergency purposes are kept. A medical man attached to the school visits off and on to attend to the needs, if any. A thorough medical examination of the boys is held twice a year.

Prayers and Exercise.—The day's work begins with prayer. This is followed by physical exercise, which is compulsory for all the boys. The boys are divided into six groups and all these groups are engaged at the same time in different kinds of physical exercises in the limited open space available. Practically all the members of the staff are present and help in the supervision of the different groups.

After the physical exercise period when the students enter their respective classes, the first ten minutes or so are devoted to the inspection of cleanliness. At certain entrances two mirrors are fixed face to face so that every boy who passes that way may be able to see not only his front but also his back When the boys enter the school they do not have any idea of cleanliness. Once on being asked as to how long it was since the 'Pheran' (upper garment) was washed, a boy replied, "I don't know; it was handed over to me by my father". To overcome dirty habits, whenever a boy is found wearing dirty clothes, he is made to wash them before he is allowed to enter the class.

There was a time when practically every boy had his head covered with ulcers and scabs, which were obviously due to lack of cleanliness. Every day the boys' heads

not to be found in the usual curricula programmes. Thanks to the methods sketched below, the boys not only acquire knowledge but are also trained to make the best use of their hands and eyes.

Interesting Features of School Work.—In some classes a map of an important country is hung and each class is supposed to represent that country. It is hoped that during the stay for one year in the class the boys will learn all about the country. Much stress is laid on Home Geography, for, as is rightly remarked by the Principal, "The boy will willingly learn all there is to know about Melbourne, San Francisco and Leeds, if the Punjab curriculum requires it, but will be incapable of telling you how to get from one part of his own country to another or naming the products of Kashmir." To achieve this end, relief maps are prepared in the open, showing the lakes, rivers and mountains of Kashmir.

The lessons in Nature Study are illustrated by pictures of birds whose habits, food, etc. are explained to the boys. During holidays the boys are taken out on hikes and are taught the properties and uses of the trees observed. There is a special room in the school where dozens of specimens of nests and eggs of birds collected by the boys during these excursions are kept.

Pictures showing the effects and after-effects of smoking are hung in the classes attended by bigger boys.

Apart from the weight attached to observation of pictures and models, encouragement is given to the boys to read illustrated papers. In other words, the most modern method of education—" learning by doing "—is followed in its true sense. Every effort is made to discourage cramming.

A weekly meeting of teachers is held regularly at which the teachers exchange ideas and discuss the affairs of the present week. A summary of the important events

A Nucleus of Education in Kashmir

BY

Dr. M. A. HAI, L. M. & S., D. P. E.

In the month of May last, in the course of my tour of Northern India, I had an opportunity to visit Kashmir. In that beautiful country I came across a school which has many striking features. This school is known as The C.M.S. (Church Mission Society) High School and is situated between the most populated area of Srinagar on one side and the Jhelum on the other. The building is not modern. It is of a design common in Srinagar with no compound except about 80 ft. square courtyard in the centre of the building. Nor is the furniture adequate. The school is aided by the local Government and has 300 pupils on roll. The curriculum followed is that of the Punjab Education Department.

The founders of the school had to face serious opposition in the beginning owing to the extreme orthodoxy of the Kashmiri who tried to crush the institution and its activities. The chief credit for the present state of efficiency of the school is attributable to Mr. E. D. Tyndale Biscoe who has been working as Principal for the last 42 years.

At the time when the school was founded, the well-to-do classes in Kashmir had a strong prejudice against manual labour and physical excercise; it was a common belief that manual labour and exercise give muscles which are good only for low class people. Indeed, physical education was held in such contempt that when it was first started in the school, the storm of opposition which it aroused led the Maharajah to stop it.

Aim of the School.—Undeterred by these difficulties, the authorities persisted in their noble efforts. The aim has been not only to instil love of knowledge into the boys but to teach them things of general usefulness such as are

3. There is much scope for reducing the number of written Examinations.

4. Oral and Practical Tests should be given greater prominence than is the case at present.

5. The work of the whole year should count for promotion. The Annual Examination with the Institution or the Public Examination should not be the sole Test in determining the future of the student.

6. The idea that all books must be excluded from the Examination Hall should be recognised as not the last word in the matter. At least in higher College courses, books may be allowed in the Examination Hall.

7. Accrediting by the University concerned of certain High Schools as fit to conduct their own Matriculation Examinations may not be inadvisable.

* 8. There should be a greater combination of internal and external examiners.

9. There should be regular training for Examinership. Meanwhile there should be more frequent meetings of all the examiners in each subject.

10. Where there is keen competition for Scholarship or recruitment to select appointments, each paper should be evaluated by a panel of Examiners.

11. Occasional Medical examinations should be introduced. Physical education must be made more efficient and attractive.

12. The School-Leaving Examination and the Matriculation must be clearly differentiated as their purposes are far from being identical.

Sivaswamy Aiyer and Dr. Ramaswamy must certainly have thought of other kinds of tests also but they too do not think it possible to test real moral progress by examinations. "Moral progress, if reduced to a test by means of an examination may not result in moral progress. A boy may get good marks and may yet have most criminal tendencies." (Ramaswamy). Miss Sykes "cannot imagine a moral test which would not defeat its own purpose. I would welcome enlightenment." The illumination she seeks could not be found in any of the answers we have so far received.

Asked whether there is any particular defect in the examination system in their own Provinces which other places in India have not, most of those who kindly sent in answers say that they do not know of any defect which is particularly theirs. Two gentlemen, one from Ahmednagar and the other from Gujerat, mention respectively the identity of the School Leaving and the Matriculation Examinations and the slow pace of vernacularisation. But these defects are more or less common everywhere in India. As one of our friends observes "The same steam roller is at work everywhere and there is no way out of it."

The findings embodied in this Report show that a very much superior system is not yet in sight and that we have to put up with the existing system as the most convenient and practical and therefore the best available tool that we know of. This does not mean that the defects in it are not serious. They are undoubtedly grave defects, but in spite of them the whole structure stands as something inevitable. The following suggestions if generally accepted will lead to a lot of improvement :—

1. Greater use must be made of the new Intelligence and Attainment Test.
2. Education, and naturally the Examinations also, should be increasingly conducted through the medium of the mother tongue.

friend from Gujerat, "consider all cases alike." There is only one who is uncompromising in his opinion that if a student does not take interest in games, he will have to be sent away. Miss Sykes also perhaps would have liked to do the same, but she is afraid of the present state of public opinion as represented by parents No one however will disagree from her when she mentions "that (a) mental development has much more to do with healthy-physique than is generally recognised and (b) that a school should not educate merely the mind." Mr. Wilder does not like to detain a boy in the same class merely for want of physical progress but he "would note his defect in his certificate and leave it for others to judge his fitness for a given line of work or study." The same suggestion has been made by Sir Sivaswamy Aiyer who "would adopt a system of separate certificates for intellectual and physical progress." This is certainly an advance upon the current practice of taking no note at all of a student's indifference to the culture of his physical self.

Re. the question, "Will you have by examination to test the moral progress of a student? if so, what types of tests will you use?" there were very few who had some hope of doing it. Mr. Prasad recommends tests on scout lines, record of service etc. Mr. Wilder considers a moral test difficult but has some hope of doing it though he also admits its difficulty. "But to do so is possible," in his opinion "to some extent by the methods developed by Watson and others of Columbia University. No other test is yet known to be reliable." All others are extremely diffident, to say the least, about the efficiency of any test in the moral sphere. Mr. Venkatachala Aiyer would put more faith on the verdict of the class teacher and of the fellow students when he wants to judge a student's moral worth. Some who have sent in answers have not visualised any test other than a written test and they naturally feel that a student may express fine sentiments on paper but his actual performance in real life may belie his written words. Sir

the use of books. The true principle to be laid down is, books may be permitted wherever it is not the mere perusal of the printed page that will furnish an answer, but intelligence is required for understanding the meaning of a passage or for solving a problem."

The question of the use of Vernaculars presented two different points of view. A few of them were against it. The ordinary arguments of want of proper words and good text-books and therefore the possibility of student's performance wanting in precision and accurate thinking were mentioned by them. But the majority held that vernacularisation would make the answers more intelligent and intelligible. One of them says, "The strain of the students will be lessened and vernacularisation will lead to the enrichment of our literature as well as to the easy assimilation of knowledge by students" (Chandaverker).

Physical Culture and Moral Tests.—Most of the educationists mentioned think that though physical culture is very important, to detain a student in the same class because he does not do well in physical exercises is unjust. Prof. Wadia says, "If physical culture is a part of regular course, it is for school authorities to see that the student undergoes this course. If in spite of this, he does not improve in physique, it is no fault of the student. Possibly he suffers from some definite defect or from malnutrition and in such cases, his school career should not be marred by withholding promotion to a higher class." As Mr. V Prasad says, "The institution, parents and teachers being more responsible, the student should not suffer." "Failure to make adequate progress is many a time due" as Dr. Ramaswamy says, "to lack of opportunities and proper environment. As such it is not fair to penalise." On the other hand, all attempts should be made to secure conditions which will compel every individual to pay due attention to this side of life." "Entice him, advise him, or even force him to take exercises, but do not," says our

advance in age, shonld be capable of marshalling forth their thoughts about a problem or topic, organise the same in a judicious manner and express them in a reasonable and correct form" (Dr. Ramaswamy). "They are needed as a test of ability to express oneself clearly and develop a consecutive theme—very necessarily ability in ordinary business or professional life." (Miss Sykes). It was generally felt that there was nothing wrong if candidates were generally allowed the use of books in examination halls. But the practical difficulties are manifold. Still it was felt that at least in the higher college classes an attempt might be made to allow books. Even in the lower grades of educational institutions, it is useful for teachers and examiners to bear in mind that the need to refer to some book or books does not always indicate an inadequate intellectual equipment. The other side of the case has been ably presented by Sir P. S. Sivaswamy Aiyer who writes ;— "I think there is much to be said for the present practice of preventing students from referring to books. The advantages of cultivating a good memory are now completely ignored and—wrongly so". Even he however is not entirely against all use of books. "If books are permitted to be used", he says, "far greater care and intelligence will have to be exercised in selecting such questions as cannot be answered by copying from some pages of a book. Care will have to be taken to exclude books containing an answer to the identical question. The cases in which the use of books may be permitted are, for example, examinations in law, provided the answer to the question involves the application of a number of principles to the facts of a particular case and a search has to be made for the true principles to be applied. In these cases the judgement of a candidate as well as his geographical knowledge of the contents of the book can be tested. There is no use in allowing the use of books for answering what are called book-work questions. If the questions are all problems not to be found in their entirety in any book, there would be no harm in allowing

same time, it has been pointed out by several of our educationists that all teachers are not necessarily good examiners. "The present methods of choosing examiners from among the general body of teachers is" according to Miss Sykes, "most unsatisfactory." She would choose specialists for examining purposes. Mr. Wilder would have a special course for all aspirants after examinership Mr. Venkatachala Ayyer also desires a course in examinership. He suggests that meanwhile common agreed principles in valuation in each paper or subject may be arrived at by experts and communicated to teachers so as to avoid individual teachers aiming at different standards. Something better still is even now being done in the Bombay University. Here, whenever there are several examiners in one subject, they meet together and discuss all possible varieties of answers and there are moderators appointed who are expected to see that no teacher is unduly carried off by his own ideas of what the answers ought to be. This can be copied with advantage in those provinces where each examiner is absolutely free in the matter of his own bundles of answer books.

New Methods in Examinations.—About possible changes in methods of examining, there was a variety of answers. Most of the answers expressed the opinion that such things as True-False Test, Completion Test and Recognition Test could with convenience be introduced. The educationists who sent in answers had either experience in the matter or were generally acquainted with the literature on the subject. "A child with intelligence but little command of the language is not handicapped as in essay questions; this is specially desirable where the medium is so often a foreign language" says one of them. These types of questions are particularly welcome in the Primary and the lower grade of Secondary Schools. All who sent in answers however were positively against excluding all questions involving answers in essay forms. "We want that boys and girls as they

Frequency of Tests.—The majority of opinions was that examinations are more frequently necessary in the lower classes than in the higher. One at least (Mr. Prasad) has suggested that there should be no examination whatever in the Primary Schools. Several have suggested quarterly tests in the primary and secondary schools. Many are not in favour of weekly examinations. The answer from Palanpur (Gujerat) says that by taking up one subject for weekly test, students neglect other subjects during the week; that this leads to huge arrears of work in all subjects in the long run, that it is a great burden on the teachers and that in spite of the constantly recurring examinations students are likely to neglect them as they know that it is the result of the annual examinations that decides the promotion. Quarterly examinations are favoured by some of those who have sent in their answers. In Colleges, the general opinion is that the number of examinations need be only one in the year or at the most two. One at least (Dr. Ramaswamy) has suggested that there need be no examinations at all in the colleges until the end of the four years' course when there many be a *Viva* before an Examination Board. He holds that at the end of the first two years, the professors' certificate as to the progress made should be the passport to get into the third year. A test once a year is generally favoured for technical institutions.

Internal and External Examinations.—Almost all the answers are definitely and strongly against the introduction of a new general examination in secondary schools prior to the Secondary School Leaving Examination. Most of the answers are also against a general examination for all the students of a language area at the end of the primary school course. One or two people have mentioned that they are not against Primary Examination for a whole district.

Almost all the answers favour a combination of internal and external examiners for the Public Examination. At the

examinations "help students to find out their weak points." Others think that they give the public some idea of the work of the school and still others that they help recruitment to public service. Sir Sivaswamy Aiyer thinks that "in theory examinations are useful as a means of testing the ability and progress of students and the efficiency of the educational institutions, though the public examinations as they are conducted now are not as satisfactory as they should be." None of these educationists thought that examinations could adequately be substituted by anytning else on a large scale. In the case of individuals or individual classes the opinion of teachers and sometimes even the opinion of students of the class about their classmates may be valuable, but they are not sufficient. Hence the general agreement on the usefulness of examinations.

None however was so optimistic as not to find defects and serious defects in the system. All who have sent in answers feel that examinations as they are now conducted encourage cram work and tend to discourage the many sided developments of students. About the evil of variations in examinations, opinions are sharply divided. Dr. Krishnayya mentions an experimental study in essay valuation conducted not long ago in Mysore. 50 teachers valued the essays of 23 pupils in Form IV and the results were classified in four divisions. It was found that 15 out of 23 had been placed in all the four classes and not a single essay had been placed in the same class by all the 50 teachers. Further, all the 23 had been made to fail at least by 3 out of the 50 examiners. He concludes that examiners' marks are variable and inconsistent because when marking papers, they are not measuring the same trait or skill. Other educationists (Messrs. Wilder, Prasad, Ramaswamy, Venkatachala Aiyyer and Wadia) think that variations in examinations are not so serious an evil as some would represent them to be. As Miss Sykes says "they are not the root evil, though they are of course an aggravation of the evil".

VII. Are there any particular defects in the Examination system in your Province or in your City which other places in India have not? If so, what are they? and how do you propose to deal with them?

VIII. If you wish to raise any questions not directly or indirectly mentioned in this Questionnaire please raise them.

The number of answers received was not large, but it is gratifying to find that answers were received from several Provinces or States in India. Answers were received from Madras, Ahmednagar, Mysore, Cochin, Hyderabad, Allahabad and Gujerat. The persons who sent in answers are :—

1. Sir S. Sivaswami Iyer, Madras.
2. Miss M. Sykes, Bentick High School, Vepery, Madras.
3. Mr. S. V. Venktachalla Aiyyar, Nemmara. Cochin.
4. Dr. G. S. Krishnaiyya, Hyderabad.
5. Mr. F. S. Wilder, American Marathi Mission High School, Ahmednagar.
6. Professor Wadia, Mysore.
7. Dr. Ramaswamy, District Ed: Officer, Chitaldurg, Mysore.
8. Mr. G. A. Chandavarkar, Hyderabad Teachers' Association, Hyderabad.
9. The Secretary Teachers' Association, Bishop Heber High School, Trichinopoly.
10. Mr. V. Prasad, Allahabad.
11. Mr. V. D. Haldi, Palanpur, Gujerat.
12. Mr. S. R. Tiwari, Baroda.

All the educationists mentioned above find that examinations in some form or other are necessary. They are chiefly useful, as Professor Wadia generally remarks, "for testing the knowledge of candidates and incidently their power of expression." Mr. Wilder finds them useful 'for measuring scholastic progress and also to find what a class has failed to grasp in a given subject." Miss Sykes would welcome it as giving a "definite objective for the students in their work and as providing both pupil and and teacher an external standard by which attainment may be measured" Mr. Venkatachala Aiyyar points out that

(2) Do you approve of the proposal made in some Provinces to have a general public examination in secondary schools prior to the Secondary School Leaving Examination ?

(3) Is it your experience that those subjects which are tested only by internal examiners (*i. e.* examiners within the Institution itself) are neglected, while students give more careful attention to subjects tested in public examinations? Have you any suggestion to remedy this evil if it exists?

(4) In public examinations also, do you think it wise to have actual teachers as examiners or to have others *i. e.* those unconnected with institutions whose work is tested? Why?

V. New methods in examinations.

(1) Have you any personal experience with the new methods in examinations in Primary and Secondary Schools?

(2) What do you think are the advantages or disadvantages of such things as (*a*) Recognition Test (*b*) Completion Test (*c*) True-false Tests?

(3) Do you think that the questions requiring the essay type of answers are necessary, even if the Tests mentioned above are made use of? Why?

(4) Do you think that the present practice of preventing students from referring to books in Examination Halls a healthy or reasonable practice? What (*a*) Psychological and Theoretical and (*b*) what practical difficulties are likely to be met with in changing this practice? How can these difficulties be overcome?

(5) What will be the possible effects of Vernacularisation on examination?

VI (*a*) If a student does not show satisfactory progress in physical culture, will you prevent him from going to a higher class? How will you answer the point of view of your opponent in this matter?

(*b*) Will you have any examination to test the moral progress of students? If so, what types of tests will you use?

High School, Ranchi, and M. L. Agarwala, Inspector of Schools, Fyzabad. As it was not possible for the Committee to meet, a questionnaire was issued on its behalf to more than two hundred educationists. The questionnaire was also published in the Karnatak Journal of Education, Dharwar, and in the Bulletin of the All India Federation of Teachers' Associations. Dr. Krishnaiyya sent a copy of an Educational Magazine in which appeared an article of his on examinations, but no help was received from any of the other members of the Examination Enquiry Committee. A copy of the Questionnaire issued on behalf of the Committee is given below.

I. (1) What are the chief uses in your opinion of examinations?

(2) What alternative means are possible to obtain these results?

(3) Do you think that these substitutes are preferable to examinations? If not, what advantage have Examinations?

II. What are the chief defects in your view of the present system of Examinations?

(1) Does the system encourage cram work?

(2) Does it discourage many sided developments of students?

(3) Are the variations in evaluations a serious evil?

III. Frequency of examinations.

(1) How many examinations do you think are necessary in a year in (a) Primary Schools (b) Secondary Schools (3) Arts Colleges (4) Technical Schools and Colleges? Do you approve of (a) Weekly (b) Monthly (3) Quarterly examinations? Why?

IV. Internal and External Examinations.

(1) Do you approve of a general public examination, *i. e.* an examination for the whole language area, at the end of the Primary school course?

culture to him. All other subjects which are of help for the accomplishment of this aim they want to include. Indeed they form the necessary part of the curriculum. But they cannot take their place as a separate entity, in total isolation from the work. They are to be related to it, to form part and parcel of it and to arise out of it. Thus there will not be any division of interest nor any watertight compartments. For it will be a composite whole. Every subject will have its proper place and at the same time will be incomplete without the help of the others all having their centre of gravity in work which will infuse fresh vitality into them and will be enriched by all that they have to give instead. And as a result they want to have inspired workers who know their work well, have a great faith and find a new meaning in it and love it, and at the same time are not lacking in other human accomplishments which are necessary for a complete living.

(To be continued.)

On Examinations: A Report*

BY

ANJILVEL V. MATHEW.

Convener, Examination Enquiry Committee.

A Committee was appointed by the All India Federation of Teachers' Associations some time back to generally enquire into the nature of examinations and make suggestions for their improvement. Nothing however was done for a year or two. In the Bangalore Session of the Federation, (Dec. 1931), the Committee was reorganised with Mr. A. V. Mathew, Dharwar, as convener. The other members of the Examination Enquiry Committee were Dr. G. S. Krishnaiyya, Ellore (now at Secunderabad) and Messrs V. Guruswami Shastrigal, Tirukattupalli, Tanjor, S. K. Roy, St. Paul's

* Reprinted from the All-India Education Bulletin of All-India Federation of Teachers' Associations.

in these days. What then should be the main object of education? According to Plato, its main object is to fit a man for the work he is capable of, and this is the opinion which the modern famous thinkers on education seem to endorse with great avidity.

" The first duty in all education" says Kerschensteiner, "is to encourage each individual to realise his own work and to strengthen his powers by devoting to it all his intelligence and all his might. Vocational education is the door to the education of the man. The modern peasant (depicted by Passow) who could speak Greek but who on account of his lack of knowledge or his inability, let his farm go to ruin would make a deplorable impression on us in spite of his acquaintance with Homer and Sophocles." Professor Dewey also approves of this view when he says, "Education through occupations consequently combines within itself more of the factors conducive to learning than any other method." According to Ruskin the main object of education is 'to lead human soul to what is best in them', so that they may not only be 'happy' but also quite 'serviceable'.

Thus we see that the dominant ideal of education to-day is not merely to cultivate the intellect of the pupils but to train them to be serviceable. The cry is not knowledge for its own sake but knowledge for man's sake. This should not be interpreted to mean that the modern educationalists are taking only a narrow view of education and trying to make it purely utilitarian. Far from it. They are fully aware of the glaring defects of a one-sided education. They do not want to ignore the humanistic side of education. They do not want a mechanic to be a mechanic merely. They want him to be a complete man, a man with a broad outlook, deep sympathies and variety of interests. But this great and noble aim they want to accomplish through the medium of his work. They want him to realise the sanctity of it and want to make it a source of real

ancient masters was the only proof of culture and liberal education. But now the conditions have changed. The idea of dominance and mastership has given way to that of mutual service and co-operation. Work is regarded as essentially noble. Democracy demands respect for personality. The tendency to test thought before accepting it has changed the intellectual attitude of the modern man. The modern languages have been greatly enriched. The conception of culture and liberal education has undergone a great change. The modern conception of a liberal education not only includes the cultivation of intellect but also a development of the practical ability. A brief quotation from Huxley's "Science and Education" will explain clearly what I really mean.

"That man," says he, "I think has a liberal education who has been so trained in youth that his body is the ready servant of his will and does with ease and pleasure all the work that, as a mechanism, it is capable of; whose intellect is clear, cold, logical, an engine with all its parts of equal strength and in smooth working order, ready to be turned to any kind of work and spin the gossamers as well as forge the anchors of the mind; whose mind is stored with a knowledge of the great and fundamental truths of nature and of the laws of her operations; one who, no stunted ascetic, is full of life and fire, but whose passions are trained to come to heel by a rigorous will, the servant of a tender conscience, who has learned to love all beauty, whether of Nature or art, to hate all vileness, and to respect others as himself."

In this famous passage Huxley has tried to sum up all the ethical, intellectual, practical and aesthetic qualities of liberal education. Thus we see that a purely general and traditional education whose main object is to cultivate the intellect is out of date now. We cannot afford to be merely idealistic and theoretical and ignore the practical side of life. A man with such an education will be an anachronism

The Aims and Ideals of Modern Education

BY

K. M. YUSUFUDDIN, M. A. (Leeds),

Head-Master, Government Osmania High School, Jalna.

In a previous article,* I have tried to explain that the modern outlook on life is quite different from that of a century ago. The new order has its own vital needs which a modern system of education should endeavour to meet in the best way possible. How can this be accomplished successfully? How has the system to be organised? What should be its aims and ideals? Should we discard the ancient ideals of a liberal and general education and replace them by those of technical and vocational education? Are we to ignore the humanities and substitute for them all that is practical and of immediate use? Either of these to the total exclusion of the other is inadequate as it cannot satisfy the needs and requirements of a modern society. The old ideals have to be retained at least in spirit, if not in form. They have to be supplemented and modified by the new, not to be superseded by them.

As I have stated in my previous article, the old system of education was organised to train a dominant class, members of which had plenty of leisure, had many servants and slaves who were prepared to do every form of manual and practical work for them. Hence they thought it below their dignity to do any such work themselves and devoted their whole time to speculation and philosophy and to the cultivation of their mind and intellect. Their knowledge at best was abstract and theoretical and the whole of it was derived from books. Tradition and authority held sway and were not to be disputed. A knowledge of Greek and Latin was essential and a first-hand acquaintance with the

---

The Hyderabad Teacher, Vol. VII No. 3.

teacher. In this class we make no attempt to teach English speech, a babe must learn to speak his own mother tongue before trying to talk in any other language. All the most useful of the Montessori Apparatus is here, as well as other apparatus of the teachers' invention. We are always adding to our stock of sense-training apparatus, and the teachers are most hard-working in making it. I want you to see some of the things in use, afterwards, and you will understand how the child is taught by them.

The teaching of English names for a few objects, and counting in English, are taught as a game, and in the next class, too, it is good fun. Names of things, simple commands, little polite phrases, form the subjects of the English work of the children below seven years. Please look at some of the teaching apparatus to see something of the methods used. When the sound of English is fairly familiar, we begin to read it, from big sheets, not from books, but the sheets are a preparation for the books we use in the next stage, where reading and writing are begun. The books have been chosen from a number of samples, as the best from these points of view:—the pictures are numerous and amusing, the print is good and large, and the sentences well spaced. The subject-matter is interesting, and I hope that these books will be used still more widely than they are at present; they have failings, but fewer than most. All the actual teaching is done in Urdu throughout the school, but the English of the upper classes is well spoken, not very fluent, but the accent is as nearly perfect as constant practice can make it, and it is pleasant to listen to.

I have kept you a long time to explain all this to you, but I know it is fresh to most of you, and those who already understood our methods must pardon this repetition of them for the sake of the strangers. The lessons and illustrations in the classrooms will explain and amplify what I have said, and after the sports I will be glad to see you looking at them, and if further explanations are wanted by anyone, I will be pleased to give them.

nails in. The six-year-olds made the cardboard furniture, and you see how all the work they do is *for* something, nothing is made for the sake of making but for using afterwards. We have no place here for elaborate handwork which takes much time to do, and is then put in a cupboard to be admired. What we teach is, first, to make something useful, second, to make it yourself, third, to make it as well as possible. In these early stages, teaching is only a way of getting children to do things, no highly-finished pieces of work are here, because we know that a child does not and cannot make a highly-finished piece of work himself, it is teachers' work, not children's work, which is flawless and completely finished off.

In Physical Training, I believe that we are in advance of any other Primary School, for every child has, every day, a Drill period, and a Games period. There is also a period every day for gardening. After roll-call, each child takes spade, hoe, and watercan, and tends his garden, cleaning his own tools at the end of the period ; this teaches them that labour is not undignified, but good fun, and it makes them independent also. Last season, the children took home from their gardens, cabbages, carrots, lettuce, and a few chilis all their own growing ; cannot you guess how good they tasted ? Arithmetic follows the gardening, then two periods of Urdu, with a pause for play between them, then comes Drill, then English or a story lesson, another story lesson or Religion. An hour for tiffin and play is allowed, then the afternoon session consists of English, Handwork, and Games. The K. G. has a rest period in the mid-morning as well as the other breaks. It is a time-table hygienically and psychologically sound. Homework is set, but is excused on request of parents.

The K. G. proper may be of less interest to today's visitors than to mothers or other women visitors whom we expect tomorrow, but I must tell you that, to the best of my knowledge, it is the only K. G. under a trained Montessori

The children have learned their long measure in arithmetic by making a dolls' house; they sold sweets to teach one another the value of dub, anna and pice in relation to their sweet buying abilities. This selling of sweets involved weighing also, and little sums were worked out joyfully to find how much we must charge for an ounce if we paid Rs 4 a seer for our sweets. There is much of the less exciting work in arithmetic, but even this is rendered interesting by such cards as you see, teaching tables, and division, and at the same time delighting the eye by gay colours.

Our next great feature is the quantity and variety of manual work taught by proper lessons in clay modelling, pastel, painting, design, drawing, paper and cardboard modelling (not folding into useless intricate shapes but making toys), elementary carpentry, group work and individual work. Look round the rooms and see the children's efforts, and remember please that the child does the child's work, it is not touched up by the teachers. They teach but do not touch. The child learns by making mistakes not by being prevented from making them. Here you will not see the teacher draw an object on the board and the class copy the drawing; they copy the real thing. Their errors are corrected by themselves, if possible; if beyond correction, they often say "Can I do it again". They have experimented in pattern making, in stick printing, as shown on the dolls' house walls and in potato-block making and printing.

The various exhibits will show you what sorts of things the children can make; the only work done by the teacher is that which is really beyond the strength of little hands; it is surprising how much the children can do in the way of simple carpentry, designing, and colouring. They made the whole of the dolls'house except the interior partition, which the teacher wired into place; they wired the sides and back together, hammered the base into position, even helped to saw this hard teak wood, and to hammar the large

school increase. Of what other Primary School can it be said that the whole staff consists of trained specialists?

After his training to learn by doing, in the K. G., we do not expect the older child to carry on in the old, dull, bad way, with slate and book, with fear of the stick and hope of a prize. We continue in the Playway. This method has made a name for itself in America, and I have used it with much success in England. I am giving it a trial here, and I do want your help in the matter. Let me explain it in this way: some, indeed most of you probably have a hobby to which you devote much of your spare time quite willingly. You spend hours at your hobby, be it tennis, stamp collecting, photography, music or something else, and in connection with it you learn a number of facts Yo do not feel vexed at spending time on it, possibly you return to it as soon as your daily work permits. Now the child's hobby is to play. But to him it is no more waste of time than your hobby is waste of time; by using the child's love of play we teach him, his lessons become his hobby, that is, he does something because he *likes* it, not because he *must* do it. Work becomes pleasant and the pupil anxious to do more of it. How many of you refused to take your play time and your games period because you were so happy doing geography? That has actually happened in Std. 2 here. They continued their geography after the teacher had finished, and begged to be allowed to go on, to take it home, to do it in playtime Can any one of you remember begging for homework as a pleasure? The Geography models make children realise the life of other people, and all through the geography scheme we work on the human interests; what people wear, eat, grow, how they live, and why they differ from us. In History, drawing, modelling and acting incidents of old times bring before our little ones the lives of the ancient folk in a way that no learning of dates can ever do.

causes, he is behind in the class work and never reaches the level set for boys of his age. I speak strongly on this point, having in my childhood suffered from being in too high a class for mathematics, and never did I get my work done correctly as long as I was at that school, but when I went to a fresh school, I was two classes lower for maths, and one class higher for some other subject, and at last was able to work intelligently at maths, and catch up what I had not learnt properly before. This moving of a pupil from class to class according to his abilities is not a very new idea, but it is strange to India, I believe. Your child may be at Std. 3 level in Urdu, in Arithmetic he may be at Std. 2 level and in English only at Transition level. By thus putting him with other children of similar capacity to his own, he lays the foundations of sure knowledge, and is not discouraged by finding the work too hard, nor made lazy by being given tasks below his capacity. A very clever boy may be working with boys much older than himself, you need not fear your little one is being kept back if he is in a low class for some subject, or think that he will not learn enough if he is not with boys of his own age. The teachers here are unsparing in their task of testing and grading and I take each class myself every day, so we soon know what a child's capabilities are, and grade him accordingly.

3. *Our methods*—In the Kindergarten we follow the Montessori methods of teaching through the senses, sense-training as it is called, and of learning by doing. We have the fullest equipment of Montessori apparatus, and we add to it with our own inventions as need arises. The Kindergarten teacher has been in Dotoressa Montessori's own school in Rome, and has been trained under this greatest of modern educationists. There is another English-trained K. G. teacher, a Physical College trained matriculate and a teacher trained by me after Intermediate, with Budget Provision for two more trained teachers as the numbers in

Is it not worth while to pay a little thought to the perennially fresh subject of human mind in all its activities?

Experiments in Child Education in Hyderabad, Deccan

THE MODEL PRIMARY SCHOOL

The Model Primary School celebrated its first Open Day on the 31st July, 1933 under the distinguished presidency of His Excellency the Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, G. C. I. E., President of the State Executive Council. The work done by the pupils had been displayed in the various class rooms for the inspection of parents and other guests. This school was opened in July, 1932, to serve as a model to other Primary Schools in the State. Attached to the school is an up-to-date Kindergarten Section under the charge of an Indian lady who has been trained in Montessori work in Rome under Madame Montessori herself. We have much pleasure in publishing the text of the report which Miss Tyler, the Head-Mistress, read on the occasion of the Open Day celebrations, and we are sure that this account of the principles on which the school is run and the experiments which are being carried on in it will be read with interest.— Ed.

This school is an experimental one, an attempt to run an Indian school on the same lines as the most modern and up-to-date English and American ones, with due allowances made for climate and different conditions. This is a very difficult task if our method and aims are not understood, so I am going to point out a few salient features and explain them.

1. *Co-education*—Boys and girls work and play together as in a family; there are a few modifications, for the boys have "Cubs" and the girls do needlework, the boys play football, the girls, singing games and badminton, but both play netball, cricket and field-sports. The girls leave at the age of 8 years, but the boys can stay till 10 or 11, for this is a proper Primary School, not only a Kindergarten.

2. *Individual work*—This means that a child works at a rate suited to himself, not at a rate set by rule; in this way we abolish that tragic figure, the fool of the class In most cases the fool would be as clever as the rest of the class, if he once caught up with their work, but from bad teaching prior to entering school, or from many other

at the same time, in Psychology it is personal, and the instrument of observation is the mind itself.

Physical symptoms generally accompany mental phenomena. The face is the mirror of the human mind. The outward signs give us the clue to the feelings inside. Let us take a man who is angry. He becomes restless, his voice becomes louder. His eyes become red, and his blood becomes more heated These are truly some of the symptoms. Every teacher who has to deal with the young should be a born mind-reader, or at least trained to be a mind-reader. Public speakers to be sucessful should be able to sense the atmosphere. The atmosphere is nothing but the mental background of the audience to whom he has to appeal through his voice. Lawyers also should be pre-eminently men with keen vision to be able to win their cases. Watch an advocate addressing the forum, how he sets forth his case, how he modulates his voice with appropriate gestures and how, as in a fencing competition, he has to look to all sides but with the central idea of how he can put forth effectively his case to win over the judge to his cause. After all, human acts at home or outside are only mental adaptations and adjustments. A fair inference can therefore be drawn that a knowledge of psychology will be of great utility even to the busy man in every walk of life.

The most practical race of the world, the Americans, have paid special attention to mental science, and there are highly specialised departments such as applied psychology, social psychology, psychiatry, and child psychology etc. There are also instruments which graphically record the mental feelings. Many of the new Thought Societies, Christian Science groups and Mental Schools of Culture are only attempts to train and cultivate the mind.

Real culture depends upon a polished and disciplined mind. Psychology gives a systematic study of the mind in all its various aspects.

down such undesirable feelings is not to allow scope for them to develop but to nurture the contrary feelings of emulation, love and social service. That is why the prophets say "Resist not evil". There is no use simply saying "Thou shalt not covet". One should be told how not to do it. Looked at closely, it will be seen that the various systems of religon are at bottom modes of disciplining the mind.

Let us take, for example, fear, trepidation, anxiety and panic, common to all created beings. Fear is an apprehension of danger. It is an instinct of self-preservation and self-defence from a possible enemy. But it becomes positively detrimental when it so affects the organism as to repress the activities of mind and body.

In ordinary talk also, we use psychological terms though we do not notice their full import. For example, the country is in a panic, the man is in his pensive mood, the crowd is sullèn, the men are hilarious. All these are psychological observations of others. In the same way, people say of themselves: "I feel uneasy"; "I am restless"; "I am in no mood to submit." These are self-observations.

The parent, the teacher and the public man in any walk of life should consciously or unconsciously be in one way or another readers of other people's minds as well as of their own. To read the faces of others, to gauge their thoughts and to know our own minds is an inborn capacity. But education gives a helping hand. That is why the great Rishis say "Know yourself" "Look within yourself." This means "Know the working of your mind." The psychologist or, for that matter, every man who has to deal with the public, should have a clear brain able intelligently to discriminate the mental phenomena. Above all, he must be alert and quick enough to note the fleeting thoughts and emotions which are in the very nature of things elusive. While in physical sciences the phenomena can be observed by many

observation is the outside world of phenomena, including the body itself, as in physiology and anatomy, in psychology both the subject and the object of observation is the mind itself. That is, the mind turns back the mirror upon itself. It is the beginning of the what are called the occult subjects and it is on the borderland of the physical and occult system of thought. That is the unique feature.

As a general subject of study, Psychology is interesting and very instructive. It is a popular idea that psychology is a subject of concern for the educationist, for the mental doctor and for those engaged in the study of Philosophy. But on closer scrutiny it will be seen that even the ordinary busy man of the world can find it worth the trouble to solve many of the current educational, social and other human problems in which everyone is interested and for which a knowledge of psychology would be of much help.

Everyone feels within himself at one time or another feelings of anger, love, pity, hatred, jealousy, fear, panic, anticipation, and modes of thought such as thinking out problems, and willing, such as making resolutions etc. They are facts which can be observed, measured and inferred. They obey certain fixed laws. There is no chance or haphazardness about them. Lunacy itself follows certain laws and runs in fixed grooves.

With a certain amount of effort and practice it is possible for every educated and sensible man to observe the mental phenomena both of himself and others, study them and draw his own inferences. Let us take, for example, the feeling of greed which is one of the weaknesses of mankind. Greed is the inordinate desire to have a great deal of something. Greed should be differentiated from emulation, a healthy feeling. When a man is obsessed by greed, there is a sensation of restlessness and an overpowering urge to become unusually active, thus upsetting mental poise—the foundation of mental happiness. The only way to put

continue their studies in the Gymnasium but wish to take up a career after passing the Middle School Examination also join the *Real Skolen.* Pupils usually come into this class at the age of 15 and leave it at the age of 16.

Practically the same subjects are taught in the Real Class as in the Middle Class, only the course is a little heavier. The *Real Examen* is held on the same lines as the Middle School Examination, with this difference that a written paper is always given in the modern language which is either German, French or English, according to the option of the pupils. The examination is controlled by Government, and success in it entitles a student to apply for civil service appointments and to enter the army and the navy as well as certain kinds of commercial and technical schools, such as schools for chemists and dentists, agricultural and horticultural schools. Most of those who pass this examination go into private business as clerks and shop assistants. In most of the Municipal Schools no fee is charged but the tution fee in Private Real Schools is 144 Kroners per year.

(To be continued.)

Psychology: Its Place In Daily Life

BY

K. SUNDARAM AIYAR, B. A., LL. B.

Psychology is the science of mind. It is mind that marks out man as the apex of creation in the world. It is therefore worth while to know what mind is and how it works. Logic is the science dealing with the different modes of thought, showing how we infer one thing from another. Physiology is the science which treats of the functions of the several organs of the body. But psychology treats of the mind as the total human consciousness with its varying phases and modes of activity, such as thought, feeling and will. While in other sciences the object of

scientific courses. Every pupil is provided with a separate demonstration table fitted with gas pipe and locker. Besides the theoretical teaching, every pupil has to attend practical work and perform experiments with the help of a demonstrator.

There is a separate room for geography where different classes are taken by turns during the geography period. This room is amply provided with all the apparatus necessary for the study of physical, political and commercial geography. Whenever necessary, lessons are illustrated by magic lantern slides.

In the school there are clinic rooms where pupils suffering from bad teeth and nose and ear diseases are daily examined and attended to. To carry on this work the services of a doctor and a few trained nurses have been enlisted. In order to cultivate among the pupils the habit of washing and bathing, the school is provided with several baths and washing rooms. Arrangements have been made to give an opportunity to every pupil to bathe in the school at least once in a fortnight in winter time. In summer time the pupils take sea baths two or three times a week.

Cooking is also taught in the school to the girls of the higher classes, and for this adequate arrangements have been made in the school.

REAL SKOLEN (REAL SCHOOLS.)

These schools come after the Middle Schools. There are no separate schools of this kind, but generally an extra class called "Real Klasse" (Real Class) is attached to the Middle Schools and all such Middle Schools to which this class is attached are named Real Schools. There are 122 Municipal Real Schools and 117 Private Real Schools. Those pupils who just manage to get through the Middle School Examination and wish to continue their education but are not considered brilliant enough to join the Gymnasium are placed in this class. Pupils who do not desire to

and give me all the details about its working. The total strength of the school is 1484, of which number 680 boys and 684 girls are in the elementary section, and 120 pupils are in the middle section. There are altogether 45 classes in the school, of which 40 classes are in the elementary section and 5 in the middle section. Boys and girls are taught in separate classes. In most of the Danish schools co-education exists but the classes are not mixed, there being separate classes for girls. On the day I visited the school, the attendance was very good, very few pupils being absent. Danish children are very regular in their attendance and nothing but illness keeps them away from school. The school works daily from 8 a. m. till 4 p. m. with an interval of about 30 minutes for lunch at 10 a. m. and of 20 minutes at 1 p m. The staff of the school consists of a headmaster and 42 teachers, of whom 16 are men teachers and 26 women teachers.

The course of study includes all those subjects that are prescribed by the Department for the Middle Schools. The School is housed in a newly erected grand and commodious three-storeyed building which is some distance from the business quarters. The class rooms are large, well lighted and well ventilated, and are not crowded, the maximum number of seats being 36 per class. All the classes have been furnished with the necessary furniture which consists of single desks for pupils, a high table and chair for the teachers, and black-boards. In most of the schools which I visited I noticed that the old-fashioned dual desks are still used and the single desks, wherever they are found, are adjustable so as to be regulated according to the height of each pupil. However, care is taken to provide the lower classes with small desks. Infant Classes have small separate tables and chairs.

The school possesses a very well-fitted science laboratory, much superior to any of our best high school laboratories. It contains material enough to suit even our college

Physics.—Elements of physics are taught and the work is not only theoretical but consists of a good deal of practical work, all the schools being equipped with excellent physical laboratories. The course done in these schools is quite advanced.

Gymnastics.—Gymnastics is compulsory for all pupils. Every school is provided with an indoor gymnasium possessing all the apparatus necessary for the Ling System of gymnastics.

Manual Work.—In most of the schools carpentry is taught to the boys and for this purpose the schools are fitted with workshops. Sewing is taught in all the schools to the girls. In some schools where it has been possible to make arrangements for cookery, the girls are taught cooking.

Examinations.—At the end of the 4th year, an examination is held which is both written and oral. The written examination is conducted in Danish Composition and Mathematics by the examiners nominated by the Inspector-General of Schools. The pupils are also examined orally in one or two subjects. The teachers of the school examine in the rest of the subjects. Those pupils who secure the minimum marks required for passing are considered qualified for the *Real* Class, and those who obtain higher marks are permitted to join a Gymnasium. This examination does not qualify one for any career but is held in order to sift the pupils, dividing them into three groups: those who go into the Gymnasium, those who go into the *Real* Class, and those whose education stops here. All those pupils who fall under the last category, generally become shop assistants or craftsmen.

Fees.—A tuition fee of about 120 Kroners a year is charged in the Middle Schools. Though small, this fee still keeps many from attending Middle Schools. The enrolment in the Middle Schools is only about 10 per cent. of that in the Primary Schools.

Description of a Middle School.—I visited a Middle School at Copenhagen called "Skolen I Alsgade", which is a mixed commune school. Mr. C. A. Jurgensen, the Headmaster, was kind enough to show me round the school

Special care is taken to admit into a Middle School the brightest pupils only. When the pupils finish the 5th Class course, an examination is held and only those are allowed to proceed to Middle Schools who pass the examination with credit and are found capable of continuing their education in a Gymnasium. Others are advised to go into life as farmers and workers. In urban areas, there are also Middle Schools attached to the High Schools with a Real class in between, just as in India we have the middle section in a High School. There are Private Middle Schools also which are opened and maintained on the same conditions as Elementary Schools, They receive grants from the Ministry of Education on certain conditions which chiefly concern teachers' salaries and school buildings. The expenses of the Municipal Middle Schools are shared by the Local Boards and the State.

Courses of Study.—The courses of study comprise the following subjects :—

1. Danish. 2. Any one of the following languages : (*a*) English. (*b*) German. (*c*) Latin. 3. History. 4. Geography. 5. Natural History. 6. Physics. 7. Arithmetic. 8. Mathematics. 9. Religion. 10. Drawing. 11. Music. 12. Gymnastics. 13. Manual work for boys and sewing for girls.

Danish.—With the Danish language a little Swedish is also taught, as Sweden is a neighbouring country and there is a good deal of commercial intercourse with it.

English and German.—These are taught on account of the commercial relation with England and Germany. Since the War, English has become very popular and most of the pupils take it as their second language.

Latin.—Latin is studied for one year in the last grade by those pupils only who wish to take up a linguistic course in a gymnasium after finishing their Middle School course.

Natural History.—It consists chiefly of Zoology and Botany and is taught in the best way possible. All the middle schools are provided with well-fitted natural history museums.

SECONDARY EDUCATION

MIDDLE SCHOOLS

After leaving the Elementary Schools, the pupils follow one of the following two courses :—

1. The boys of well-to-do families and official class mostly prepare for the Middle School Examination. The number of such pupils is very limited.

2. Sons of farmers and labourers take up work on the field and in factories.

It must not be supposed that after finishing the Elementary School course these young men are left without an opportunity for further instruction. What happens is that some of these boys, while engaged in work, attend evening classes and later join the continuation schools, such as Folk High Schools, Agricultural Schools, Workers' High Schools, etc., at the age of 18.

Danish thinkers believe that the period of transition from youth to manhood is the time for physical development rather than for intellectual attainments, and that therefore it should be spent on practical work and play. In the rural areas the children, after leaving the Elementary School, are set free to learn practical agriculture on their fields and to perform household duties at home. In some cases they are apprenticed to learn practical agriculture at model farms, where they are paid for the work. Every community has its local gymnastics organisation and usually its own assembly hall of gymnasium, and here the youths and their fathers assemble frequently and take their physical exercises under able leaders. In this way, 4 or 5 years pass and the youths return to the Folk High School when they are about 18 or 19.

Middle Schools, also called 'Junior High Schools,' are found in every organised town. As described already, a Middle School contains 4 classes, and children join at the age of 11 and leave usually at 15.

gymnasia are attached to most of the village schools. They are simple and neat, having good floors and being equipped with all the inexpensive apparatus required in the Ling System of gymnastics Practically every school has teachers' quarters where the teachers reside free of any charge

Private Schools.

In some communities there are private schools of the same type as the Municipal Elementary Schools. There are about 500 private schools in Denmark. In these schools tuition is not free as in the municipal schools, but a small fee is charged. It is necessary to have the permission of the local authorities to open a private school, which is granted under certain conditions. If any school is found to be objectionable in any way, or fails to fulfil the conditions laid down, then the authorities have powers to close it down. In all the private shools the same curriculum is followed as in the State Schools, and, unless this condition is observed, no grant is given by the State. Every private school that comes to the average level of a municipal school of the district gets a State Grant. Examinations are conducted with the permission of the local school board. On duly informing the local board, the schools are allowed to hold examinations in the school premises provided they have at least 10 pupils on the rolls and provided the school master is considered competent.

There are also certain special religious private schools or schools conducted on particular educational principles, such as Montessori Schools, etc. These rural schools are chiefly run by private subscriptions with a grant-in-aid from the State. Since the Great War, in most European countries different types of new experimental schools have been started by educational faddists and enthusiasts. They have not acquired popularity yet, and people of conservative ideas about education view them with suspicion.

Examinations.—In all the State Elementary Schools examinations are conducted twice a year by the school authorities themselves. The State has nothing to do with the conduct of examinations. No certificates are given to the pupils when they pass the Elementary Examination.

It must be noted here that the rural Elementary Schools attempt to relate the entire courses of study to the soil in such a way that they succeed in creating the love of the soil among the pupils. In Denmark the preparation for farm life begins in the Elementary School and is thereafter continued both in the class-room and in practical work outside until all has been acquired that is necessary for success in agriculture.

General Features of Danish Elementary Schools.—The schools are generally located in beautiful or picturesque spots near about the villages and, wherever possible, are surrounded by gardens and parks. The buildings are well built, well lighted and well ventilated and heated. All the schools possess excellent playgrounds. There is always an abundance of illustrative material of all kinds such as geographical and historical maps and biological and physiological charts. A good collection of physical apparatus is used as the basis of simple experiments in Natural Science. A small chemical cabinet is found in most of the schools containing articles necessary for milk testing, working with the soil, and the like. Good zoological and ethnological collections are also seen neatly arranged in cases. Circulating Libraries form a feature of most of the schools, the books being available both for the children and their parents. School rooms are invariably decorated with house plants and nature-study materials. The pupils at an early age are shown in schools how to decorate rooms with plants and flowers and they acquire such a taste for this in schools that they carry it with them in their after life. The writer noticed that the houses of even small farmers were tastefully decorated with plants and flowers. Indoor

Drawing :—Drawing, which begins in Class III and is continued up to Class VII, is popular and well taught, accuracy and neatness being the watchwords. The neatness and care which the children display in their work, are marvellous.

Arithmetic :—Mental arithmetic receives more attention in Danish schools than in the schools of most other countries. The quickness and accuracy with which the younger children solve problems of mental arithmetic are remarkable. The text-books contain the essentials only and the teachers supply the rest. The thoroughness with which the elementary rules are taught is striking. Farm accounting and farm problems comprise a large part of the subject-matter of the books.

Geometry :—Enough of plane geometry is included in the highest classes to furnish an intelligent foundation for problems in mensuration.

Foreign Languages :—A foreign language is studied as a second language and is always taught by the direct method. Much emphasis is laid upon pronunciation and articulation. I watched a lesson in English in a High School at Copenhagen in the 7th Class and was astonished to notice the correct pronunciation of the pupils and the ease with which they read and spoke English.

Gymnastics and Swimming.—Gymnastics is compulsory in all the schools for boys. The older girls generally do gymnastics as special work after regular hours. In the first 3 or 4 classes the boys and girls do the work in mixed classes; later on, they are drilled separately. The newer schools are fitted with indoor gymnasia; and where these are lacking, suitable grounds are prepared outdoors, sanded and supplied with suitable apparatus. The work in gymnastics is uniformly good. Swimming is taught to pupils in most of the urban Elementary Schools. A detailed account of swimming will be given in the Chapter on Physical Education.

well provided with charts, globes and other geographical apparatus. Lantern slides are often used to illustrate the lessons.

Nature Study:—Children in the primary classes are early made acquainted with nature. Lessons are illustrated by means of charts, coloured pictures and magic lantern slides. Natural history is taught as a part of nature-study from Class III onward. In the upper grades a reasonably thorough course is done, including descriptive courses in Zoology, Botany and Physiology. Most of the urban Elementary Schools have natural history museums which contain stuffed birds and animals, plants and flowers for the teaching of Zoology and Botany. Danish teachers believe that nature-study means love of nature, natural history means acquaintance with nature, while application to agriculture demands both love and knowledge of nature. They are of opinion that love of nature and knowledge of nature can be acquired in the Elementary Schools and that practical agriculture can be studied in continuation schools later on.

Hand Work (Sloyd):—This is done from Class V to Class VII. Few rural schools offer a course in hand-work but it is popular in larger schools. Some of the night schools do excellent work in sloyd.

Handwork For Girls (Sewing, needle work and embroidery):—These are taught in all Elementary Schools for Girls where women teachers are employed from Class I-VII. In some one-teacher schools, with men teachers in charge, the wife of the teacher gives instruction and gets a small pay. Wherever possible, cookery is also taught to Classes VI & VII.

Music:—Singing is taught from Class II to Class VII in all the Elementary Schools. Patriotic, religious and folk songs and nature songs are sung remarkably well. Children keep time with their arms while they sing.

Danish schools depend more upon the ability of teachers than upon textbooks. Teachers who are professionally trained do not rely on text-books for classroom work but know how to draw material from their general knowledge and experience for much of the classroom work. Danish text-books "are too meagre and serve only as leading threads, the teacher supplies the rest".

Methods of Teaching.

Reading and Writing:—These are not taught mechanically but are treated as arts complete and separate. The Danish language is taught largely through reading, composition and dictation exercises. The teacher gives dictation from some simple readers or classics and it is corrected in the class-room, the mistakes being explained to the pupils. Grammar forms part of the reading lesson and is rarely taught as a separate subject. The work is largely of an inductive nature.

Religion:—Bible History is told orally in the lower grades and is studied from text-books in the upper grades. The matter is dealt with in such a way as to furnish a sound foundation in general history.

History:—History begins in Class II and is continued up to class VII. It holds an important place in the course of study. All school work, in fact, is given historic background. Although Danish History receives special attention, still the course is not limited to Denmark and Scandanavia alone but deals in general with the History of Europe and the Orient.

Geography:—In teaching geography much time is devoted to the study of the Scandanavian countries, though the course covers the physical, mathematical and political history of the entire globe in a thorough manner. Most of the schools possess separate geography-rooms, which are

hagen weekly hours for Classes I & II are 24, for Classes III, IV & V 30 and for Classes VI & VII 33. Usually the older children spend more time in school during winter than the smaller children. In summer this arrangement is reversed. Some schools arrange their time-table wholly on half-day session plan, others give a certain number of whole day sessions for each class. Others again have both half and whole day sessions for the different classes

Same idea of the arrangement can be had from the following account given by Mr. Foght :—

"*Elementary School, Odense*:—This is a 3 teacher-school, and has 8 classes. These classes are grouped into 6. Classes 1, 2, 3, and 4 are four separate groups; Classes 5 and 6 form Group V and Classes 7 & 8 Group VI. The school year is of 246 days. The school day begins at 8-30 a. m. during Winter and 8 a. m. during Summer and closes at 3 p. m. Groups VI, V & II spend their forenoons in the school and Groups IV, III and I are in the school during afternoons only. This arrangement gives each class four hours' school work daily 6 days in a week. There are three teachers in the School. During the forenoons as there are 5 classes in the school, it gives 2 teachers to 2 classes each, and the 3rd teacher only one class. These teachers do not keep the same room all the time but change from room to room with the change in hours. In the afternoons as there are only 3 classes, each teacher gets one class."

The Courses of Study :—Under the law certain fundamental subjects have to be taught in every school. These are religion, reading and writing, arithmetic, geography, history, drawing, music, hand-work and gymnastics. Optional subjects are nature study, hygiene and sanitation, sloyd, household economics and a language other than Danish. Natural science with special reference to agriculture has been receiving more and more emphasis. German and English are mostly taken as second languages on account of the close commercial relations with Germany and England. Most of those who have received secondary education know German and English and speak them well. Since the War, English has become very popular, and it is now studied by the majority of the pupils as a second language in schools.

of the Parish to which the family intends to move, so that the children may be registered without any loss of time. Children's names are kept on the records of the school from which they have moved until formal information is received of their admission into another school. This method of tracing has had excellent results.

It is the duty of the teachers to investigate all cases of absence from school and decide whether they were 'without legal reasons' Every month all such cases are reported to the Parish Council who may make further investigation. Fines are imposed on parents or guardians unless they are able to show that the children in question are "habitual truants", in which case the children themselves are taken in hand by the Council.

The fines are imposed at the following rates:—

1.	12 Ores *	for each day's absence during	1st	month	of offence.
2.	25 ,,	,,	,,	2nd	,,	,,
3.	50 ,,	,,	,,	3rd	,,	,,
4.	1 Kroner	,,	,,	4th	,,	,,

Whenever necessary the Parish Council takes legal steps to collect the fines, and the important fact is that the fines are collected.

Length Of The School Year, Hours Per Week, &c— According to the Ordinance of 1904, "instruction shall be given in town and country schools during at least 41 weeks". As the Danish school-week covers 6 days, this gives a minimum school year of 246 days.

The law states that in larger towns the average minimum amount of instruction for each class shall be 21 hours and in rural districts 18 hours a week. This does not include gymnastics, sloyd, hand-work, drawing or household economics, which would increase the number of hours very much. In most of the Elementary Schools of Copen-

* 100 Ores=1 Kroner which is roughly equal to B. G. Rs. 1—2—0.

The Danish Educational System

BY

SYED MOHAMED HUSAIN JAFERI, B. A. (Oxon),

Deputy-Director of Public Instruction, Hyderabad, Deccan.

II

ELEMENTARY SCHOOLS

Education is compulsory for all children between 7 and 14 years of age. Municipal Elementary Schools called 'Folke Skolen' are found in every town and village. They are attended by 90 per cent. of the children to whom compulsion applies. In some communities there are private schools of the same type as public schools. Urban schools are always complete primary schools with 7 classes; they possess fine buildings and are better equipped in every way than the rural schools. A few schools at Copenhagen have Class VIII also for those pupils whose parents wish them to continue their education even after the compulsory age. Rural schools usually have fewer classes. There are altogether about 3838 rural Elementary Schools in the country —quite a large number for a country with an area of 16000 sq. miles and a population of 3½ millions. The number of classes differs in these schools; some are complete Elementary Schools, while in others the number of classes varies from six to one. One-class schools are found in small villages where the number of children is very small.

Compulsory Attendance Law.—As a rule, the Danish people fully realise the importance of sending their children to school. The few who attempt to avoid the compulsory attendance law are dealt with severely. The head teacher of every rural school has to keep a complete record of all children of school age within the district. Whenever parents or guardians wish to move away from the parish, they have to give a week's notice to the Parish Council informing it that they are going to withdraw their children from school. A similar notice is given to the authorities

THE HYDERABAD TEACHER

CONTENTS

PAGES

THE DANISH EDUCATIONAL SYSTEM II by Mr. Syed Mohamed Hussain Jaferi, B. A. (Oxon), Deputy Director of Public Instruction, Hyderabad, Dn. 1

PSYCHOLOGY: ITS PLACE IN DAILY LIFE by Mr. K. Sundaram Aiyer, B. A., LL. B. ... 14

EXPERIMENTS IN CHILD EDUCATION in HYDERABAD Dn. THE MODEL PRIMARY SCHOOL 18

THE AIMS AND IDEALS OF MODERN EDUCATION by Mr. K. M. Yusufuddin, M. A. (Leeds) ... 24

ON EXAMINATIONS: A REPORT by Mr. Anjilvel V. Mathew 27

A NUCLEUS OF EDUCATION IN KASHMIR by Dr. M. A. Hai. L. M. & S., D. P. E. ... 39

EDITORIAL 46

REVIEWS 47

ADDITIONS TO THE TEACHERS' LIBRARY ... 49

VOL VIII. REGISTERED ASAFIA No. 47. No. 1.

THE

HYDERABAD TEACHER

JULY—SEPTEMBER, 1933

Quarterly Magazine of the Teachers' Association,
Hydreabad-Deccan

Under the Patronage of
Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M. A.,
Director of Public Instruction.

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD
1933

Annual Subscription Rs. 3.

Vol. VIII No. 1.

THE

HYDERABAD TEACHER

JULY–SEPTEMBER, 1933

Editorial Staff

S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab.), *Chief Editor.*
F. C. PHILIP, M. A.
M. ATAUR RAHMAN, B. A.

SECUNDERABAD–DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD
1933

جلد (۸) شمارہ (۲)

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مقاصد

(۱) طبقہ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔

(۲) طبقہ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔

(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔

(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد

(ا) رسالہ کا نام "حیدرآباد ٹیچر" ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شایع ہوگا۔

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ) صرف اردو حصہ (عہ) سالانہ قیمت فی پرچہ اردو و انگریزی (۱۲ر) صرف اردو (۸ر)۔

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہوسکے گا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔

(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔

(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عــہ	صمہ	ے
نصف صفحہ	صمہ	عاہ ۱۲ر	عہ ۸ر
ربع صفحہ	عاہ ۸ر	عہ ۶ر	۱۵ر
فی سطر	۱۰ر	۸ر	۶ر

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

حیدرآباد ٹیچر

کانفرنس نمبر

بابتہ ماہ آذر ۱۳۴۳ف ماہ اکتوبر ۱۹۳۳ء

جلد (۸) **فہرست مضامین** شمارہ (۲)

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	خطبۂ استقبالیہ	مولوی شیخ ابوالحسن صاحب	۲
۲	رپورٹ انجمن اساتذہ	مولوی مرزا ضیاء الدین بیگ صاحب	۹
۳	خطبۂ صدارت	نواب ذوالقدر جنگ بہادر	۱۳
۴	تقریر	مولوی حسام الدین صاحب	۲۶
۵	رپورٹ کمیٹی نمایش	مولوی نظیر حسین شریف صاحب	۳۶
۶	رپورٹ مقابلۂ باغبانی	ڈاکٹر آمنہ پوپ و مسز آلن	۳۹
۷	روداد کانفرنس	مولوی مرزا ضیاء الدین بیگ صاحب	۴۰
۸	ایڈیٹوریل		۴۸

خطبۂ استقبالیہ

از

مولوی شیخ ابو الحسن صاحب۔ بی۔اے۔ ایل۔ ٹی

جناب صدر خواتین کرام و حاضرین ذوی الاحترام۔ انجمن اساتذہ بلدہ حیدرآباد دکن نے مجھے مجلس استقبالیہ کانفرنس ہذا کا صدر منتخب کرکے اس کی طرف سے آپ حضرات کا خیر مقدم کرنے کے لئے مقرر فرما کر میری نمایاں عزت فرمائی ہے۔ نظر براں سب سے پہلے خود اراکین انجمن اساتذہ بلدہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میرا خوش گوار فرض ہے کہ انجمن اساتذہ کی طرف سے ہمارے صدر منتخب عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم۔ آے (کینٹب) بیرسٹرایٹ لا معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ جیسے علم دوست و علم پرور و ہمدرد تعلیم ذات ستودہ صفات و نیز ہمارے سررشتہ کے افسر اعلیٰ و روح رواں جناب مولوی خان فضل محمد خان صاحب ناظم تعلیمات اور دیگر معزز مہمانوں اور محترم اساتذہ کی خدمت میں انجمن ہذا کی اس ساتویں سالانہ کانفرنس کی تقریب میں ہدیہ خوش آمدید پیش کرتے ہوئے تہ دل سے آپ تمام اصحاب کا پرجوش خیر مقدم کروں۔ گذشتہ کانفرنس کے مواقع پر عالیجناب نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر و نواب مہدی یار جنگ بہادر و جناب خان فضل محمد خاں صاحب نواب اکبر یار جنگ بہادر نواب مرزا یار جنگ بہادر نواب نظامت جنگ بہادر جیسے ممتاز ہمدردان علم و قوم ہستیوں نے جو حیدرآباد کے اعلیٰ طبقوں میں قابل فخر و مباہات ہیں کانفرنس ہذا کی کرسی صدارت کو زینت بخشی ہے۔ اس دستور و روایت کو قائم و برقرار رکھتے ہوئے قانون و سیاست کے زبردست ماہر علم و تعلیم کے پرجوش سرپرست جو نہ صرف ہمارے اس تعلیمی کانفرنس کے صدر منتخب ہیں بلکہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے تعلیمات جیسے اہم سررشتہ کے سفینہ کی اس متلاطم اور موج افزا طوفانی زمانہ میں ناخدائی فرما رہے ہیں۔ اس وقت یہاں بہ حیثیت صدر منتخب رونق افروز ہیں ایسا شخص جو متعدد اعلیٰ صفات سے متصف ہو وہی ایسے تعلیمی جلسے کی صدارت اور اس کی رہنمائی کا مستحق ہو سکتا ہے۔

صاحب موصوف ایسے منتخب افراد میں سے ہیں جن کو قدرت نے ایک فکر مند دماغ اور ہمدرد دل عطا فرمایا ہے تعلیمی مسائل میں صاحب موصوف کی وسیع النظری اور صحت استدلال اس بات سے ظاہر ہے کہ نواب صاحب موصوف

نے آج سے (۶) چھ سال قبل حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبہ صدارت میں اپنے ماہر فن تعلیم نہ ہونے اور علمی تہی دستی کا اعتراف فرماتے ہوئے تعلیمی مسائل پر جن زرین خیالات کا اظہار فرمایا تھا اس کی توقع مسلمہ ماہرین فن سے بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ نواب صاحب موصوف ایک علمی اور ہمدردی مجسم انسان ہیں آپ نے برسوں قبل تعلیمی مسائل کی نسبت جن بیش قیمت خیالات کا اظہار فرمایا تھا وہ آج بھی ویسے ہی مسلمہ اصول سمجھے جاتے ہیں جیسے کہ پہلے تھے۔

معزز حاضرین۔ آج بھی ہم نے نواب صاحب موصوف کو تعلیمی مسائل میں رہنمائی اور طبقہ اساتذہ کے فلاح و رہبری کے لئے ان ہی قیمتی خیالات کے اعادہ کی زحمت دی ہے اور میرا ذاتی خیال ہے کہ آج ہم ان تعلیمی مسائل کی حلاوت سے جن میں بہت ہی اہم روز افزوں ترقی و تغیر پذیر شش سالہ تجربات کی چاشنی بھی شامل ہوگی شیریں زبان اور بہرہ ور ہوں گے اور مجھے کامل یقین ہے کہ جملہ اساتذہ کے لئے یہ خیالات اور واقعات ان کی زندگی میں تعلیمی مشکلات کی تاریکی کو دور کرنے میں مشعل ہدایت کا کام دیں گے۔

نواب صاحب موصوف نے مسئلہ تعلیم کے متعلق اپنے خطبہ میں اس اصول پر سب سے زیادہ زور دیا تھا کہ ملک میں اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ ابتدائی تعلیم جلد سے جلد لازمی اور بلا لحاظ مذہب و ملت عام ہونی چاہئے

نواب صاحب موصوف نے تعلیم نسواں کی ترویج اور اس کے راستہ میں جو موانعات ہیں ان کے ارتفاع پر بھی زور دیا ہے۔

نواب صاحب موصوف نے تعلیمی ترقی کے لئے ملک کے ہر طبقے کے اکابرین کے اتحاد عمل پر بھی زور دیا تھا۔ زراعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم۔ مدارس شبینہ کے قیام اور تعلیم بالغان کے جیسے اہم مسائل بھی آپ نے نظر انداز نہیں فرمائے تھے۔ جن مندرجہ بالا مسائل کی جانب نواب صاحب موصوف نے چھ سال قبل اظہار خیال فرمایا تھا اور جس کی اہمیت پر زور دیا تھا یہ مسائل آج بھی ویسے ہی اہم اور لائق توجہ ہیں جیسے کہ پہلے تھے۔ جس سے ظاہر ہے کہ نواب صاحب موصوف کو تعلیم کے ہر شعبہ سے کس قدر دلچسپی اور ہمدردی ہے۔

گذشتہ کانفرنسوں میں بھی آپ انجمن کی تاریخ۔ مقصد اور کام کے متعلق سن چکے ہیں اور اب اس جلسہ میں سال گذشتہ کی کارگذاری اور انجمن ہذا کی مصروفیتوں کا اندازہ (معتمد صاحب عمومی) کی رپورٹ سے فرمائیں گے۔ لہٰذا میں صرف ان ضروری اور اہم مقامی مسائل پر اکتفا کروں گا جو کانفرنس ہذا اور تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔

اگرچہ کہ انجمن ہذا جس کے طفیل میں ہم سب اس وقت یہاں جمع ہوئے ہیں ابھی عہد طفولیت کے مراتب طے کر رہی ہے لیکن اس نے گذشتہ (۸) سال کے عرصہ میں نہایت مفید اور نتیجہ خیز کام نہایت خاموشی اور استقلال کے ساتھ انجام دئے ہیں جو لائق تحسین ہیں۔

اس انجمن کی بدولت بلدہ کے مختلف مدارس کے معلمین میں باہمی ارتباط اور برادرانہ تعلقات قائم ہو چکے ہیں اور اس سے تعلیمی ضروریات اور ان کی مختلف مشکلات پر غور اور ان کے حل کرنے میں اور مدرسین کو رسالہ حیدرآباد ٹیچر کے ذریعہ ان کی معلومات کی توسیع اور تعلیم دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔

اس انجمن نے بڑی حد تک حیدرآباد کے اساتذہ میں اپنے پیشہ کی ذمہ داریوں کا صحیح احساس پیدا کر دیا ہے اور اس کی ترقی اور استقامت کے لئے ہمیشہ کوشاں ہے مجھے یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں ہے جب کہ یہ انجمن ممالک محروسہ کے جملہ تعلیمی خیالات اور ضروریات کو عملی جامہ پہنا کر رہے گی۔

تعلیم کے ان اہم اور پیچیدہ مسائل کو جو ابھی تک الجھے ہوئے ہیں سلجھانا اس انجمن کا نصب العین ہے۔

یہ انجمن اپنے فریضہ کو کما حقہ ادا کرنے میں قاصر رہے گی اگر اس کی جانب سے ہمارے ہر دلعزیز اور بیدار مغز ناظم تعلیمات جناب خان فضل محمد خان صاحب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے کیونکہ نہ صرف انجمن ہذا بلکہ اس کے ارگن رسالہ حیدرآباد ٹیچر کو بھی صاحب موصوف کی سرپرستی اور رہنمائی کا شرف حاصل ہے صاحب موصوف نے از راہ علم پروری وحوصلہ افزائی حیدرآباد ٹیچر کے مزید (۲۰) کاپیاں مدارس کے لئے یکم آذر ۱۳۴۳ف سے جاری فرمانے کی منظوری صادر فرما کر انجمن ہذا کی جو امداد فرمائی ہے اس سے رسالہ مذکور کی اجرائی اور بقا میں مزید سہولت پیدا ہو گئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور بھی ہستی ہے جس کے لئے انجمن ہذا اپنی خوش نصیبی پر جس قدر فخر و ناز کرے کم ہے کیونکہ صاحب موصوف جیسی اخلاق مجسم اور جامع کمالات وقف تعلیم ہستی اس انجمن کی مستقل صدر ہے۔ اور وہی اس انجمن کے روح رواں ہیں یعنے ہماری انجمن کے مستقل صدر مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ

یہ ہماری غفلت شعاری اور احسان فراموشی ہوگی اگر ہم ان کی مسلسل اور مستقل مستعدی اور غیر محدود سرگرمی اور غیر معمولی محنت کا ذکر اور شکریہ نہ ادا کریں جس نے انجمن ہذا اور اس کے سہ ماہی ارگن رسالہ حیدرآباد ٹیچر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

انجمن ہذا آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرس ایسوسی ایشن سے بھی عرصہ ہوا ملحق و تسلیم ہو چکی ہے۔ اور ایسوسی ایشن مذکور انجمن ہذا کو اپنی ایک بہترین شاخ تصور کرتا ہے اور اس کے کام پر نازاں ہے۔ ہر سال انجمن ہذا کی طرف سے چند نمایندے فیڈریشن کے سالانہ اجلاس میں حصہ لینے کے لیے جو کرسمس کی تعطیلات میں ہر سال ہندوستان کے کسی نہ کسی بڑے شہر میں منعقد ہوا کرتا ہے جایا کرتے ہیں۔

اس موقع پر یہ عرض کرنا بے موقع نہوگا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اس کو اپنی سرگرمیوں کا دائرہ پورے ممالک محروسہ میں وسیع کرنا چاہئے۔ لہٰذا ہر کوئی امر اس کو ممالک محروسہ کی ایک مرکزی انجمن بنانے میں

ملم نہیں معلوم ہوتا ہے اکثر ضلاع اور مستقر صوبہ جات میں ایسی ہی تعلیمی انجمنیں قائم ہیں۔ اس کی سخت ضرورت ہے کہ سردست ہر مستقر صوبہ پر اس کی ایک ایک شاخ قائم کی جائے اور اگر کوئی انجمن قائم ہے تو اس کو اس میں ضم کیا جائے۔ جس کو تبدریج جملہ مستقر ہائے اضلاع پر وسعت دی جا سکتی ہے۔

اگر عالیجناب ناظم صاحب تعلیمات اور ارباب اقتدار اس جانب اپنی ادنی توجہ بھی مبذول فرمائیں تو یہ مشکل جلد آسان و حل ہو سکے گی۔

اب میں اپنے معزز و محترم مہمانوں کی طرف مخاطب ہوتا ہوں اور شرکت کانفرنس اساتذہ بلدہ کے لئے از راہ ہمدردی و تعلیمی دلچسپی آپ کی زحمت فرمائی اور تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس قدر عرض کرنے کی بھی جرأت کرتا ہوں کہ آپ صاحبان تعلیمی معاملات میں اگر مزید دلچسپی اور کسی قدر ایثار اور اتحاد عمل سے کام لیں اور ہمارے مشکل اور اہم کام کو آسان اور خوشگوار بنانے میں انجمن کی اعانت اور امداد فرمائیں تو ہماری کامیابی یقینی ہے جس سے ہمارے کام میں نہ صرف ترقی بلکہ اس میں مزید سرعت پیدا ہوگی۔ اس قسم کی دلچسپی کے اظہار کا بہترین محل و موقع یہ ہی ہو سکتا ہے کہ جیسا کہ ہمارے محترم منتخب صدر نے بہت عرصہ پہلے ارشاد فرمایا ہے کہ کارکنان تعلیمات اور اساتذہ کے ساتھ منجانب اکابرین پبلک اتحاد عمل فرمایا جائے اس طرح سے کہ آپ اپنے بچوں کے خانگی اوقات میں ان کی تعلیمی اور تفریحی مشاغل اور اخلاقی حالت کی نگہداشت اور دیکھ بھال اور ان میں ورزش جسمانی کا شوق اور مطالعہ کا صحیح ذوق پیدا کریں۔ اس طرح اساتذہ اور والدین کے باہمی ارتباط اور نگرانی اور اتحاد عمل سے ہم نونہالان ملک کی علمی جسمانی۔ اور اخلاقی تربیت اور اس کی صحیح نشو نما کر سکتے ہیں۔ آپ حضرات۔ مجھے معاف کریں گے اگر میں یہ کہوں کہ زمانہ موجودہ میں مجھے اکثر ایسے والدین سے سابقہ پڑا ہے جن کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ان کے بچے کس جماعت میں تعلیم پا رہے ہیں اور ان کا تعلیم دلانے سے آیندہ کے لئے کیا مقصد ہے اور بچے کا طبعی رجحان کس طرف ہے اور اس کو کس شعبۂ زندگی کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ والدین کو ان باتوں کا تکلیف دہ اور مایوس کن علم اس وقت ہوتا ہے جب کہ خدا نخواستہ ان کا غفلت شعار بچہ سالانہ امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے یا جب کبھی اس کا نام کسی وجہ سے مدرسہ سے خارج ہوتا ہے۔

اس کی شدید ضرورت ہے کہ ہم اپنا تھوڑا سا وقت اپنے معصوم اور ناواقف اور ناتجربہ کار بچوں کی تعلیمی حالت کی اصلاح اور ان کی آیندہ زندگی کی تیاری کے لئے صرف کریں جیسا کہ آج کل تمام دوسرے متمدن ممالک کا دستور اور عمل ہے اور آپ کی مصروف بہ جہد البقا نظریں اپنے بچوں کے تعلیمی حالات کی خرابی و ابتری یا خوبی کو بے نقاب اور ان کو صحیح رنگ میں دیکھ لیں اور رائل بہ

اصلاح و ترقی ہوں۔

اب میں اپنے ہم پیشہ اساتذہ یعنی تعلیمی برادری کے کارکنوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور آپ سب کو خوش آمدید کہتے ہوئے اس کانفرنس اور نمایش ہذا کی کامیابی کے لئے آپ کے اتحاد عمل اور شبانہ روز کی انتھک محنت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ آپ سب کی پرخلوص امداد و محنت و ایثار کا ہی نتیجہ ہے کہ سال بہ سال یہ کانفرنس روز افزوں ترقی کے ساتھ کامیابی کے مدارج طے کر رہی ہے۔

آپ حضرات کا طبقہ ایک ایسے پیشے سے تعلق رکھتا ہے جس کی بہت کم عزت کی جاتی ہے بلکہ حالیہ فضا میں بعض لوگوں کا سلوک بعض اوقات حقارت کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اس سے ہم کو پست ہمت یا رنجیدہ نہ ہونا چاہئے۔

باوجود اس سلوک کے سب اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ مدرسی کا پیشہ دنیا میں شریف ترین پیشہ ہے اس کی کامیابی کے لئے محنت اور ایثار دو لازمی جزو ہیں۔ آپ کے سپرد چند اہم ذمہ داریاں ہیں خصوصاً نونہالان قوم و ملک کے نگہداشت مدرسہ میں ان کی تعلیم و تربیت۔ اور بازیگاہوں میں ان کی موثر نگرانی اس خصوص میں آپ کے فرائض دنیا کے دیگر نت نئی ایجادوں اور ترقیوں کے ساتھ روز افزوں ترقی پر ہیں۔ آج کل تعلیمی دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا ہے۔ اور اگر ہم کو دنیا کے ہم قدم اور جدید تعلیمی ایجادات اور اختراعات کی واقفیت اور استعمال کے ساتھ ترقی کرنا ہے تو ہمارا فرض و کام اور بھی دقت طلب اور مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کانفرنس کا اہم فرض یہ بھی ہے کہ اپنے اراکین کو ایسی چیزوں سے واقف اور روشناس رکھے۔ اس غرض کے لئے سرکار نے ایک ماڈل پرائمری اسکول کا افتتاح کیا ہے تاکہ عملی طور پر جدید تعلیمی طریقوں سے آپ کو واقف کرایا جائے جس کے عملی و تحریری نمونے آپ کے سامنے پیش ہوں گے اور کانفرنس ہذا اس لئے سال بسال چند اہم تعلیمی مضامین کے طریقوں کو جدید انکشافات کی روشنی میں آپ کے سامنے پیش کرتی رہتی ہے جن کو کنڈر گارٹن ہسٹری طلبار کی تعلیم و تیاری ٹائم ٹیبل وغیرہ جیسے فن واری ضمنی جلسوں کی شکل میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ سال حال کے ایسے جلسوں میں تعلیم کنڈرگارٹن جیسا اہم بنیادی شعبہ بھی شامل ہے۔

آپ نہ صرف طلبار کی تعلیمی ترقی کے ذمہ دار و جواب دہ ہیں بلکہ ان کے اخلاق و تربیت کی نشو نما کا اہم فریضہ بھی آپ ہی کے ذمہ ہے۔ ہر مدرس کو اپنے عملی نمونہ سے طلبار کی رہنمائی کرنی پڑتی ہے جس میں بڑے غور و احتیاط کی ضرورت ہے تاکہ آپ کے کسی قول و فعل سے ان کے

دلوں پر کوئی برا نقش نہ بیٹھے اور نہ آپ کے کسی قابل اعتراض لب ولہجہ۔ چال ڈھال۔ حرکات وسکنات سے جن کی نقل اتارنا بچوں کا فطری خاصہ ہے۔ ان پر کوئی برا اثر پڑے۔ اساتذہ کو چاہئے کہ وہ اپنے کو ایک قسم کا غیر ذمہ دار مزدور نہ سمجھیں بلکہ یہ خیال کریں کہ وہ بنی نوع انسان کے حقیقی خادم اور ہمدرد ہیں۔ جیسا کہ میں نے اس سے پہلے کہا ہے کہ محنت وایثار ان کے دو نہایت اہم صفات ہیں ان کی کمی کی صورت میں ہمارے ملک کی تعلیم کا مستقبل کبھی امید افزا نہیں ہو سکتا ہے ایسی خامیوں کو دور کرنا اور مدرسین میں جوش عمل اور سرگرمی کی روح پھونکنا ہی ایسی انجمنوں اور کانفرنسوں کا خاص مقصد ہے۔

اب میں کانفرنس ہذا کے بعض دوسرے اغراض ومقاصد اور کارروائیوں پر مختصر تبصرہ کرکے اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

انجمن ہذا نے اپنی پہلی دو کانفرنسوں میں مسائل فن تعلیم کو نظر انداز کر دیا تھا اور ضروری تحریکات کی منظوری پر اکتفا کی تھی لیکن تیسری کانفرنس منعقدہ امرداد ۱۳۳۸ف سے ایسے مسائل کو بھی جن کا تعلق تعلیم کے فنی پہلو سے ہے بہ نظر افادہ واہمیت شریک پروگرام کیا گیا۔ اس امر کی تکمیل کے لئے یہ ضروری خیال کیا گیا کہ ایسی سب کمیٹیوں کا جن کا تعلق خالصتاً فن تعلیم کے مسائل سے ہو اور جن میں اس فن کے ماہر اساتذہ شریک ہوں تقرر کیا جائے۔ چنانچہ ہر سال ان کمیٹیوں نے اپنے متعدد اجلاس منعقد کئے اور اب سال بسال ان کی سعی وکوشش کے نتائج غور وخوض کے لئے مختصر رپورٹوں کی شکل میں آپ کے روبرو پیش ہو رہے ہیں۔ یہ صرف اس کانفرنس ہی کی خصوصیت ہے کہ اس میں مختلف مضامین نصابی اور تعلیمی کے متعلق ماہر مدرسین کے تجربات کی بنا پر رپورٹیں پیش کی جا رہی ہیں۔ ان کمیٹیوں کے جملہ ارکان ایسے مدرس منتخب ہوتے ہیں جو سب کمیٹی کے مفوضہ مضامین سے دلچسپی اور عملی تعلق رکھتے ہیں اس طرح سے یہ کمیٹیاں نہ صرف طبقہ مدرسین کے حقیقی ترجمان ہوتی ہیں بلکہ مضامین متعلقہ پر کافی عبور و دسترس بھی رکھتی ہیں یہ رپورٹیں بعد غور وخوض اور بحث مباحثہ کے بعد مرتب ہوتی ہیں۔ جن کی سفارش فنی معلومات کی روشنی میں ان کے جملہ عملی پہلوؤں سے بھی تعلق رکھتی ہیں اور مدارس اور مدرسین کی دشواریوں اور ضرورتوں اور خیالات کا آئینہ ہوتی ہیں امید ہے کہ یہ مفید سلسلہ اس طرح سے جاری رہے گا۔

اب تک جن اہم مضامین پر غور وخوض ہو چکا ہے اور جن کی رپورٹیں پاس ومنظور ہو چکی ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں۔

تعلیم جغرافیہ۔ تعلیم تاریخ۔ تعلیم انگریزی۔ تعلیم ریاضی۔ پیشہ ورانہ تعلیم۔ تعلیم اردو۔ تعلیم جسمانی۔ تعلیم سائنس۔ تعلیم ڈرائنگ۔ تعلیم اخلاقیات۔ تعلیم السنۂ قدیم۔ سال حال تعلیم کنڈرگارٹن۔ اور پچھڑی لڑکوں کی تعلیم کی رپورٹیں آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہیں۔ انجمن اساتذہ کی جانب سے علاوہ ضروری مسائل فن تعلیم کی رپورٹوں کی تیاری ومنظوری کے تعلیمی لکچروں کا بھی ہر سال انتظام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سال زیر رپورٹ میں ایسے چار مفید لکچروں کا انتظام ہوا یعنے۔

۱۔ لکچر پروفیسر واڈیا زیر صدارت عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر۔ موجودہ تعلیم کے رجحانات۔

۲۔ لکچر مس اوکی بیک ورڈ چلڈرن یا پچھڑی طلبار پر۔

۳۔ لکچر مس ریڈ کنڈر گارٹن پر۔

۴۔ لکچر ڈاکٹر مس اسٹرانگ طلبار کی ضروریات پر۔

سال گذشتہ تک کانفرنس ہذا میں علاوہ دیگر ضروری مسائل کے چند مفید تحریکات (رزولیوشن) بھی پیش ہوتی رہی ہیں اور کافی غور وخوض وبحث کے بعد منظور یا نامنظور ہوئی ہیں۔ ایسی منظورہ تحریکات کو صرف حافظہ کانفرنس تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ دوران سال میں برابر ان کی نسبت ارباب مقتدر اور دفاتر متعلقہ کو توجہ دلائی جاتی رہی ہے خدا کا شکر ہے کہ کانفرنس کی مساعی بیکار اور صدا بصحرا کا مصداق نہیں بن رہی ہیں بلکہ ان میں سے اکثر تحریکات بارآور ہوچکی ہیں جس کیلئے ان عہدہ داران باختیار کا کانفرنس ممنون ہے۔

آپ حضرات سے رخصت ہونے سے پیشتر میں اپنے ہم پیشہ مدرسین اور کارکنان تعلیم سے کہدینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس دور ترقی اور جہد البقا میں جبکہ مدارس میں ضروریات زمانہ کے مطابق جدید مضامین نصاب کی ضروری اور نئی نئی ایجاد کی مکمل معلومات لازمی ہے تو جدید معلومات کے ہمراہ جب تک ہم بھی دنیا کے قدم بہ قدم نہ چلیں ہمارا اس سفر میں دوسروں سے پیچھے رہ جانا اور ترقی کی برکات سے محروم رہنا ایک لازمی امر ہے۔ ہماری اور ہمارے ملک کی کامیابی و ترقی اس وقت مکمل اور یقینی ہوگی کہ ہم لوگ اپنے آفتاب علم سلطان العلوم۔ علم پرور عدل گستر اولوالعزم و روشن دماغ۔ محبوب ومحترم آقا اعلحضرت نواب میر عثمان علیخان خلداللہ ملکہٗ وسلطنتہ کے ظل امن وعاطفت میں محنت، باہمی ہمدردی، اشتراک عمل اور ایثار کو اپنا نصب العین بنالیں اور اپنی ہستیاں درس وتدریس کے منشار خسروی کی تکمیل کے لئے وقف کردیں اور اپنی محنت اور انہماک سے اپنی درسگاہوں کو موقر اور مختار بنا دیں۔

اس یقینی امید کے ساتھ کہ ان تمام معاملات اور کانفرنس کی جملہ کارروائیوں کو ہمارے قابل ومحترم صدر سے فاضلانہ رہبری وکامیابی حاصل ہوگی میں آپ حاضرین کی سمع خراشی کی معافی

طلب گار ہوکر آپ حضرات اور جناب صدر نشین کانفرنس ہذا کا مکرر نہایت فراخ دلی سے خیر مقدم کرتا ہوں ۔

شیخ ابوالحسن
اسپیشل مددگار ناظم تعلیمات سابق پرنسپل مدرسہ فوقانیہ
دارالعلوم بلدہ سرکار عالی

رپورٹ انجمن اساتذہ مستقر بلدہ حیدرآباد دکن

بابتہ آبان ۱۳۴۱ف لغایتہ مہر ۱۳۴۲ف

صدر عالی قدر۔ معزز خواتین و حاضرین بزمکین ۔

آپ حضرات کو بخوبی معلوم ہے کہ یہ انجمن (۸) سال سے عام طور پر ممالک محروسہ سرکار عالی اور خصوصاً بلدہ میں اہم خدمات انجام دے رہی ہے اور ہر سال علمی کام میں اضافہ ہوتا جارہا ہے سال زیر رپورٹ میں بدقسمتی سے بوجہ طاعون تقریباً (۵) ماہ تک اکثر مدارس مسدود رہے جس سے انجمن کے کام میں خلل واقع ہوا۔

گذشتہ سال کانفرنس میں تعلیم ڈرائنگ اور السنہ قدیم کی سب کمیٹیوں کی رپورٹیں پڑھی گئی تھیں اور اس سال کے لئے کنڈرگارٹن "و کند ذہن بچوں کی تعلیم" دو مضامین مقرر ہوئے تھے اس لئے اس کانفرنس میں ہر دو مضامین مذکورہ بالا کی سب کمیٹیوں کی رپورٹیں پیش ہوں گی یقین ہے کہ یہ رپورٹیں نہایت مفید ثابت ہوں گی کیونکہ ہر کمیٹی کے ارکان نے (جن کا انتخاب ان کے وسیع تعلیمی تجربہ کی بنا پر کیا گیا ہے) مختلف مدارس ابتدائیہ وثانویہ کا بطور خاص معائنہ و طلباء کی حالت کا مشاہدہ کرکے غور و خوض و بحث و مباحثہ کے بعد رپورٹیں تیار کی ہیں۔

شاخہائے انجمن ۔ انجمن کی شاخوں کی موجودہ تعداد (۱۲) ہے۔ بمقابلہ سال گذشتہ (۳) کی کمی ہوی ہے۔ کیونکہ مدارس سکندرآباد کے (۳) مرکزوں کا تعلق انجمن ہذا سے منقطع ہوا اور ماڈل پرائمری اسکول جدید مرکز مقرر ہوا۔

اراکین انجمن سکندرآباد کے مدارس کا تعلق دفتر صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے منقطع ہونے کے سبب سے تعداد اراکین میں کمی ہوئی۔ انجمن اساتذہ سکندرآباد کے انجمن ہذا سے الحاق کا مسئلہ زیر غور ہے۔ موجودہ تعداد اراکین انجمن تقریباً (۸۰۰) ہے۔

مرکزی انتظامی کمیٹی کے جلسے سال زیر رپورٹ میں جس کی مدت (۱۲) ماہ ہے۔ مرکزی انتظامی کمیٹی کے حسب ضرورت (۵) جلسے منعقد ہوئے جن میں حسب قواعد انجمن ماہانہ جلسوں کے لئے سہ ماہی پروگرام قبل از قبل مرتب کیا گیا اور انتخاب عہدہ داران انجمن و حسب معمول سالانہ کانفرنس کے انتظامات کے لئے کمیٹی ہائے متعلقہ کا تقرر عمل میں آیا۔ حسب سال گذشتہ اس سال بھی پروگرام کمیٹی۔ نمائشی اور استقبالیہ کمیٹی مقرر کی گئی اور مشاعرہ کے انتظام کے لئے ایک علحدہ سب کمیٹی مقرر ہوی۔

معمولی ماہانہ جلسے سال زیر رپورٹ میں انجمن کے جملہ مرکزوں میں (۸) مضامین پر بحث ہوی۔ چونکہ ماہانہ جلسوں کے لئے جو مضامین مقرر کئے گئے تھے ان کا تعلق یا تو کنڈر گارٹن یا کند ذہن بچوں کی تعلیم سے تھا۔ اس لئے جملہ اراکین کو ان دو مضامین پر غور اور تبادلۂ خیالات کرنے کا کافی موقع مل چکا تھا۔ جس کے مدنظر قوی توقع ہے کہ ذیلی کمیٹیوں کے اجلاس نہایت کامیاب ہوں گے۔ ماہانہ جلسوں میں جن مضامین پر بحث ہوئی وہ حسب ذیل تھے۔

۱۔ مدارس میں چھ سال سے کم عمر کے طلبار کے لئے کن انتظامات کی ضرورت ہے۔
۲۔ کمزور طلبار اور ان کی کمزوری کے اسباب دریافت کرنا۔
۳۔ کمزور طلبار کی ترقی کے متعلق کیا تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔
۴۔ بچوں کی تعلیم میں کھیل کی اہمیت خصوصاً کنڈر گارٹن میں۔
۵۔ ہوم درک خصوصاً غبی و کند ذہن بچوں کے لئے۔
۶۔ سامان متعلق کنڈر گارٹن۔
۷۔ ماحول و توارث کا اثر غبی و کند ذہن طلبار پر۔

سال گذشتہ میرے پیش رو نے معتمد صاحبان شاخہائے انجمن سے استدعا کی تھی کہ ہر سہ ماہی کے اختتام پر وہ جلسوں کی ایک مختصر روئداد معتمد عمومی کے پاس روانہ کریں تاکہ ان روئدادوں کو مقررہ کمیٹیوں کے معتمدین کے پاس روانہ کرنے کے علاوہ حیدرآباد ٹیچر میں شایع کیا جائے لیکن افسوس ہے کہ اس طرف کافی توجہ نہیں کی گئی۔ اکثر مرکزوں سے بروقت رپورٹیں وصول نہیں ہوئیں۔

عام جلسے زمانہ زیر رپورٹ میں چار عام جلسے منعقد ہوے جن میں سے ایک منجانب انجمن بصدارت

عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر جمنازیم ہال میں ہوا جس میں پروفیسر واڈیا نے موجودہ تعلیم کے رجحانات پر تقریر فرمائی۔ تین جلسے چادر گھاٹ برانچ کے تحت ہوئے جن میں مس اوکی نے بیپاک صورڈ چلڈرن پر مس ریڈ نے کنڈر گارٹن پر و ڈاکٹر ٹریسن اسٹرانگ نے طلبا کی ضروریات پر تقریریں فرمائیں اس طرح اس برانچ نے جو نظیر قائم کی ہے وہ قابل تقلید ہے۔

انجمن ہذا کی لائبریری انجمن ہذا کی لائبریری میں جملہ (۴۲۳) کتب موجود ہیں بمقابلہ سال گذشتہ تعداد کتب میں (۱۷۴) کا اضافہ ہوا ہے موزوں کتب کا انتخاب نہایت جانفشانی سے کیا گیا ہے۔ لائبریری کے لئے علحدہ کمرہ ہے سال زیر رپورٹ میں (۷۰) ارکان انجمن نے (۱۲۹) کتب کا مطالعہ کیا۔ اردو کتب سے بہت کم حضرات نے استفادہ کیا ہے۔ امید کہ آئندہ اسکی تلافی کی جائے گی۔ کتب کی ترتیب و دیگر امور میں مسٹر خیدروار کر ایم اے ہیڈ ماسٹر رزیڈنسی مڈل اسکول نے کافی حصہ لیا۔ اور نہایت دلچسپی سے مفوضہ فرائض انجام دئے۔ خصوصاً عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) صدر انجمن کی محنت و دلچسپی و نگرانی کا نتیجہ ہے کہ لائبریری میں بہت مفید کتب فراہم ہو چکی ہیں جن سے سالانہ کانفرنس کے موقع پر کافی امداد ملتی ہے اور نہایت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اراکین انجمن سے استدعا کی جاتی ہے کہ اس لائبریری کو اپنی لائبریری سمجھیں اور موزوں کتب کے نام یا مناسب تجاویز پیش فرمائیں۔ وقتاً فوقتاً جو کتابیں خریدی جاتی ہیں ان کی فہرست حیدرآباد ٹیچر میں شائع کی جاتی ہے۔

انجمن کی مالی حالت سال زیر رپورٹ میں جملہ ضروری مصارف کے بعد ختم مہر ۱۳۴۲ف پر خزانہ انجمن میں (للعہ ۱۱۴ /) سکہ عثمانیہ تھے۔ اس میں سال حال کی کانفرنس کے اخراجات کی رقم جو تقریباً (سماسہ) ہے شامل نہیں ہے۔

خزانچی کے فرائض جناب مولوی سید خیرات علی صاحب ابتدائے قیام انجمن سے نہایت محنت و دلچسپی سے انجام دے رہے ہیں۔ انجمن کے حسابات کی تنقیح کے لئے مولوی شرف الدین صاحب محاسب مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم و مسٹر ونکٹ نرسمہم سررشتہ دار دفتر صدر مہتممی تعلیمات مستقر بلدہ کا انتخاب کیا گیا ہے جو اوائل آذر ۱۳۴۳ف میں تنقیح کر کے رپورٹ پیش کریں گے۔

رسالہ حیدرآباد ٹیچر انجمن کا یہ سہ ماہی رسالہ اساتذہ کی امداد و رہبری کر کے ملک کی جو تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے وہ آپ حضرات سے مخفی نہیں۔ اخراجات ٹپہ میں اضافہ ہونے کی وجہ سے رسالہ مزید مالی مشکلات میں پڑ گیا تھا۔ لیکن مدیر مسؤل عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب

کی استدعا کو قبول فرماکرازراہ علم پروری عالیجناب ناظم صاحب تعلیمات ملک سرکار عالی نے مزید (۳۰) مدارس کے لئے یکم آذر سنہ ۱۳۴۲ ف سے رسالہ جاری کرنے کی منظوری عطا فرمائی ہے یقین ہے کہ اس سے رسالہ کے اجرا میں سہولت ہوگی۔ انجمن ہذا عالیجناب ناظم صاحب تعلیمات ملک سرکار عالی کی اس امداد۔ علم پروری و حوصلہ افزائی کی تہہ دل سے ممنون ہے۔ رسالہ کے معیار کو قائم رکھنے میں خصوصاً صدر حلقۂ ادارت عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے (کنٹب) میر مجلس انجمن اور جناب ممدوح کے معاونین ریورنڈ فلپ مولوی عطاء الرحمن صاحب مولوی سید فخر الحسن صاحب مولوی محمد عبدالنور صاحب صدیقی۔ و مولوی سیف اللہ بخش صاحب نے غیر معمولی محنت و جانفشانی کا اظہار فرمایا ہے۔ انجمن کو ان معزز اصحاب کا ممنون ہونا چاہئے۔

معزز حضرات!

اب میں انجمن کی جانب سے عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم اے (کنٹب) بیرسٹر ایٹ لا صدر نشین جلسہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جناب والا نے صدارت کانفرنس کو قبول فرماکر ارکان انجمن کی عزت افزائی فرمائی۔ رپورٹ کو ختم کرتے ہوئے خدائے بزرگ و برتر سے دست بدعا ہوں کہ وہ ہمارے آقائے ولی نعمت مدظلہ العالی کا سایۂ عاطفت ہمارے سر پر مدت مدید تک قائم رکھے آمین ثم آمین۔ ع

این دعا از من و از جملہ جہان آمین باد

مرزا ضیاء الدین بیگ۔ بی اے بی ٹی

معتمد عمومی انجمن اساتذہ مستقر بلدہ

خطبۂ صدارت

از نواب فضل القدر جنگ بہادر ایم۔ اے کنٹب معتمد تعلیمات و امور عامۂ سرکار عالی

یہ ایک عام دستور ہے کہ ایسے موقعوں پر اظہار تشکر کیا جائے لیکن میں رسمی طور پر شکریہ ادا کرنا نہیں چاہتا بلکہ اُس عزت افزائی کا جو انجمن اساتذۂ بلدہ نے میرے اور میرے عہدے کے اعزاز کو مد نظر رکھ کر آج مجھے یہاں خطبۂ صدارت دینے کے لئے مدعو کیا ہے سچے دل سے اعتراف کرتا ہوں۔

یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میرا خطاب اساتذہ سے ہے جن کا میں کامل احترام ملحوظ رکھتا ہوں اور جن کی خدمات سے جو اکثر ناشکور ثابت ہوتی ہیں مجھے پوری پوری ہمدردی حاصل ہے۔ مجھے ان کی مشکلات کا اور اس جوش و سرگرمی کا جس سے وہ اپنے فرائض کی ادائگی میں کام لیتے ہیں۔ بہت کچھ احساس ہے۔

اب ہم ایک ایسے دور میں سے گذر رہے ہیں جس میں دنیا کی جنگ عظیم کے بعد پھر سالقہ حالت پر عود کر آنے کی جد وجہد ہو رہی ہے اور باوجود اپنی تمام ترقیوں، دولت اور از دیاد علم و قابلیت کے ہم اب تک اس پستی سے ابھرنے کے قابل نہیں ہوئے جس میں مبتلا ہیں۔ ہماری یہ پستی محض مالی حالت کے سنبھل جانے سے دور نہیں ہو سکتی ہم میں بہت سی بد نصیب ہستیاں ایسی ہیں جو عقائد و نظریات اور ایقان کی پستی میں بھی مبتلا ہیں جس کا بیّن نتیجہ یہ ہے کہ ہم یہ تک نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں۔ چنانچہ زمانۂ حال کا ایک مصنف مسٹر جے ایچ میاکسول تعلیم کے متعلق اس بے اطمینانی پر بحث کرتے ہوئے جس کا اظہار مسٹر ایچ۔ جی۔ ویلس نے کیا ہے لکھتا ہے:۔

تعلیم میں ایک ایسا مسئلہ ہمارے درپیش ہے جس کو ہم حل نہیں کر سکتے ہماری حالت اس شخص کی سی ہے جو اندھیرے میں ٹٹول رہا ہو۔ تعلیم کا مقصد یا تو تربیت ہونا چاہئے۔ یا آیندہ زندگی کی تیاری۔ کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو ہمیں یہ بتلا سکے کہ زندگی کیا چیز ہے یا اس کے کیا معنے ہیں ہمیں اس امر کا ایک دھندلا سا تصور ہوتا ہے کہ تعلیم کا مقصد قابلیت کی نشو نما کردار کی درستی اور علم کی اشاعت ہونی چاہئے لیکن فطرت انسانی اور کردار کامل طور پر ضوابط و اصول کے پابند نہیں ہیں۔ اور تعلیمی جال کے پھندوں میں چاہے وہ کتنے ہی پیچ در پیچ کیوں نہ ہوں مقید ہو کر نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ

تعلیم ہمیشہ غیر اطمینان بخش رہی اور تعلیم کا مسئلہ کم و بیش اسی طرح مایوس کن رہے گا۔ ہم ہر ایک دور کے اساتذہ سے زیادہ سے زیادہ جو توقع رکھ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ اپنے مفوضہ کام کو حسن و خوبی انجام دیں اور نوجوان پود کے روبرو ایک ایسی کام کی مثال قائم کر دیں جو بہ تمام و کمال اور ایمانداری کے ساتھ تکمیل کو پہونچا ہو۔ اگر آنے والی نسل اپنی پیش رو نسل کے تجربات اور غلطیوں سے فائدہ اٹھائے تو ضرور کچھ نہ کچھ سیکھے گی اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ نصب العین کو مطمح نظر رکھنا ایک اچھی بات ہے، لیکن اس سے زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ انسان اس منتشر خیالی کے باوجود بھی جو فطرت انسانی کا خاصہ ہے اور ان مایوسیوں میں بھی جو دوران تجربات پیدا ہوتی ہیں اور ان رکاوٹوں کے موجود رہتے ہوئے بھی جو زندگی میں پیش آتی ہیں اپنے ماحول اور حاصل کردہ معلومات سے تمتع حاصل کرے۔

آپ کو اس کا بخوبی علم ہوگا کہ ان کے مقاصد اور طریقوں پر کیا کیا تنقیدیں ہو رہی ہیں۔ اور یہ ایک اچھی بات ہے کہ ہم ان تنقیدوں پر اگرچہ کہ ان میں باہمی تناقض ہی کیوں نہ ہوں ٹھنڈے دل سے غور کریں اور ان سے جو نظریات برآمد ہوتے ہیں ان پر دل کھول کر بحث مباحثہ کریں اور ان کا تجربہ بھی کر کے دیکھیں۔ لیکن یہ بالکل درست نہیں کہ کسی نتیجہ پر پہنچنے کے بعد ہم عقل سلیم کھو بیٹھیں اور اپنی پر جد و جہد زندگی کے ان اہم فرائض کو فراموش کر دیں جو بحیثیت مدرس ہونے کے ہم پر عاید ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ وہ فرائض ہیں جن کو فطرت انسانی کی ضرورتوں اور واقعات زندگی نے ہمارے لئے مشخص کر دئے ہیں اور ان فرائض کا ان مافوق الفطرت چیزوں سے جن کا ہم آئے دن مشینی ترقیوں یا ذہن انسانی کی غیر معمولی قوتوں میں مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کوئی تعلق نہیں۔ یہی اصلی و بنیادی فرائض ہیں جیسا کہ سر ولیم رامزے نے کہا ہے "ایک مدرس کے نقطۂ نظر سے ہمیشہ ہمارے لئے یہی بہتر ہوگا کہ ہم بنیادی اصول کی جانب رجوع کریں"۔

اصل مبحث پر رجوع کرنے سے قبل میں صرف اتنا کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس ریاست کے اساتذہ اور ممالک دیگر کے اساتذہ کی مشکلات اور دقتوں کا جو ان کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں پیش آتی ہیں مجھے نہ صرف احساس بلکہ افسوس بھی ہے۔ مدرس جس کام کو دیانت داری سے انجام دے وہ کام اس کے لئے ہمیشہ کٹھن ثابت ہوتا ہے اور جو مالی صلہ مدرسین کو ان کی خدمات کے معاوضہ میں ملتا ہے وہ ان کی محنتوں کے مقابلے میں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی کہوں گا کہ بعض صورتیں بالکل اس کے برعکس بھی ہوتی ہیں۔ حیدرآباد میں بھی تعلیم کے راستہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں مثلاً کمال درجہ کی مفلسی، گرمی کی شدت، گرد و غبار کی کثرت، مہلک وبائی امراض

اور دیگر مشکلات جن کو دور کرنے کی گورنمنٹ آہستہ آہستہ استقلال کے ساتھ کوشش کر رہی ہے۔

لیکن ایک حقیقی مدرس جو اپنے شاگردوں کی فطرت سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ غریب سے غریب اشخاص اور ان لوگوں میں بھی جن کو ہم جاہل مطلق سمجھتے ہیں صفات حسنہ کا فقدان نہیں ہے۔ جو اس قصہ سے بخوبی ثابت ہوتا ہے۔ جس کو عبداللہ ابن دینا نے بیان فرمایا ہے اس قصہ سے ہم پر ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں ان لوگوں کو بھی نظر تحقیر سے نہ دیکھنا چاہئے جو سوسائٹی میں بار نہیں پا سکتے۔ وہ فرماتے ہیں" ایک بار میں مکہ معظمہ کے قرب وجوار میں خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ راستہ میں ہمیں ایک چرواہے کا غلام لڑکا ملا جو بکریوں کا گلہ ہانکے لئے جا رہا تھا حضرت عمرؓ نے اس سے مخاطب ہوکر فرمایا کیا تم ایک بکری میرے ہاتھ بیچتے ہو؟"

لڑکا۔ یہ بکریاں میری نہیں بلکہ میرے مالک کی ہیں"۔ حضرت عمرؓ نے پھر اس کو آزمانے کی غرض سے دریافت فرمایا "اچھا تو تم اُس سے کہہ سکتے ہو کہ ایک بھیڑیا اسے اٹھالے گیا اور مالک کو یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ (لڑکا) مالک کو اصل واقعہ معلوم ہو یا نہ ہو لیکن خدا سے تو کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی"۔ یہ سنکر حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور چرواہے کو بلوا کر اُس غلام لڑکے کو یہ فرماتے ہوئے آزاد فرما دیا "جا تو نے ایک ایسی بات کہی جس کی وجہ سے نہ صرف اس دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی تجھے چھٹکارا مل جائے گا۔

اب کہیں چلکر یہ بات ہمیں یاد آئی ہے کہ بچوں کے معلم کو زندگی کی ایک مشکل مہم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس شخص کو جس کی معصومیت کا زمانہ گذر چکا ہو معصوموں کی رہنمائی کرنی پڑتی ہے۔ اس دنیا سے بے خبر بچہ جس میں ہم رات دن متضاد حالات دیکھتے رہتے ہیں۔ اور جس میں بہ نسبت خیر کے شر کا عنصر زیادہ ہے اپنی معصومیت کی حالت میں ان افراد کے حوالے کر دیا جاتا ہے جن کی بچپن کی فطرت کا زمانہ گذر چکا ہے اور جنہوں نے زمانے کے سرد و گرم کا بہت کم تجربہ حاصل کیا ہے۔

میں یہاں منطقی یا نفسیاتی نقطۂ نظر سے کوئی بات پیش کرنے والا نہیں ہوں جو سب کو مغالطے میں ڈالدے بلکہ تاریخ اسلام کا اور نیز اس زمانے کی اقوام یورپ کی انسانیت کا جسکہ اٹلی میں خود مختار ریاستیں قائم اور زندگی کی خاطر کثرت سے شورشیں برپا تھیں مطالعہ کرنے اور خود اپنے ملک کے اساتذہ و طلبہ سے عرصۂ دراز تک میل جول رکھنے کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرا متذکرۂ صدر بیان کس قدر واقعیت پر مبنی ہے یہ وہ حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن حضرات و

خواتین! جس بات پر آج میں زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہم اس مسئلہ پر ایک پہلو سے غور کریں۔ اکثر اشخاص مسئلہ تعلیم پر غور کرتے ہوئے۔ بچہ پر اُستاد کے تفوق کو تسلیم کر لیتے ہیں لیکن معدودے چند ایسے ہیں جو اُن امکانات کو پیش نظر رکھتے ہیں جن کی رو سے بچہ بھی اس قابل ہوتا ہے کہ استاد کو تعلیم دے سکے اس سے مراد نصاب کی تعلیم نہیں بلکہ وہ تعلیم ہے جو بچے کی موجودگی کے نامعلوم اثر سے استاد کو حاصل ہوتی ہے لیکن اس سے بھی کم تعداد ان اشخاص کی ہے جو اپنی قوت متخیلہ کی مدد سے اس نتیجہ کو دیکھ سکتے ہیں جو اساتذہ اور طلباء کے باہمی میل جول سے رونما ہوتا اور ایسے خوش گوار حالات پیدا کر دیتا ہے کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ دلی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ امر ہم سب کے لئے کچھ کم باعث فخر و مباہات نہیں کہ حیدرآباد میں مذکورہ بالا میل جول اور ہمدردی کی دو عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ جن کو میں یہاں اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر آپ حضرات کے روبرو بیان کر سکتا ہوں۔ شاید یہاں بہت سے افراد ایسے ہوں گے جن کو یہ معلوم نہ ہو کہ چادرگھاٹ ہائی اسکول میں جس کی صدارت میرے دوست مسٹر کپتال نہایت قابلیت کے ساتھ انجام دے رہے ہیں، منجملہ اور عمدہ چیزوں کے جو ایک عمدہ مدرسہ میں ہونے چاہئیں۔ ایک کنڈرگارٹن بھی ہے۔ جو نو سال سے حیدرآباد کے نونہالوں کے لئے گوناگوں مسرتوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے میں خیال کرتا ہوں کہ میرا یہ کہنا ایک حد تک درست ہوگا۔ کہ یہی وہ کنڈرگارٹن ہے جو پہلے پہل اردو میں قائم کیا گیا۔ اور ایک قابل قدر مدرس مسٹر سید پیر کی نگرانی میں پھل پھول رہا ہے دوسری مثال جس کی جانب میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وکٹوریہ میموریل آرفینج ہے جو اس قابل ہے کہ آپ اپنی فرصت کے اوقات میں ضرور اس کا معائنہ کریں یہ دارالیتامے مسٹر اور مسز آلگس کی نگرانی میں چل رہا ہے پہلے اس کی حالت نہایت ابتر تھی لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے گویا جادو کے زور سے اس کی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ قابل سے قابل مبصرین کی اس دارالیتامے کے متعلق یہ رائے ہے کہ یہ اپنی نوعیت میں ہندوستان بھر میں آپ اپنی نظیر ہے اگر کوئی شخص اس دارالیتامے میں بچوں کے ساتھ جب وہ اپنے پڑھنے لکھنے یا دستکاری یا کھیل میں مصروف ہوں ایک یا دو گھنٹے بسر کرے تو اس کو غایت درجہ مسرت حاصل ہوگی اور اس امر کا پتہ چل جائے گا کہ کیوں شہزادگان و شہزادیان والا تبار اس درس گاہ کی اعانت و سرپرستی میں اس قدر گہری اور عملی دلچسپی لیتے ہیں۔

ایک ایسا مدرسہ جو بچوں کے لئے اس قسم کی دلچسپیوں اور خوشیوں کا سامان جمع کر دے

بے شک ایک نہایت ہی عقلمند نہایت ہی قابل قدر اور نہایت ہی جوشیلا مدرس ہے اگر وہ اپنے آپ کو مٹی سے خوشنما مورتیں بنانے والا تصور کرے تو بالکل بجا ہے۔ اُس کا دل ایسے احساسات سے لبریز ہوتا ہے جن کی ترجمانی برٹرانڈ رسل نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"وہ اُن تمام اشیا میں جو ذی حیات ہوتی ہیں خصوصاً صنف انسانی میں اور اس میں بھی زیادہ تر بچوں میں ایک ناقابل توضیح پاکیزگی اور ایک گراں بہا منفرد ہستی کا احساس کرتا ہے۔ یہ منفرد ہستی اس کو ایک بڑھنے والا اصول زندگی اور دنیا کی خاموش جدوجہد کا ایک مجسم جز معلوم ہوتی ہے۔ وہ بچے کی موجودگی میں ایک ناقابل بیان عجز محسوس کرتا ہے ایسا عجز جس کی کوئی معقول وجہ تبلائی نہیں جا سکتی۔ تاہم وہ اساتذہ اور والدین کی خود اعتمادی کی بہ نسبت زیادہ قرین عقل ہوتا ہے۔ بچے کی ظاہری بے بسی اور دوسروں کی مدد کی محتاجی اس میں ایک ایسی ذمہ داری کا احساس پیدا کر دیتی ہے جس کا تمام تر اعتماد اسی کی ذات پر ہوتا ہے۔ اس کی قوت متخلہ اس کو تبلاتی ہے کہ بچہ آگے چل کر کیا ہوگا وہ برائی اختیار کرنے والا ہوگا یا بھلائی اس کی قوت ارادی کی نشو و نما کس طرح ہو سکتی ہے یا وہ کس طرح کسی دوسرے رخ پر لگائی جا سکتی ہے۔ اس کی امیدوں میں انحطاط پیدا ہونے اور اس میں جو ایک اُپج کا مادہ ہوتا ہے اس کے کم ہوتے جانے اور اس کی قوت اعتمادی کے زائل ہونے اور اس کی خواہشات کی تیزی کے کم ہو جانے اور اُس میں ایک ہی بات کی ادھیڑ بن میں لگے رہنے کی عادت کے پیدا ہونے کے کیا اسباب ہیں۔ جب وہ ان سب باتوں پر غور کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک زبردست خواہش اس امر کی پیدا ہوتی ہے کہ وہ اس کش مکش کی حالت میں بچے کی مدد کرے پھر وہ بچے کی احتیاجوں کو پورا کرتا اور اس کے حوصلوں کو بڑھاتا ہے۔ محض اس وجہ سے نہیں کہ کوئی خارجی قوت یا حکومت کے مجوزہ احکام یا کوئی ذی اقتدار ہستی اس کو ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے بلکہ محض بچے کا طبعی جوش اور رجحان اس کو اس جانب مائل کرتا ہے۔ وہ شخص جو اس قسم کے احساسات رکھتا ہے وہی اس قابل ہے کہ آزادی کے اصول پر قائم رہ کر تعلیم کا علم بردار کہلا سکے۔"

مندرجہ بالا نصب العین کے برخلاف جب ہم اکثر نوجوانوں کو اپنے مدرسین کی سختی یا کاہلی یا عدم ہمدردی کو یاد کر کے اپنے مدرسے کے زمانۂ گذشتہ کا تلخی کے ساتھ تذکرہ کرتے ہوئے پاتے ہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے۔ ؎ ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا۔ اس میں شک نہیں کہ اُس زمانے میں ضبط اور کتابی تعلیم اچھی تھی لیکن دوسری بہت سی ایسی چیزوں کا فقدان تھا جو لڑکے

تعلیمی بورڈ کے ایک مشہور و معروف سابق رکن سر رابرٹ مورانٹ کی مندرجہ ذیل تحریر میں بیان کی گئی ہیں :۔

اساتذہ مثال اور اثر کے ذریعہ اس امر کی کوشش کر سکتے ہیں کہ بچوں میں محنت خودداری اور مشکلات کا جرات انگیز ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرنے کی عادتیں راسخ ہو جائیں وہ ان میں اعلیٰ اوصاف پیدا کر سکتے اور ان کو ایثار نفس کے لئے تیار کر سکتے ہیں اور اس قابل بنا سکتے ہیں کہ وہ صداقت اور بے لوثی کے اصول پر عمل کرنے کے لئے انتہائی کوشش کام میں لائیں وہ بچوں میں فرض شناسی کا زبردست احساس اور اپنے ابنائے جنس کے متعلق اس ادب و احترام کے جذبات پیدا کرا سکتے ہیں جو بے غرضی اور تمام عمدہ اطوار کی بنیاد ہیں"۔

اس سے آپ کو ہرگز اختلاف نہ ہوگا کہ یہ ایک اعلیٰ طریقۂ تعلیم ہے اور ویسا نہیں ہے جیسا کہ مٹی سے برتن ڈھالے جائیں۔ ڈھالنے کا کام خدائے تعالیٰ کی جانب سے تکمیل کو پہونچ چکا ہے اب استاد کی بڑی ہنرمندی یہی ہے کہ وہ بچے کی ان قوتوں کو جو اظہار کے لئے تڑپ رہی ہیں تحریک میں لاوے اور اس کے رجحانات جبلتوں اور ارادوں کو صحیح راہ پر لگا دے یا بہ الفاظ دیگر بچوں کے لئے مواقع اور ہدایتیں مہیا کر دے۔

صحیح معنوں میں تعلیم وہی ہے جو ذہنی قویٰ کا جمہور کے ساتھ ربط پیدا کر دے اور اس طرح ایک شائستہ حکومت کی ترقی میں مدد و معاون ہو۔ اسی تعلیم سے اس سوسائٹی کی بنیاد قائم ہوتی ہے جس پر انسانیت کا اطلاق ہو سکتا ہے "۔

یہ باتیں کیونکر عملی صورت میں لائی جائیں۔ یہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی جانب دور حاضرہ کے ماہرین تعلیم کی توجہ ایک عرصہ سے مبذول ہو رہی ہے اور بہت سی ایسی تجاویز اور طریقہ ہائے عمل وضع کئے گئے ہیں جو اس مقصد کے حصول میں موثر ثابت ہوں لیکن میرے خیال میں اس مسئلے کا حل شخصیت سے تعلق رکھتا ہے ایسی شخصیت سے جو ایثار کے لئے مستعد ہو جائے اور ایسے کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے جو اگرچہ کہ حقیر لیکن شریفانہ ہے جتنے بڑے اساتذہ گزرے ہیں سب نے شخصی مفاد کو نظر انداز کر دیا ہے ہم سب اس امر سے بخوبی واقف ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ معلمین اور خصوصاً طبقہ تحتانیہ کے معلمین کا کام سخت اور معاوضہ کم ہے حالانکہ یہی وہ کام ہے جس پر سب کچھ منحصر ہے۔

کنگز کالج لندن کے سابق پرنسپل پروفیسر ارنسٹ بارکر نے اس خصوص میں کہ شائستہ حکومت کو

ترقی دینے کے کیا اصول ہیں ہمارے لئے ایک واضح لائحہ عمل پیش کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :-
"فرقہ دماغوں کے مجموعہ کا نام ہے ۔ لہذا اس کا تعلق لازمی طور پر دماغ ہی سے ہے وہ تعلیم جو اس تعلق کے اظہار کا طریقہ مہیا کر دے ایک عمیق ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں عمیق تر مسئلہ ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے وہ محض علم ہی سے متعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق مذاق اور چال چلن سے بھی ہے وہ انسان کو کام ہی کے لئے نہیں بلکہ اوقات فرصت کے لئے بھی تیار کرتا ہے ۔ وہ طبیعت کی مناسبت اور فرائض متعلقہ کے لحاظ سے بدلتا اور منقسم ہوتا رہتا ہے اور وہ اس اتحاد کا بھی ذریعہ ہے ۔جو سوسائٹی کو ایک ہی رنگ میں رنگ دے ۔ وہ عطیات (Grants) مشاہرات ، وظائف حسن خدمت ، نظام الاوقات اور نصاب تعلیم کے مسائل کو معترض بحث میں لانا اور ان کے طریقہ ہائے کار بتلاتا ہے ۔لیکن ان تمام انتظامی امور سے الگ اور بالاتر ایک اور نہایت ہی دلچسپ و خوشگوار کام بھی ہے جو انسان کے تفویض کیا گیا ہے ۔ یہ کام مدرس کا اور ایک پختہ اور تربیت یافتہ دماغ کا ہے جس کو بچوں کے نمو پانے والے دماغ سے سابقہ رہتا ہے انسان کا اس سے زیادہ مرغوب کام کوئی اور نہیں ہو سکتا"

یہی وہ درخشاں اور ہدایت آموز پروگرام ہے ۔جس کو ایک نہایت جفاکش مدرس ہی تیار کر سکتا ہے بلکہ اس کی نوعیت ایک پروگرام سے بھی کہیں بڑھی چڑھی ہے ۔ یہ بات واضح طور پر ہمیں تبلادی گئی ہے کہ تعلیم کے جدید نظریے کے مطابق انیسویں صدی کے مدرس کو مذہب کے ساتھ سائنس اور طریقۂ تعلیم سے بھی پوری واقفیت رکھنی چاہئے انہیں دو قوتوں یعنے مذہب اور سائنس کے امتزاج سے انسانی فلاح و بہبود کے نتائج برآمد ہوتے ہیں گو ہم اگلے مذہبی معتقدات کو روبہ زوال دیکھکر رنج و افسوس اور سائنس کی روز افزوں طاقت پر اظہار ناراضگی کرتے ہیں لیکن جب ہم اس امر کا احساس کرتے ہیں کہ مدرسے میں پڑھانے والے مدرس میں بھی وہی جوش کام کر رہا ہے ۔ جو اگلے زمانے کے مذہبی مصلح اور مبلغ کا خاصہ تھا اور جب یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سائنس کی نہایت قابل قدر تحقیقات سے بھی تعلیم میں عموماً کام لیا جا رہا ہے تو ہماری مسرت کی کوئی حد نہیں رہتی ۔

سائنٹیفک طریقہ کا حاصل کرنا جو فن تعلیم کا ایک نہایت اہم شعبہ ہے مدرس کے لئے ایک گراں بہا شئے ہے ۔جب اس کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ وہ ایک روحانی دور کا بانی ہے تو اس کو اپنے کام میں اور بھی جوش و انہماک پیدا ہو جاتا ہے ۔لیکن یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح ایک شخص اپنے ابنائے جنس میں اعلیٰ زندگی بسر کر سکتا ہے جب کہ اس کو ایک

ایسی دنیا میں اپنا فرض ادا کرنا پڑتا ہے جہاں ہر شخص اپنی ذاتی ترقی کے لئے کوشاں ہے "جدید شاہراہوں پر سے گذر کر ہم اعلیٰ مقامات میں کس طرح فروکش ہوسکتے ہیں ؟" اس سوال کا جواب ہم کو مس وانڈ اسکڈر کے مندرجۂ ذیل الفاظ میں ملتا ہے۔

جس کام کا اشارہ متذکرۂ صدر سوال میں کیا گیا ہے اس کے لئے بہت کچھ ضبط نفس، قوت ارادی برداشت اور تحمل کی ضرورت ہے یہ ان بے ریا کاموں میں سے ہے۔ جن کے لئے بہت سی پوشیدہ قربانیاں عمل میں آئی ہیں جو دنیا کو تباہی سے بچانے کا باعث ہوئیں"۔

شاید یہاں میرا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کسی سنہری دنیا کا خواب دیکھتے یا اس کا مبہم تذکرہ کرتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ مجھے یہ بتلاتا ہے کہ اس قسم کی خیالی چیزوں پر اعتبار کرنا ایک افسوس ناک لغویت ہے بلکہ میری مطمح نظر وہ ممکن الوقوع چیزیں اور وہ ترقیاں ہیں جو لگاتار جدوجہد سے رونما ہوئی ہیں میرے پیش نظر وہ ایجادات ہیں جو آج بھی حالانکہ رات دن ہماری نظر سے گذرتی رہتی ہیں اسی طرح ایک خواب سی معلوم ہوتی ہیں جس طرح ازمنۂ قدیم میں تصور کی جاتی تھیں یہ چیزیں ہوائی پرواز، لاسلکی، آلات خوردبینی و دوربینی و آلات تحلیل شعاع وغیرہ ہیں۔

موجودہ دنیا اور اس کی تمام سخت اور سرگرم کوششوں کے نتائج بھی ایک زمانے کے بعد نسیاً منسیاً ہوجائیں گے اور ان کی جگہ ایک نئی دنیا جو نہ صرف تازہ جوش اور امیدوں سے بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر عزیمت واستقلال سے بھری ہوئی ہوگی نمودار ہوگی۔ پھر میں یہاں لارڈ رسل کے الفاظ کی طرف رجوع کرتا ہوں:-

وہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں پر تنوع اور حیرت انگیز ہے اس کی بعض چیزیں ایسی ہیں جو بادی النظر میں نہایت سیدھی سادی معلوم ہوتی ہیں لیکن جیسے جیسے ان پر غور کیا جائے۔ ویسے ویسے مشکل ثابت ہوتی ہیں بعض ایسی ہیں جن کی دریافت بالکل غیر ممکن سی نظر آتی ہے۔ لیکن انسانی جودت اور محنت کے ذریعہ وہ پردہ اخفا سے نکل آتی ہیں۔ خیال کی قوتیں اور وہ وسیع علم وجس پر وہ احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور اس سے کہیں زیادہ وسیع علم وجس کا صرف ایک دھندلا سا تصور قوت تخیلہ میں پیدا ہوسکتا ہے اُن اشخاص کو روزمرہ کی حقیر اور معمولی چیزوں سے بے نیاز رکھتی ہے جن کے دماغ اعلیٰ معلومات کے ذخیرہ سے معمور رہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی کل زندگی دلچسپی سے مملوہوتی ہے اور وہ عامیانہ چیزوں کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہیں

دیکھئے مثال کے طور پر اس شوق مہمات ہی کو لیجئے جو انسانوں کو قطب شمالی تک لے جاتا ہے اور
اس جوش شجاعت کا خیال کیجئے جو اشخاص کو میدان جنگ میں پہونچا دیتا ہے یا ایسی چیزیں جو
ایک حوصلہ مند خیال ہیں ناپاک اور بے رحمانہ تصور نہیں ہیں بلکہ انسان کی عظمت کو بڑھانے والی اور زندگی کو ہما
تاباں و درخشاں جاہ و جلال سے متمتع بنانے والی ہیں جن کو انسانی جوش اور ہمت پردۂ غیب
سے عالم شہود میں لاتی ہے۔ اسی مسرّت سے ان لوگوں کو جو اس کے اہل ہیں کم و بیش بہرہ
اندوز کرنا ہی وہ اعلیٰ مقصد ہے جس کے لئے دماغ کی تعلیم و تربیت بے حد ضروری اور قدر و قیمت
کے قابل سمجھی گئی ہے۔" (برٹرانڈرسل)

اب یہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم اپنی کھوئی ہوی عظمت پر آنسو بہائیں اس عظمت کا بیشتر حصہ
خصوصاً ایسی سرزمین میں جو لگاتار جنگ و جدل کا مرکز بنی ہوی ہو اور جہاں تھوڑے تھوڑے عرصہ
کے لئے حکومتیں قائم ہو کر مٹ گئی ہوں۔ محض ہوس عز و جاہ بے رحمی اور انتقام گیری پر مبنی تھا۔
بلکہ اس زمانہ، ماضی سے ہم ایک اور قسم کی عظمت، جان توڑ کوشش اعلیٰ نصب العین پر استواری
فرض شناسی اور احساس ذمہ داری کا سبق حاصل کر سکتے ہیں جو بجائے خود ایسے خزانے ہیں۔
جو تمام مادی ترقیوں سے بڑھے چڑھے ہیں یہ دل و دماغ کے خزانے ہیں۔ جن پر قبض و تصرف
رکھنے کی وجہ سے زمانۂ ماضی کے شریف و شجیع سورماؤں کے نام اب تک زندہ ہیں۔ مسٹر ایچ۔ جی
ویلس لکھتے ہیں۔

"ہماری موجودہ پستی کی بے حسی نے ہم کو اس قدر اندھا کر دیا ہے کہ ہم ان واضح اور
روشن امور کو بھی نہیں دیکھ سکتے جن پر عمل کرنے سے چند ہی نسلوں کے بعد ہر ایک چھوٹے سے چھوٹا
ملک ایتھنز بن سکتا ہے۔ ہر ایک انسان شریف النسل اور جسمانی و دماغی لحاظ سے توانا و صحت
مند ہو سکتا ہے کل ٹھوس زمین انسان کے حق میں معدن بن سکتی ہے اور اس کے بعید ترین خطے
اس کی جولانگاہ بن سکتے ہیں۔

یہ ایک عمدہ اور ہمت افزا پیش گوئی ہے جس کا بہت ہی جلد عملی صورت میں ظاہر ہونا امکان
سے بعید نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس سے آپ بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے محبوب تاجدار اعلیٰ حضرت
حضور نظام نواب میر عثمان علیخان بہادر خلد اللہ ملکہٗ و دولتہ کے شاندار عہد حکومت میں تعلیم نے
میدان ترقی میں کس قدر قدم آگے بڑھائے ہیں۔ ہمارے ماہرین تعلیم کنڈرگارٹن سے لیکر اونچی
سے اونچی درس گاہوں تک اس مبارک دور میں حقیقی جوش اور دلچسپی سے کام کر رہے ہیں۔

جاگیردار کالج کی مثال ہمارے سامنے ہے جو نہ صرف جماعتی تعلیم میں بلکہ ورزشی کھیلوں کے میدان میں بھی توقع سے زیادہ کامیاب ثابت ہورہا ہے اور ہماری عثمانیہ یونیورسٹی جس سے تعلیم مسلمانان ہند کی تاریخ میں ایک روشن و شاندار باب کا اضافہ ہوا ہے۔ ہزارہا طالبعلموں کا جو اردو زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں مرجع بنی ہوی ہے۔ مشرقی اور مغربی تہذیب کے میل ملاپ سے اس بات کا یقین ہورہا ہے کہ بہت جلد اس یونیورسٹی کو ما بین الاقوامی شہرت حاصل ہو جائے گی۔ اور ہمارے ملک دکن کی علمی ترقیوں اور ہمارے بیدار مغز شہریار کی معارف نوازیوں کو دنیا تسلیم کرنے لگے گی کیونکہ یہ ہمارے خسرو فیجاہ سلطان العلوم کے علمی تبحر اور اعلیٰ شاعرانہ ذوق کی وجہ ہے کہ یونیورسٹی کے مقاصد میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی جا رہی ہے۔

اوپر ان مشکلات کا ذکر ہو چکا ہے، جن سے مدرس کے کام میں رکاوٹ پیش آتی ہے ان مشکلات میں تنہائی، بے وطنی اور حیدرآباد میں جہاں زندگی کی تحریص انگیز مسرتیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ متبدل ہونے کی خواہش اور بھی اضافہ کر دیتی ہے۔ لیکن بجز معدودے چند افراد کے جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ہر شخص اس قابل نہیں ہوتا کہ جس جگہ وہ متعین کیا گیا ہو وہاں آرام و چین کی زندگی بسر کر سکے اور میرے خیال میں یہی ایک بہت بڑی مشکل ہے جو زندگی میں پیش آتی ہے خصوصاً ایک مدرس کے حق میں تو اس کا اثر نہایت مہلک ہوتا ہے۔ کیونکہ بچے (ہمیں خود اپنے بچپن کا زمانہ یاد ہے) بہت حساس ہوتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے خلوص و عدم خلوص کو جن کی صحبت میں وہ رہتے ہیں بہت تیزی سے محسوس کر لیتے ہیں۔

اگر کوئی مدرس یہ محسوس کرے کہ ایک ایسی جگہ پر جس کو وہ ادنیٰ خیال کرتا ہے۔ ادنیٰ لوگوں میں مامور کئے جانے کی وجہ سے زندگی اس کیلئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تو اس کو وہی کرنا چاہئے جو کہ دنیا کی بڑی اور صداقت شعار ہستیوں نے کیا ہے۔ اس کو چاہئے کہ مشکلات کا مقابلہ کرکے ان کو اپنے کردار کے زور سے مغلوب کر دے اس کو شہرۂ آفاق مضمون نگار ایمرسن کے الفاظ یاد رکھنا چاہئے جو اس طرح رقمطراز ہے "حتیٰ کہ غریبوں سے بھی قدرت دن رات ایسے صبر و استقلال کے اثرات ظاہر کرواتی ہے جو اس سے کہیں پاکیزہ تر ہوتے ہیں جس کے اعلیٰ نمونے ہم مدارس میں دیکھتے ہیں۔

مدرس کو ہرگز اس بات کا احساس نہ ہونا چاہئے کہ اس سے لاپروائی برتی گئی ہے کیونکہ اگر وہ ایسا محسوس کرے گا تو گویا اپنے آپ سے لاپروائی کرنے لگے گا جو اس سے کہیں

زیادہ برا ہے کہ دوسرے اس سے لاپروائی کریں چاہئے کہ وہ اپنے فرض کو ایک ایسی آزمائش
خیال کرے جو اس پر حکام کی جانب سے نہیں بلکہ ان سے کہیں بزرگ تر ہستی یعنی اس کے اپنے
ضمیر کی جانب سے عائد کی گئی ہے اس کو چاہئے کہ وہ اپنے فرائض منصبی کو چاہے وہ کتنے ہی حقیر
کیوں نہ ہوں ترش روئی کے ساتھ اور بادل ناخواستہ انجام نہ دے بلکہ اس بات کا عزم
مصمم کر کے ان پر عمل پیرا ہو کہ وہ اپنے ماحول کو جو بری حالت میں ہے بہتر حالت میں تبدیل کردیگا
چاہے ایسی صورت میں اس کو ترقی کا کوئی موقع نظر نہ آئے اور اس کا مستقبل اس کو تاریک ہی
کیوں نہ دکھائی دے اس کو چاہئے کہ وہ آلیور کرامویل کے ان الفاظ کو یاد رکھے یعنی "کوئی
شخص اتنی رفعت حاصل نہیں کرسکتا جیسا کہ وہ شخص حاصل کرسکتا ہے جس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ
وہ کدھر جا رہا ہے۔

بطور جملۂ معترضہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اگر آپ بیرونی دنیا اور اس کے حقوق
کے تسلیم کرنے کی جانب بے توجہی کا اظہار کریں گے تو یہ آپ ہی کے حق میں مضر ہوگا۔ اس دنیا
میں انسانی قوتوں کے باہمی تعلقات کا سمجھنا مشکل ہے ان قوتوں میں قوت آلہی کام کر رہی ہے
کیونکہ وہ خدا ہی کے بنائے ہوئے طریقے ہیں۔ وہ خدائے تعالیٰ کی جانب سے ہدایات ہیں اور
اسی کی دانش کے مظاہر ہیں۔ نظر حقیقت سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ منشاء ایزدی یہی تھا۔
کہ ہم متحدہ کوشش کے ساتھ مخالف موجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے انہیں طریقوں کی وساطت سے
ترقی کے زینے پر پہنچیں اور یہ کہ ہماری منفردانہ ترقی محض اسی وقت ظہور پذیر ہوگی جب ہم مخالف
قوتوں کو بتدریج زیر کرتے جائیں۔ اسی کو علمائے سائنس کی اصطلاح میں ارتقا کے نام سے
تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں تمہاری ناراضگی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ تم سے کم قابلیت رکھنے والے
لوگ تمہارے حقوق کو غضب کر رہے ہیں تو تمہاری یہ ناراضگی حق بجانب ہے جہاں تم ان
باہر سے آنے والے لوگوں کے ہارج و مزاحم ہوتے ہو۔ جن کی قابلیت تمہارے لئے ایک
نمونہ ہے تو یقیناً تمہارا یہ طرز عمل درست نہیں ہے تمہاری مشکلات کی وجہ یہی ہے کہ تم ابھی تاریکی
میں ہو تم اس حقیقت کو بھولے ہوئے ہو کہ گو حیدرآباد کو اب پہلے سے بہت زیادہ شہرت
حاصل ہو چکی ہے اور گو ہم میں یہاں بہت سی چھپی ہوی قابل ہستیاں موجود ہیں تاہم اب
تک ہم دنیا سے بہت کچھ الگ تھلگ ہیں اور میدان عمل میں مسابقت کے لئے بہت کم تیار
ہیں۔ یہ بیرونی دنیا ہمارے لئے ضروری ہے یہی وہ ہے جس پر نہ صرف ہماری ترقی بلکہ

ہماری بقا کا بھی دار و مدار ہے اگر تم اس کو محسوس نہیں کرتے تو واقعات خود تمہیں محسوس کرنے پر مجبور کر دیں گے جس سے خود بخود تمہاری تشفی ہو جائے گی اور چونکہ ہم میں سے اکثر افراد کے لئے بلحاظ صحت جسمانی یہ ناممکن ہے کہ عرصہ دراز تک بیرونی دنیا سے فوائد حاصل کرنے کی غرض سے وہاں رہیں لہذا ہمیشہ ہم کو اس بات کی ضرورت لاحق ہوتی رہے گی کہ جن عملی سرگرمیوں اور اعلیٰ مقاصد میں ابھی ہم حصہ لینے کے قابل ہیں اور نہ عرصۂ دراز تک ہو سکیں گے تو عملی سرگرمیوں اور اعلیٰ مقاصد کے نمایندوں کو اپنے ملک میں بلائیں اور ان کا خیرمقدم منائیں۔ ان میں حصہ لینے کے مستحق ہم محض اس جان توڑ محنت کے ذریعہ ہو سکتے ہیں جو آپ اساتذہ صاحبان ہی کا حصہ ہے اور جس سے بتائیدایزدی آپ ہی اچھی طرح کام لے سکتے ہیں

میں نے جو باتیں آپ سے کہی ہیں اس سے میرا مطلب آپ کی خوشامدانہ طور پر ہمت افزائی کرنا نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی حیثیت اور فرض منصبی اور ان مواقع کو جو ان کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں آپ کے روبرو واضح طور پر پیش کرنا ہے میں آپ کو یہ محسوس کرانا چاہتا ہوں کہ گو آپ کی مشکلات اور مایوسیاں بہت زیادہ ہیں لیکن دوسرے بھی ان سے ناواقف نہیں ہیں اور ایسی ہی مشکلات انھیں بھی درپیش ہوتی ہیں۔ اگرچہ آپ کو اس کا علم نہیں ہے سب سے بڑھ کر میں آپ کو یہ بات محسوس کروانا چاہتا ہوں کہ گو آپ یہ سمجھتے ہوں گے کہ عزیز بچوں کی تعلیم و تربیت کی بڑی ذمہ داری آپ کے سپرد کی گئی ہے تاہم آپ کو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ آپ کی تعلیم مکمل ہے۔ جب آپ اپنے ملک سے باہر جاتے ہیں تو آپ کی تعلیم کا جو حصہ سخت ترین ہوتا ہے وہ ابتدا ہی کا ہوتا ہے۔ آپ کو نہایت ہی سرگرمی سے کام کرنا بہت زیادہ پڑھنا بہت کچھ محنت کرنی اور ان چیزوں کو جن کے متعلق آپ کا خیال ہے کہ آپ سے متعلق نہیں ہیں سمجھنا پڑھتا ہے۔

اسی بات کو مدنظر رکھکر سوچو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ آپ میں سے بعض افراد دیہات میں رہنے کو جو ایک قسم کی دوری اور جلا وطنی سمجھتے ہیں۔ دراصل ایسا نہیں ہے بلکہ یہی دوری اور جلا وطنی شہر کی زندگی سے جہاں انسان کے وقت اور صحت و توانائی کو زائل کرنے کی بہت سی ترغیبات موجود ہیں بدرجہا زیادہ کام کرنے کا موقع بہم پہونچاتی ہے چنانچہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "تم دنیا میں رہکر اپنے آپ کو دنیوی ترغیبات سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ جیسا کہ تم پانی میں جاکر بغیر بھیگے ہوئے نہیں نکل سکتے" آپ کو ایک مختلف

دنیا میں دعوت عمل دی گئی ہے وہ بچوں کی پاک دنیا ہے۔ جہاں آپ ان کی معصومیت، ان کی محنت اور محبت کی خواہش اور ان کی نہ صرف ہونے والی قوت سے جو آپ کو سب غلطیوں سے بڑا عطیہ یعنے خوشی اور طمانیت بخشتی ہے دو چار ہوتے ہیں۔

اگر آپ ان بچوں کی صحبت میں جن کو آپ پڑھا رہے ہیں کوئی مسرت حاصل نہیں کر سکتے تو مجھے صاف الفاظ میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی تعلیم غلط اصول پر ہو رہی ہے۔ اگر ان سب امور کے باوجود بھی دنیا آپ کی بہت کچھ مخالف ہے تو میں آپ کی ہمت مردانہ سے اپیل کرتا اور یہ نصیحت کرتا ہوں کہ آپ اپنے آپ کو واجب الرحم ظاہر کرنے سے اسی طرح بچیں جیسا کہ طاعون سے بچتے ہیں۔ اپنے دل میں مایوسی کا شائبہ تک نہ پیدا ہونے دیں اور اُس عدیم المثال جوش سے اپنے آپ کو کام کے لئے وقف کر دیں جس کا ذکر شاعر شیلے نے اپنے ان ہمیشہ یاد رہنے والے الفاظ میں کیا ہے وہ کہتا ہے:۔

اُن غم و آلام کا سہنا جن کو امید بے پایاں سمجھتی ہے۔
اُن غلطیوں کا معاف کرنا جو موت اور رات سے زیادہ تاریک ہیں۔
اس طاقت سے مقابلہ کرنا جو زبردست نظر آتی ہے۔
محبت کرنا اور مصائب برداشت کرنا اور اس وقت تک امید کے دامن کو ہاتھ سے نہ دینا۔
جب تک کہ اسی امید شکستہ سے وہ چیز برآمد نہ ہو جو اس کا مدعا ہے۔
ارادہ کو نہ بدلنا جادہ استقلال پر قائم رہنا اور پشیمان نہ ہونا۔
یہی وہ باتیں ہیں جن سے عظمت، اچھائی خوشی اور خوش اسلوبی حاصل ہوتی ہے۔
صرف یہی ہے زندگی، خوشی، سلطنت وحکومت اور فتح ونصرت!!

(مترجمہ سید اللہ بخش بی۔ اے۔ بی ٹی)۔

طلبہ و علمائے ماضی و حال

از محمد حسام الدین فاضل ادیب و مولوی فاضل بہ کانفرنس اساتذہ منعقدہ ۵؍ آبان سنہ ۱۳۴۲ف

معزز صدر نشین صاحب و حضرات کرام۔ طلبہ و علمائے ماضی و حال پر میری تقریر کا یہ مقصد نہیں کہ گذشتہ علما کے فضائل و محامد کا اظہار کیا جائے اور موجودہ زمانے کے اہل علم طبقے کے معائب و نقائص بیان کر کے اس معزز جماعت کی تنقیص کیجائے۔ میں مشرقی و مغربی تعلیم یافتہ اصحاب میں باہمی منافرت کو قوم کی بدقسمتی سمجھتا ہوں مجھے انگریزی میں مہارت نہیں ہے۔ اس لئے میرے دل میں انگریزی دان صاحبین کی وہی عظمت ہے جو ایک نادان کے دل میں علما کی ہونی چاہئے۔

حضرات جو کچھ یہاں عرض کیا جائے گا۔ وہ آپ کی اصلاح کی غرض سے نہیں بلکہ صرف اس لئے کہ آپ باعتبار علم و فضل قوم کے نمائندے ہیں اور ہونہار طلبا آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتے ہیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت سے مستفیض ہوتے ہیں۔ پس جو کچھ آپ کے گوش حق نیوش تک پہونچا دیا جائے گا۔ اس کی عزت و غائت صرف یہ ہے کہ وہ طلبا تک آسانی سے پہنچ جائے اور طلبہ گذشتہ طلبہ کے حال سے ایام طالب علمی میں سبق آموز ہوں۔ اور تحصیل علم کے بعد علمائے کرام کے اعلی صفات سے متصف رہیں۔

شوق علم و طلب صادق

حضرات اس جدید تہذیب و شائستگی کے زمانے میں بھی کنڈرگارٹن اصول پر تعلیم دیجا رہی ہے۔ اس میں بھی جس طرح کل کے مظاہرہ میں آپ نے ملاحظہ فرمایا استاد کا نقشہ خوردسال بچوں کے ذہن میں یہی جما دیا گیا ہے کہ وہ آنکھیں نکال کے ڈرا دینے والا اور بار بار بید بتانے والا ہے باوجود استاد کا تصور اس قدر خوفناک ہونے کے خدا جانے گذشتہ زمانے کے اساتذہ میں کیا کشش تھی کہ طلبہ استادوں کے والہ و شیدا رہتے تھے۔ چنانچہ امام اسمٰعیل نے سترہ برس کی عمر میں جب محمد بن ایوب رازی کی خبر وفات سنی تو روئے پیٹے۔ کپڑے پھاڑ ڈالے اور سر پر خاک ڈالی۔ ان کی پریشانی دیکھکر سارے

گھروالے جمع ہوگئے اور پوچھا کہ خیر ہے کیا حال ہے انہوں نے کہا کہ تم لوگ مجھکو سفر کرنے سے روکتے رہے آخر محمد ایوب وفات پاگئے اب میں ان کو کہاں پاؤں گا۔ گھروالوں نے انھیں تسلی دی اور انتظام کر کے ماموں کے ہمراہ شہر نسا کو ایک دوسرے شیخ وقت ابن سفیان کی خدمت میں بھیجدیا۔

اگلے زمانے کے طلبہ کو شوق اس حد تک تھا کہ سخت ترین افلاس و مصیبت میں بھی وہ تحصیل علم سے کنارہ کش نہ ہوتے۔ حافظ الحدیث حجاج بغدادی شبابہ کے یہاں تحصیل علم کو جانے لگے تو ان کے مقدرت کی کل کائنات یہ تھی کہ ان کی دلسوز والدہ نے سو کلچے پکا دے جن کو وہ ایک گھڑے میں بھر کر ساتھ لے گئے۔ روٹیاں مہربان ماں نے پکا دیں سالن ہونہار اور صابر فرزند نے خود تجویز کر لیا یعنے دجلے کا پانی۔ حجاج ہر روز ایک روٹی دجلے کے پانی میں بھگو کر کھالیتے۔ اور استاد سے پڑھتے جس روز وہ روٹیاں ختم ہوگئیں ان کو استاد کا فیض بخش دروازہ چھوڑنا پڑا۔

امام بخاری کو ایام طالب علمی میں ایک سفر میں تہیدستی نے اتنا مجبور کیا کہ تین دن برابر انہوں نے جنگل کی جڑی بوٹیاں کھالیں۔ حکیم ابو نصر فارابی عہد طالب علمی میں ایک سفر میں مفلسی کی بدولت چراغ کا تیل خریدنے سے بھی معذور تھا رات کو پاسبانوں کی روشنی میں کتاب کا مطالعہ کرتا اسی تنگ حالی میں اس نے وہ علمی ترقی کی کہ سارے جہان میں اپنا نام روشن کر دیا۔

آج مدارس عام میں غریب سے غریب طالب علم بھی اتنا مفلس نہیں ہے غربا کے لئے سرکار عالی سے وظائف مقرر ہیں مگر تحصیل علم و تکمیل فضل کا حقیقی شوق معقود سا نظر آتا ہے۔

گذشتہ طلبہ کے ذوق علم کا یہ حال تھا کہ حضرت یحییٰ ناقل ہوطا مدینہ منورہ میں ایک روز امام مالک رحہ کے درس میں حاضر تھے کہ غوغا اٹھا کہ ہاتھی آیا۔ عرب میں ہاتھی عجوبہ چیز ہے لوگ ہاتھی کو دیکھ رہے ہیں مگر یحییٰ اسی طرح اطمینان سے بیٹھے ہوے ہیں۔ امام مالک نے فرمایا کہ یحییٰ تمہارے ملک اندلس میں ہاتھی نہیں ہوتا تم بھی جاکر دیکھ آؤ۔ جواب دیا کہ حضرت اندلس سے میں آپ کو دیکھنے اور علم سیکھنے آیا ہوں ہاتھی دیکھنے کے واسطے بےخان و مان نہیں ہوا۔

ہمارے طلبہ کے شوق و انہماک کا یہ عالم ہے کہ ذراسی آہٹ پر ان کے خیالات منتشر ہو جاتے ہیں۔ اور معمولی معمولی ضروریات اور غیر ضروری دعوتیں۔ ان کو تحصیل علم اور حضوری مدرسہ سے روکنے کے لئے کافی ہیں۔

مطالعہ مطالعہ کا زمانۂ ماضی کے طلبا رکو اتنا شوق تھا کہ ایک ایک کتاب کو سو سو مرتبہ مطالعہ کر لیتے۔ ابو نصر فارابی نے ارسطو کی کتاب النفس کو سو مرتبہ پڑھا تھا۔ آج سو سو مرتبہ ایک ایک کتاب کا پڑھنا تو کجا درسی کتاب کا بھی کچھ حصہ ہمیشہ کے لئے مطالعہ سے محروم رہ جاتا ہے طلبہ کے پاس بعض کتابیں ایسی بھی دیکھی گئیں کہ تعلیمی سال ختم ہو گیا۔ مگر نئی کتاب کے بعض اوراق چاک بھی نہیں کئے گئے۔

حفظ و استحضار علمی امام ابو عیسیٰ ترمذی مصنف جامع ترمذی نے ایک دفعہ دو جزو ایک شیخ کے روایت کردہ احادیث کے لکھے تھے حسن اتفاق سے اس عرصے میں خود وہ شیخ انہیں مل گئے جن سے احادیث مذکورہ کی اجازت طلب کی اور شیخ نے ان کی استدعا قبول فرمائی۔ اور ان احادیث کو سنانا شروع کر دیا۔ درخواست کرتے وقت ابو عیسیٰ کو خیال تھا کہ مذکورۂ بالا دونوں جزو ان کے پاس ہیں۔ اب جو دیکھا تو بجائے ان کے دو سادے جزو انھوں نے غلطی سے اپنے پاس رکھ لئے تھے۔ اب سوا اس کے کچھ نہ بن پڑا کہ وہی سادے جزو ہاتھ میں لے کر شیخ کی حدیث سننے لگے سوء اتفاق سے شیخ کی نظر ان اوراق پر پڑ گئی اور انھوں نے بگڑ کر کہا کہ تمھیں شرم نہیں آتی انھوں نے اصلی ماجرا بیان کیا اور کہا کہ جو حدیث آپ سناتے ہیں وہ مجھکو یاد ہوتی جاتی ہیں۔ شیخ کو ان کے قول کا اعتبار نہ آیا اور فرمایا سناؤ۔ انھوں نے سب سنی ہوئی حدیثیں لفظ بہ لفظ سنا دیں۔ ان کا شبہ اب بھی نہ گیا اور کہا کہ شاید یہ حدیثیں میرے سنانے سے پہلے تم حفظ کر چکے تھے۔ اور نئی حدیثیں بطور امتحان روایت فرمائے۔ چنانچہ چالیس حدیثیں انھوں نے سنائیں ان کو بھی ابو عیسیٰ نے فوراً دہرایا اور ایک بھی غلطی نہیں کی۔

جب حسن ابن سہل وزیر خلیفہ مامون الرشید عراق میں آیا تو اس نے علمائے ادب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب ایمار اصمعی۔ ابو عبیدہ۔ ابو بکر نحوی بارگاہ وزارت میں حاضر ہوئے ان سے مخاطب ہونے سے پیشتر وزیر نے ان عرائض پر فیصلے لکھوائے جو اہل حاجت کی اس کے سامنے پیش کی گئیں جب ان عرضیوں پر جو شمار میں پچاس تھیں دستخط کر چکا تو ان ادبا کی طرف متوجہ ہو کر معذرت کی اور سلسلہ کلام شروع کیا۔ اثنار کلام میں ان علمائے گذشتہ کا ذکر ہوا جن کی قوت حافظہ مشہور تھی۔ اور امام زہری اور قتادی کا ذکر ہونے لگا۔ ابو عبیدہ نے کہا اس وقت یہاں ایسا شخص موجود ہے کہ کبھی کتاب کو ایک بار پڑھ کر دوبارہ دیکھنے کی

اس کو حاجت نہیں ہوتی۔ یہ سنکر اصمعی نے کہا کہ یہ میری طرف اشارہ ہے۔ اس دعوی کو میں اس طرح ثابت کر سکتا ہوں کہ وزارت مآب نے اس وقت جتنے عرائض سنے ہیں اور ان پر فیصلے لکھے ہیں ان سب کا خلاصہ مضمون اور فیصلوں کی اصل عبارت سنا دوں وزیر کے حکم سے کل عرضیاں واپس اگر پیش ہوئیں۔ اصمعی نے بیان کرنا شروع کیا کہ فلاں عرضی کے پیش کنندہ کا یہ نام اور یہ کام اور یہ فیصلہ اس پر ہوا۔ اسی طرح وہ نادرۂ روزگار بیان کرتا گیا۔ جب کچھ اوپر چالیس عرضیوں کی نوبت پہنچی تو حاضرین میں سے ابو نصر نے کہا کہ اصمعی خدا کے لئے اپنی جان پر رحم کر دکہیں نظر نہ لگجائے۔ یہ سنکر وہ جھینپتا ہوا ابلبل خاموش ہوگیا۔

گذشتہ طلبا و علما کی قوت حافظہ کی ایک دو مثالیں آپ نے سن لیں اب آجکل کے استحضار علمی کی کیفیت ملاحظہ ہو۔ میں کرایہ کی موٹر میں حیدرآباد سے کچھ دور جا رہا تھا۔ راستے میں میرے بچے نے کہا ابا جان گھر سے نکلتے وقت (۳۴ میل (۶) فرلانگ ہوئے تھے۔ تو میرے ہمراہیوں میں سے ایک نے پوچھا کہ میل کتنے فرلانگ کا ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں باقی دو ساتھیوں میں سے ایک جو میٹرک میں زیر تعلیم تھے کہنے لگے دو فرلانگ کا ایک میل ہوتا ہے۔ تو دوسرے صاحب جو مڈل تک پڑھ چکے تھے فرماتے ہیں نہیں بلکہ تین میل کا ایک فرلانگ ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہمارے اگلے علما کا ایک دور تھا جب کتاب کا وجود بھی نہ تھا۔ جو کچھ اساتذہ سے پڑھتے اور سیکھتے اسی کو حافظہ پر ثبت کرتے اسی لئے جیسے اساتذہ فن تعلیم کے اس روشن زمانے نے پیدا کئے وہ کتاب خوانی کے طریقہ سے پیدا نہ ہوسکے۔ متاخرین کے پاس سرمایۂ فخر حاشیہ و شرح نویسی ہے۔ برخلاف متقدمین کے کہ وہ مجتہدانہ قوت پر ناز کرتے تھے۔ غور کرنے سے متقدمین کی قوت علمیہ کو ان کے تین ذرائع سے بہت مدد ملتی تھی۔

۱ حفظ (۲) کتابوں کا اپنے ہاتھ سے لکھنا (۳) کثرت مطالعہ متاخرین سے رفتہ رفتہ یہ سب سلب ہوگئے۔ حفظ کو کتابوں کی تصنیف نے باطل کر دیا۔ اور تحریر کتابوں کی کثرت سے فضول ہوگئی۔ اور مطبعوں کی وجہ سے کتابوں کا نقل کرنا تضیع اوقات سمجھا جانے لگا ایک مطالعہ باقی تھا تو ہمارے زمانے کی شرح و نوٹ نویسی نے اس کو بھی غارت کر دیا۔ ادھر کوئی کتاب لکھی گئی یا داخل نصاب ہوی کہ اس کی شرح تیار ہوگئی تاکہ شارحین کو کچھ مالی فائدہ ہوجائے نتیجہ یہ ہے کہ طلبا ان کتابوں کو خرید کر نہ مطالعہ کی محنت شاقہ اٹھاتے ہیں۔ نہ اساتذہ کی تقریر کو پورے طور سے قابو میں کرتے ہیں۔ اس اعتماد نے کہ ہماری کتابوں میں سب کچھ لکھا ہوا ہے۔

جب ضرورت ہوگی دیکھ لیں گے۔ دماغی قوت کو بالکل بیکار کر دیا

کتابوں کا لکھنا گذشتہ زمانے کے طلبہ کے دلوں میں کتاب کی قدر و منزلت کتاب لکھنے کا شوق بدرجہ اتم موجود تھا۔ شیخ الفقہا امام برقانی جب اسفراین پڑھنے گئے تو ان کے پاس تین اشرفیاں اور ایک درہم تھا سو ءِ اتفاق سے اشرفیاں گم ہوگئیں درم باقی رہ گیا۔ اسفراین پہنچکر وہ درہم انہوں نے ایک نان بائی کے یہاں جمع کر دیا۔ ہر روز نان بائی کے پاس سے دو روٹیاں لے لیتے اور احمد بن بشیر کے پاس سے ایک جزو کتاب لاکر شام تک نقل کرتے اور شام کو نقل شدہ جزو واپس پہنچا دیتے۔ تیس جز نقل ہوے تھے کہ درہم ختم ہوگیا اور انہوں نے مجبور ہوکر سفر اختیار کیا۔ آج بھی طالب علم ہیں مگر کتابوں کا اپنے ہاتھوں سے لکھنا تو درکنار چند ٹکوں میں کتاب کا خریدنا بھی بار ہے کبھی تعلیمی سال کے مہینوں گذر جاتے ہیں۔ طالب علم کتاب خریدتا ہی نہیں اور جو کتابیں خریدی جاچکیں ہیں ان کا عجیب حال رہتا ہے ان کی جلد بندی ہے نہ اور کوئی حفاظت برسوں ہی ایک طالب علم کی کتاب کے اوراق چاک شدہ دیکھکر میں نے اس سے کہا کہ تمہاری ایک انگلی یا ٹوپی کے پھندنے کی سی قدر و منزلت بھی کتاب کی نہیں یہ کیا غضب ہے کہ انگلی زخمی ہو تو فوراً مرہم پٹی کیجائے۔ پھندنا ناقص ہو تو اسی وقت نیا خرید لیا جائے اور کتاب ردی ہوتی جاتی ہے تو اس کو درست کرنے کا خیال تک نہیں۔

سفر تحصیل علم کے شوق میں پہلے کے طلبہ سفر کی ناقابل برداشت مصیبتیں اٹھایا کرتے۔ امام بخاریؒ نے چودہ برس کی عمر میں سیاحت شروع کر دی تھی بخارا سے لیکر مصر تک تمام ممالک اس عالی مقام امام کے سفر کی فہرست میں ہیں۔ ابو حاتم رازی نے نو ہزار میل سے زیادہ پیادہ پا سفر کیا۔ یہ ان کی سیاحت کی انتہا نہیں بلکہ شمار کی حد ہے کیونکہ امام ممدوح نے اس کے بعد میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا۔

مادر زاد نابینا حافظ الحدیث ابو العباس رازی نے حدیث حاصل کرنے کے لیے بلخ بخارا نیشاپور۔ بغداد کا سفر کیا۔ آج اگر سیکل پر کوئی سفر کرتا ہے تو قدر و منزلت کے آسمان پر پہنچا دیا جاتا ہے اور طلبا کے لئے سفر کی یہ مشقتیں اٹھانا رہا ایک طرف اگر کسی دن سیکل ناقص ہوجائے تو مدرسے کی غیر حاضری منظور مگر گھر سے مدرسے تک پیدل آنا نا ممکن۔

علمی حمیت اگلے زمانے کے طالب علموں کی صرف ایک علمی غلطی ان کے لئے تحصیل کمال کا ذریعہ ہوجاتی اور ان کی خودداری اس کی اجازت نہ دیتی کہ وہ اپنی غلطی

کیوجہ سے کسی مجلس علم میں شرمندہ ہوں۔ فن ادب کے مشہور امام کسائی ایک مجلس علما میں اکثر جایا کرتے تھے۔ ایک دن جو وہاں پہنچے تو بہت خستہ ہوگئے تھے اپنی خستگی ظاہر کرنے کیلئے انہوں نے کہا کہ عیّیت (بالتشدید) یعنے میں تھک گیا۔ اہل مجلس نے ٹوکا کہ تم غلط لفظ استعمال کررہے ہو اس لئے کہ اگر تمہاری مراد ماندگی ہے تو اعیت کہو اور اگر درماندگی کا اظہار مقصود ہے تو لفظ عییت (بالتخفیف) استعمال کرو۔ کسائی کے دل پر اس اعتراض سے ایک چوٹ لگی اور فوراً مجلس سے باہر نکل آئے اور دل میں تہیہ کر لیا کہ اس فن میں کمال حاصل کرنا چاہئے تاکہ پھر آئندہ ایسی خفت کسی محفل میں حاصل نہ ہو۔ یہ عزم کرکے کسائی فن ادب کے استاد یگانہ خلیل بصری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے ادب عربی کی تحصیل کرنے کے بعد شہر چھوڑ کر صحرا کی راہ لی قبیلہ در قبیلہ اتنے پھرے کہ اس فن کے امام بن گئے جس کے نہ جاننے سے شرمندہ ہونا پڑا تھا۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگلے طلبہ کی علمی حمیت کیسی حسّاس تھی جس کے جوش میں لانے کے لئے ادنیٰ تحریک کافی ہوتی تھی آج مجمع عام میں سو سو غلطیوں پر بھی ندامت کا نام نہیں ایک ایک امتحاں میں سات سات سال تک طلبہ ناکام ہوتے جاتے ہیں پھر ان کی غیرت و حمیت پر کچھ بھی اثر معلوم نہیں ہوتا۔

علم سے سیر نہ ہونا علاّمہ ابن العلا سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ آدمی کو علم کب تک حاصل کرنا چاہئے اس عالی دماغ نے جواب میں کہا کہ جب تک حیات مہربان رہے اسی لئے پہلے کے علما علم سے کبھی سیر نہ ہوتے تھے۔ امام ادب ابوالعباس ثعلب کی عمر اکانوے برس کی ہوچکی تھی کہ ایک دن جمعہ کے بعد مسجد سے جانے لگے۔ راستے میں کتاب دیکھتے جاتے تھے۔ کتاب میں محویت اور اس پر ثقل سماعت پھر وہ آواز کیا سنتے ایک گھوڑے کا دھکا لگا اور اس کے صدمے سے بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑے اور اسی حالت میں رحلت کی۔ انتہاے پیری میں بھی ان کا شوق طلب اتنا قوی تھا کہ رہ نوردی میں جو وقت گذرتا اس کا جاتا رہنا بھی گوارا نہوا۔

اب طالب علموں کی حالت یہ ہے کہ مطالعہ اسباق بھی بار خاطر ہے عین امتحان کے قریب گذشتہ اسباق کا بعجلت ممکنہ مطالعہ یا اعادہ ہوجاتا ہے۔ رہ نوردی کے وقت کو کام میں لانا تو رہا ایک طرف اپنے گھر میں چین سے بیٹھے ہوے مطالعہ ناپسند ہے گذشتہ زمانہ میں عام لوگوں میں شوق علم اس درجہ تھا کہ ایک ایک مجلس علم میں ہزاروں کا مجمع رہتا تھا۔

امام عاصم میدان میں ایک کھجور کے درخت کے سہارے املاء حدیث فرماتے۔ خلیفہ معتصم باللہ نے شرکا کا اندازہ اپنے معتمد سے کرایا تو ایک لاکھ بیس ہزار تعداد تھی (۱۲۰۰۰۰)۔ میدان کی پیمائش اور دواتوں کی گنتی سے یہ اندازہ کیا جاتا تھا ہزاروں طلبہ پر ایک استاد ضبط قائم رکھتا۔ آج جماعت میں چالیس سے زیادہ طالب علم ہو جائیں تو تنظیم ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اساتذہ کا احترام اگلے زمانے کے طلبہ اپنے اساتذہ کے احترام و ادب میں اپنی آپ نظیر تھے حضرت امام اعظم نے جبتک آپ کے استاد حماد زندہ رہے ان کے گھر کی طرف پاؤں بھی دراز نہ کیا

آج استاد صاحب کے ادب کا یہ حال ہے کہ ایک مدرسے میں جماعت کا رجسٹر حاضری گم ہوگیا۔ استاد نے طلبہ سے کہا تمہیں لوگوں میں سے کسی نے لیا ہوگا۔ وہ تو خیر گذری کہ رجسٹر مل گیا ور طلبہ نے آپس میں طے کرلیا تھا کہ استاد پر ہتک حرمت کے الزام میں فوجداری کردی جائے۔

جہاں پہلے طلبہ اساتذہ کا یہ احترام کرتے تھے اساتذہ کی بھی حق پسندی بے مثال تھی ایام طالب علمی میں ایک روز امام دارقطنی ابن انباری کی مجلس درس میں شریک ہوئے دوران املا میں ابن انباری نے ایک نام میں غلطی کی دارقطنی کو اتنی تو جسارت نہوئی کہ ابن انباری کو تنبیہ کرتے مگر مستملی کو وہ جتادی۔ جب دوسرے جمعہ کو دارقطنی پھر مجلس مذکور میں گئے تو ابن انباری نے اعلان فرمایا کہ ہم نے اس روز فلاں نام میں غلطی کی تھی اس نوجوان نے ہمکو اس غلطی پر آگاہ کردیا۔

جوش حق پسندی اس کو کہتے ہیں اگر ابن انباری اس راز کو فاش نہ کرتے تو شاید دنیا کو اس کی خبر بھی نہوتی۔ مگر انہوں نے یہ خیال فرمایا کہ اپنی ایک خطا ظاہر ہو جائے تو مضائقہ نہیں لیکن نوجوان طالب علم دل بڑھائے جانے کا مستحق ہے ان کی حق تلفی نہ ہونی چاہئے۔ آج اگر کوئی طالب علم اپنے استاد کی صریح غلطی پر آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو استاد صاحب بجائے قائل ہونے کے اس کو اپنی توہین خیال کرتے ہیں اور طالب علم معتوب ہو جاتا ہے۔

دیانت و راست گوئی دیانت و راست گوئی میں گذشتہ زمانے کے علماء کا یہ حال تھا کہ ابو غالب لغوی نے جب اپنی کتاب فن لغت میں تصنیف کی تو امیر مجاہد مرسیہ کے اقتدار زمانہ والے نے اپنے ایک معتمد کے ہاتھ ایک ہزار اشرفیاں ان کے پاس بھیجیں اور یہ فرمائش کی کتاب مذکور کے دیباچے میں یہ الفاظ درج کردیں کہ اس کتاب کو ابو غالب نے امیر مجاہد کے لئے

تصنیف کیا ہے ابو غالب نے عطیہ شاہی واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ اگر ساری دنیا مجکو دیجائے تو بھی میں جھوٹ بولنا روا نہ سمجھوں گا میں نے یہ کتاب خاص کر امیر کے واسطے تالیف نہیں کی بلکہ عام نفع کے خیال سے لکھی ہے۔

اب طالب علموں کی دروغ بیانیاں اظہر من الشمس ہیں اچھے خاصے رہکر بیماری کے نام سے درخواست رخصت والد و سرپرست کے نام سے اپنے یا کسی دوست کے قلم سے تصدیق طلبہ کے نزدیک معمولی چیزیں ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ کو ایک دفعہ حاکم کوفہ نے یہ حکم دیا تھا کہ ابو حنیفہ فتویٰ نہ دیا کریں چنانچہ امام صاحب نے فتویٰ دینا چھوڑ دیا تھا۔ اس عرصہ میں ایک دن امام ممدوح گھر میں تشریف رکھتے تھے آپ کی صاحبزادی نے روزے کے متعلق ایک مسئلہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹا یہ مسئلہ اپنے بھائی حماد سے پوچھ لو مجھکو حاکم کی طرف سے فتوی دینے کی ممانعت ہے اس لئے میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

کیا اس سے بڑھکر حق پرستی اور اطاعت حاکم کی مثال ہوسکتی ہے۔ آج جماعت میں استاد کی موجودگی اور عدم موجودگی اور عہدہ دار کے سامنے رہنے اور نہ رہنے کی اوقات کا باہمی فرق کھلے طور پر محسوس ہوتا ہے حضرت عمر بن عبد العزیز رح جو نہ صرف با شوکت بادشاہ بلکہ جید عالم بھی تھے سرکاری مثلیں دیکھ رہے تھے کہ آپ کا غلام آکر خانگی حالات کہنے لگا۔ آپ نے چراغ خاموش کر دیا کہ سرکاری رقم کے تیل کی روشنی میں گھر کے حالات سننے کا مجھے حق نہیں۔

آج جماعتوں میں سے کتابوں کا مدرسوں میں سے سیکلوں کا چوری جانا معمولی کام ہے۔

قناعت

قناعت وخودداری میں گذشتہ علماء کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ امیر سلیمان بن علی نے اہواز سے ایک قاصد امام ادب خلیل بصری کے پاس بھیجا۔ اور ان کو امیرزادے کی تعلیم کے لئے طلب کیا۔ ایلچی کی خبر پاکر وہ ادیب بے مثل باہر آیا خشک روٹی کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں تھا وہ ٹکڑا قاصد کو دیا اور کہا کہ لو میرے پاس تو یہی ہے اور یہ جبتک موجود ہے خلیل کو سلیمان کی پروا نہیں۔

موجودہ زمانے میں اہل علم کی عدم قناعت۔ ملازمت کے لئے پریشانی۔ عہدہ داروں کے در دولت کی حاضری جیسی کچھ ہے۔ حرص کا جو کچھ عالم ہے۔ محتاج بیان نہیں۔

اپنا کام آپ انجام دینا

تعلیم سے غرض کسر نفسی وجفاکشی بھی ہے جب میں اپنا کام آپ

انجام دینا بھی شامل ہے۔

امام بخاری نے شہر بخارا کے باہر ایک مہمان سرا بنوائی تھی۔ اس کی تعمیر کے وقت جو مزدور معماروں کو اینٹیں پہونچاتے تھے ان میں خود امام بخاری بھی شامل تھے۔ یہ امام ربانی اپنے سر پر اینٹیں رکھکر لے جاتے اور معماروں کو دیتے۔ ایک شاگرد نے از راہ دلسوزی ایک روز عرض کیا کہ آپ کو اس محنت کی کیا ضرورت ہے امام ممدوح نے فرمایا۔ یہ وہ کام ہے جو مجھے نفع دے گا۔

ابوالاسود دؤلی واضع فن نحو پر اخیر عمر میں فالج گرا تھا اور اس کے اثر سے ان کے ہاتھ پاؤں مؤف ہو گئے تھے اس معذوری کی حالت میں بھی وہ ہر روز گھسیٹتے ہوئے بازار کو جاتے اور اپنا کام انجام دیتے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ضرورت ان کو اس تکلیف پر مجبور کرتی تھی۔ کیونکہ ابوالاسود بہت آسودہ تھے اور بہت سے خادم ان کی سرکار میں حاضر رہتے ایک روز کسی نے از راہ تعجب کہا کہ اس قدر خادموں کے ہوتے یہ شاقہ مصیبت ہر روز کیوں برداشت کرتے ہیں اس ادیب نے یہ بے مثل جواب دیا کہ بات یہ ہے آمد و شد میں یہ نفع بھی ہے کہ جب میں گھر میں لوٹ کر آتا ہوں تو لڑکے بھی کہتے ہیں کہ آ گئے لونڈیاں بھی کہتی ہیں کہ آ گئے۔ اگر میں گھر میں پاشکستہ ہو کر پڑا رہوں تو کوئی پوچھکر بھی نہ دیکھے گا۔ پہلے علمار کی اس کیفیت کے ساتھ آج کل کے بعض تعلیم یافتگان کا مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو تعلیم کے بعد عموماً ان کی ذہنیت کچھ عجیب ہو جاتی ہے کہ اپنا کام آپ انجام دینا وہ اپنے علم کی توہین سمجھتے ہیں۔

ایک طالب علم نل پر صراحی میں پانی بھرنے میں مصروف تھا اتفاقاً میرا گذر ادھر سے ہوا۔ جیسے ہی مجھپر اس کی نظر پڑی صراحی نل کے پاس چھوڑکر اس طرح وہاں بھاگ نکلا جسطرح ایک مجرم فرار ہو جاتا ہے

ورزش جسمانی

ورزش جسمانی کے متعلق آج کل دو مختلف خیالات ہیں نئی روشنی کے لوگ تو اسکو ترقی جدید کا ایک جلوہ اور تعلیم علوم کے برابر ورزش کو بھی مہتم بالشان سمجھ رہے ہیں پرانی فیشن کے بزرگ اس کو لہو لعب اور متانت کے خلاف تصور فرما رہے ہیں حقیقت یہ ہے دونوں خیال واقعیت سے دور ہیں اہل علم میں جسمانی ریاضت کا اہتمام نہ تہذیب جدید کا نتیجہ ہے نہ خلاف متانت و وقار۔ صدہا برس گذرے جب یہی ہمارے علمار مردانہ ورزشوں کے پابند تھے علمار کے حالات ایک طرف تیراندازی اور گھوڑے کی سواری کی مشق کی تاکید حضرت سرور کائنات نے فرمائی ہے۔ بعض دفعہ گھوڑ دوڑ کا اہتمام آپ نے بنفس نفیس فرمایا ہے۔ اور خود بھی شرکت فرمائی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی ریاضت ہمارے اہل علم

کا خاص شعار ہونا چاہئے۔

علمارِ سلف کی عمریں عموماً بڑی ہوی ہیں اور آخر عمر تک ان کے قوای کام دیتے رہے ہیں یہ حقیقتاً اس ریاضت کا کرشمہ تھا جس کے وہ عادی تھے ورنہ اس زمانہ کی طرح ضعف دماغ جسموں کی کمزوری اس زمانہ کے علمار کی بھی خاص علامت قرار پاتی۔ امام شافعی نے تیر اندازی میں وہ ملکہ حاصل کیا تھا کہ ان کے دس تیر دس نشانے اڑا دیتے تھے۔ امام بخاری کو بھی تیر اندازی سے کمال دلچسپی تھی۔ اور اس فن میں بھی اس قدر مہارت رکھتے تھے کہ عمر بھر میں آپ کے صرف دو تیروں نے خطا کی۔

آج طالب علم باضابطہ ورزش جسمانی سے بالکل دلچسپی نہیں لیتے۔ شہسواری۔ تیر اندازی۔ رہی ایک طرف گھر سے مدرسے تک پیادہ روی بھی مشکل ہوگئی ہے۔ جسمانی ریاضت درکنار مضر صحت اشیا رسے پرہیز اور قوی کو کمزور کرنے والے اسباب سے محفوظ رہنا بھی انہیں بار خاطر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بچپن ہی میں عینک کے محتاج ہیں۔ اور جسمانی کمزوری کہہ رہی ہے ؏ قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا۔

تجارت گذشتہ علمانے طالب علمی جن بندی کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلقات کو بھی نہایت خوبی سے نباہا۔ اور سلیقے اور خوبی کے ساتھ سب کے حقوق ادا کئے اور نہ صرف عابد و زاہد ہی تھے۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کے معاملہ فہم اور دنیوی امور پر غور کرنے والے بھی تھے۔ انہوں نے اپنی معاش قوت بازو سے حاصل کی اور اکثروں کا رجحان خاطر کسب معیشت میں تجارت کیطرف رہا ہے چنانچہ بڑے بڑے علمار کے نام تاجروں کی فہرست میں داخل ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ۔ حضرت عبداللہ بن مبارک۔ پارچہ کی۔ حسن ابن ربیع کوفی استاد بخاری بورئے کی۔ امام ابن جوزی۔ تانبے کی تجارت کرتے تھے اور کبھی کبھی اپنے نام کے ساتھ صفار (ٹھیٹرا) لکھدیتے۔ علمائے کرام جس طرح تجارت کی طرف راغب تھے اسی طرح حرفت کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ اور کسی قسم کے پیشے کو عیب نہ جانتے تھے۔ ان بلند پایہ علمار میں بعض نجار بعض حداد (لوہار) بعض دیگر معمولی معمولی پیشے کرنے والے تھے جن کی تفصیل باعث تطویل ہے۔

آج اہل علم کا رجحان صرف ملازمت کی طرف ہے اور بس۔ تجارت کی طرف رغبت نہیں صنعت و حرفت تو ایک عیب سمجھی جاتی ہے۔ مجھے ایک صاحب نے موجودہ اہل علم حضرات کی

ایک مطبوعہ فہرست عنایت فرمائی جس میں ہر ایک صاحب کے نام کے محاذی ان کے پیشے بھی لکھے ہوئے تھے میں نے بار بار غور سے فہرست پر نظر ڈالی مگر سوا ملازمت و وکالت وغیرہ کے تجارت یا دیگر پیشوں کے کرنے والے ایک صاحب بھی پائے نہ گئے اس سے اندازہ لگائیے کہ ہمارے تربیت یافتہ دل و دماغ کے رجحانات کا نتیجہ آئندہ کیا ہوگا۔

الغرض گذشتہ علماء سے شوق و تبحر علمی اور دیانت و خدا ترسی۔ اور ریاضت و جفاکشی اور دیگر قابل تقلید امور میں ہمیں سبق لینا چاہئے۔

اب میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں کہ ۔ در خانہ اگر کس است یک حرف بس است

والسلام مع الاکرام۔

رپورٹ نمائش تعلیمی بابتہ سنہ ۱۳۴۶ ف

متعلقہ اجلاس ہفتم کانفرنس انجمن اساتذہ مستقر بلدہ

جناب صدر، خواتین کرام و حاضرین عظام!

میں اس وقت آپ حضرات کے روبرو نمائش تعلیمی سال حال کی رپورٹ گوشگذار کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں الحمدللہ کانفرنس انجمن اساتذہ بلدہ حیدرآباد دکن کے ساتھ حسب سابق نمائش تعلیمی بھی منعقد کی گئی۔

اس سال جملہ (۶۱) مدارس ذکور و اناث بلدہ سکندرآباد و بلارم سے اشیاء نمائش تیار کردہ مدرسین و طلباء من ابتدائے ۱۹ اسد لغایت ۱۲ آبان سنہ ۴۶ داخل نمائش ہوئے جس کی تعداد (۱۲۴۰) رہی کل اشیاء حسب ایمائے جناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات بلدہ اسی سال کی تیار کی ہوئی تھیں جس میں تعلیمی نقطہ ملحوظ رکھا گیا تھا جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ دستی مشاغل کی تعلیم میں جدت و اختراع کا خیال پیدا ہو رہا ہے امید کہ اس خیال کو فروغ دیا جاکر آئندہ نمائش کو اس سے زیادہ کامیاب بنانے کی سعی کی جائے گی۔ حسب قرارداد مجلس انتظامی انجمن اساتذہ مسز ہولسٹہ صدر معلمہ سنٹ جارجس گرامر اسکول پرائمری ڈپارٹمنٹ نمائش تعلیمی کی میر مجلس منتخب

کی گئیں مس موصوفہ نے نہایت دلچسپی سے اپنے فریضہ کو انجام دیا جسکے لئے میں منجانب کمیٹی شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

تصفیہ انعامات کے لئے حسب قرارداد مجلس انتظامی ۔مولوی سید عزیز علی صاحب گورنمنٹ آرکیٹکٹ ۔مسز نازمن واکر ۔مسز حسن لطیف صاحبہ ۔مسز حسین علی خان صاحبہ ۔مسز انگلر مسز سید علی اکبر صاحبہ کو تکلیف دیگئی جنہوں نے ازراہ نوازش تنقید اشیا رلحاظ عمر و طبقہ فرماکر (۳۸) انعام حسب تفصیل ذیل مشخص کئے ۔

نمبر	مدارس	تعداد انعام	نمبر شمار	مدارس	تعداد انعام
۱	زنانہ کالج نام پلی	۱	۱۵	مدرسہ وسطانیہ نسوان حسینی محلہ	۱
۲	ر ر ٹریننگ اسکول	۱	۱۶	ماڈل پرائمری اسکول ملدہ	۲
۳	نظام کالج	۲	۱۷	مدرسہ تحتانیہ خیرت آباد	۲
۴	مدرسہ فوقانیہ نامپلی	۲	۱۸	مدرسہ تحتانیہ چادرگھاٹ	۱
۵	دارالعلوم ہائی اسکول	۲	۱۹	مدرسہ تحتانیہ نسوان گولی گوڑہ	۱
۶	مدرسہ فوقانیہ چیلکگوڑہ	۳	۲۰	عثمانیہ سنٹرل ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ سیف آباد	۱
۷	آل سنیٹس انسٹیٹیوشن	۱	۲۱	وکٹوریہ میموریل آرفنج	۱
۸	میتھوڈسٹ بائز ہائی اسکول	۱	۲۲	خادم المسلمین	۱
۹	سینٹ جارجس گرامر بائز اسکول	۱	۲۳	۴۳ سکندرآباد اسکوٹ ٹروپ	۱
۱۰	مدرسہ فوقانیہ دارالشفا	۱	۲۴	نظام کالج اسکوٹس کبس	۱
۱۱	مدرسہ وسطانیہ شاہ علیبنڈہ	۲	۲۵	(۶) یکجن پیٹرول گائڈس	۱
۱۲	مدرسہ وسطانیہ اردو شریف	۴	۲۶	(۶) رابن پیٹرول گائڈس	۱
۱۳	اسٹانلی گرلز ہائی اسکول	۱	۲۷	(۳) بلارم بلو برڈز پیارٹ پیٹرول	۱
۱۴	مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج	۱			

چونکہ اکثر مدارس بلدہ میں نیچراسٹڈی کی تعلیم دیجاتی ہے لہذا تعلیم مذکور کی ترغیب اور اس کو باقاعدہ بنانے کے لئے سال حال باغچہ جات مدارس کو بھی میدان مسابقت میں آنیکا

موقع دیا گیا۔ چنانچہ مس آمنہ پوپ پرنسپل زنانہ کالج نامپلی اور مسز آلن نے ازراہ کرم (۵) مدارس کا بدیں غرض معائنہ فرمایا اس مقابلہ میں مدرسہ اردو شریف کا نمبر سب سے اول رہا جس کے صلہ میں درجہ اول کی سند اور ایک نقرئی کپ انجمن اساتذہ کی جانب سے دیا گیا۔ جو سال بسال اسی سلسلہ میں ۳ سال تک دورہ کرتا رہے گا۔ جو مدرسہ تین سال متواتر مقابلہ باغچہ میں اول ثابت ہوگا۔ مذکورہ نقرئی کپ اس مدرسہ کی ملک متصور ہوگا۔

سال حال انعامات کے مصارف بذریعہ عطیات طے پائے۔ چنانچہ حضرات و خواتین ذیل نے ازراہ ہمدردی عطیات مرحمت فرما کر اپنی علم پروری کا ثبوت دیا جس کے لئے کمیٹی ہذا مشکور رہے۔

نمبر	اسمار گرامی معطیان	تعداد انعام	نمبر	اسمار گرامی معطیان	
۱	عالیجناب مولوی خان فضل محمد خان صاحب ناظم تعلیمات ملک سرکار عالی	۳		مس ولسن صدر معلمہ پرائمری ڈپارٹمنٹ سینٹ جارجس گرامر اسکول	۱
۲	عالیجناب مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری نائب ناظم تعلیمات	۲	۱۰	مسز ہوزڈن مددگار سینٹ جارجس گرامر اسکول	
۳	عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ	۱	۱۱	مس مائلر ہیڈ مسٹرس ماڈل پرائمری اسکول بلدہ	۱
۴	عالیجناب مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج	۱	۱۲	مسز جمال الدین صاحبہ مددگار ماڈل پرائمری ″	۱
۵	″ مولوی غلام ربانی صاحب مددگار اول ناظم تعلیمات سرکار عالی	۱	۱۳	مس نندی مددگارہ ماڈل پرائمری ″	۱
۶	″ مولوی شیر محمد خان صاحب معتمد کمشنر امتحانات سرکار عالی	۱	۱۴	مس ہملٹن	
۷	″ شیخ ابو الحسن صاحب اسسٹنٹ مددگار ناظم تعلیمات سرکار عالی	۱		مس فراسٹ	۱
۸	″ نرسنگ راؤ صاحب مددگار ناظم تعلیمات سرکار عالی	۱		مس فلپ	
	″ مولوی سید خیرات علی صاحب مددگار صدر مہتمم بلدہ تعلیمات	۱	۱۵	جناب مولوی مرزا ضیاء الدین بیگ صاحب ناظر مدارس بلدہ حلقہ جنوبی	

بتاریخ ۲۳ آبان ۱۳۴۲ف اجلاس کانفرنس سے ایک روز قبل بوقت ۵ ساعت شام بمقام متھوڈسٹ بائز ہائی اسکول عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر صدر نشین کانفرنس نے نمایش کا افتتاح فرمایا۔ صاحب ممدوح نے ہر ایک شئے کو نہایت غور کے ساتھ ملاحظہ فرما کر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ اور بتاریخ ۲۵ آبان روز شنبہ اجلاس کانفرنس میں انعامات مذکورۃ الصدر تقسیم فرمائے بروز یکشنبہ مدارس بلدہ و سکندرآباد کے طلبہ صبح سے شام تک جوق جوق آتے اور

بلدہ

نمایش دیکھیے ہے جنکی تعداد ۲۰۰۰ سے زائد تھی۔ روز دوشنبہ حسب قرارداد مستورات کے لئے پردہ کا اہتمام کیا گیا تھا مس ڈیزی ولبسٹر پریڈنٹ نمایش نے بامداد دیگر یورپین و پارسی معلمات خاص انتظام رکھا تھا۔ معلمات و طالبات مدارس نسوان بلدہ و سکندرآباد کے علاوہ معزز بیگمات نے نہایت مسرت کے ساتھ نمایش ملاحظہ فرمائی۔ جملہ ناظرات کی تعداد (۲۰۰۰) سے زائد تھی۔

میرا یہ فریضہ ہے کہ سب سے پہلے ریورنڈ مسٹر سندرم پرنسپال میتھوڈسٹ بائز اسکول کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے اپنے مدرسہ کا اڈریس ہال اور فرنیچر نمائش کے لئے عاریتاً مرحمت فرمایا اور اور اس کے بعد مسٹر گارڈن کا شکریہ مجھ پر واجب ہے کہ صاحب موصوف نے انتظام نمایش میں میری ہر طرح مدد فرمائی۔ آخر میں ان مدرسین صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے نمایش کے کامیاب بنانے میں مجھے ہر طرح کی مدد دی۔ نظیر حسین شریف معتمد نمائش

رپوٹ متعلقہ مقابلہ باغیچہ ہائے مدارس (از معائنہ کنندگان)

بتاریخ ۲۸ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء بروز دوشنبہ ہم نے مندرجۂ ذیل مدارس کے باغیچہ ہائے طلاب کا معائنہ کیا:۔

ماڈل پرائمری اسکول۔ مدرسہ فوقانیہ نامپلی۔ مدرسہ وسطانیہ اردو شریف۔ مدرسہ فوقانیہ دارالشفا اور مدرسۂ تحتانیہ چادرگھاٹ۔ باغیچہ کے مقابلہ کا خیال بہترین ثابت ہوا۔ اور ہم دونوں کو اس تحریک کے نتایج دیکھ کر جو باوجود ناموافق حالات کے بھی بہترین صورت میں برآمد ہوے نہایت ہی حیرت اور خوشی ہوی۔ بہ حیثیت مجموعی صفائی کی حالت قابل تحسین تھی لیکن اساتذہ کی جانب سے تفہیمی ہدایات دئے جانے کا ثبوت بجز ایک مدرسہ کے اور کہیں نہیں ملا۔ یہ ایک جدید تحریک ہے اور غالباً اس سے طلبہ کو کافی طور پر رہنمائی حاصل ہوی ہوگی ہماری یہ رائے ہے کہ آیندہ باقاعدہ طور پر اندراجات محفوظ رکھے جائیں جن سے ایک تو طلبہ کا ہفتہ واری کام معلوم ہو سکے گا دوسرے یہ اندراجات باغبانی کے کام کا مقابلتہ اندازہ کرنے میں بھی مفید ثابت ہوں گے۔

ان مدارس نے اپنی اپنی مفوضہ زمین کو جس خوش اسلوبی سے استعمال کیا اس سے ہم کو بے حد مسرت ہوی اردو شریف کے مدرسہ میں خاص طور پر یہ خوبی نظر آئی اس مدرسہ میں اساتذہ کا اتحاد عمل قابل قدر تھا۔

ہم نے صرف دو ہی مدارس میں دیکھا کہ وہاں ایسے بچوں سے کام لیا گیا تھا جن میں حقیقی تعلیمی مفاد ہو۔ مس آمنہ پوپ مسز آلن

روداد ساتویں کانفرنس انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن

جمعہ و شنبہ ۲۴ و ۲۵ آبان سنہ ۱۳۴۲ ف م ۲۹ ستمبر سنہ ۱۹۳۳ء

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کی ساتویں کانفرنس کے ضمن میں بتاریخ ۲۳ آبان ۱۳۴۲ ف پانچ بجے بمقام متصل دست بائز ہائی اسکول تعلیمی نمائش کا افتتاح عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم۔ اے بار ایٹ لا معتمد تعلیمات و عدالت و کوتوالی و امور عامہ سرکار عالی نے فرمایا جناب خان فضل محمد خاں صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات اور جناب سجاد مرزا صاحب ایم اے پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج و دیگر معزز حضرات و خواتین کثیر تعداد میں شریک تھے حاضرین نے اشیاء نمائش ملاحظہ فرما کر اظہار پسندیدگی فرمایا۔ آلات کنڈرگارٹن ایک علیحدہ کمرہ میں رکھے گئے تھے۔ اور دیگر اشیا نمائش مثلاً قلمی تصاویر، سامان بیدبافی، مٹی کے نمونہ جات، کارچوب اور کشیدہ کے نمونہ جات وغیرہ کثیر تعداد میں نہایت سلیقہ کے ساتھ رکھے گئے تھے۔ اور ان اشیاء کے متعلق ضروری معلومات ارکان انجمن بہم پہنچا رہے تھے۔

شام کے سات بجے مولوی یوسف الدین صاحب بی۔ اے نائب ناظم محکمہ آثار قدیمہ نے بیدر پر بمقام جمنازیم ہال سینٹ جارج گرامر اسکول فانوسی لکچر دیا۔ بیدر کی مختصر تاریخ بیان کرنے کے بعد مشہور عمارات کے فلم بتائے گئے اور مختصر حالات بیان کئے گئے۔ خصوصاً مدرسہ محمود گاوان سلاطین بہمنیہ و بریدشاہی گنبدوں اور قلعہ کی قابل دید عمارتوں اور حضرت سید شاہ خلیل اللہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کی چوکھنڈی شریف کے مناظر قابل دید تھے۔

اجلاس اوّل

تاریخ ۲۴ آبان ۴۲ ف بروز جمعہ دن کے ۹½ بجے بمقام سٹی کالج زیر صدارت عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر جلسے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ حاضرین میں خصوصاً جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات سرکار عالی و جناب سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج بلدہ جناب مولوی سید حسین صاحب و جناب مولوی احمد حسین خان صاحب و جناب مولوی فیض الدین صاحب صدر مہتمم ان اسمات قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اضلاع کے اور بھی بہت سے عہدہ دار اور مدرسین شریک جلسہ تھے مولوی عبدالباری صاحب قاری مددگار مدرسۂ اعزہ نے قرارت سنائی اس کے بعد مسٹر گنگا دھر پھاٹک مددگار فوقانیہ دارالشفاء نے سنسکرت میں دعا، پڑی

جناب مولوی شیخ ابو الحسن صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے بزبان اردو اور مسٹر بی اے چندرو رکر ایم اے معتمد استقبالیہ کمیٹی نے بزبان انگریزی خطبۂ استقبالیہ سنایا۔ مولوی مرزا ضیاء الدین بیگ صاحب معتمد عمومی نے رپورٹ انجمن بابتہ سنہ ۱۳۴۲ف سنائی۔ مسٹر اے۔ آئی۔ آپٹ پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ نے "ہم جاپان سے کیا سیکھ سکتے ہیں" موضوع پر نہایت دلچسپ تقریر کی۔ اس کے بعد عالیجناب نواب ذو القدر جنگ بہادر صدر نشین جلسہ نے اپنا عالمانہ خطبۂ صدارت سنایا۔ جو علحدہ شائع کیا گیا ہے۔

مس ریڈ و مس شامرٹ کے زیر نگرانی طلبار مدرسۂ عالیہ نے کنڈر گارٹن کا مظاہرہ پیش کیا۔ پیانو کی سریلی آواز کے ساتھ معصوم و ہونہار بچوں کی باقاعدہ جسمانی حرکات جوان کی نشو و نما کی ممد تھیں نہایت دلچسپ منظر پیش کر رہی تھیں مس ڈی نندی کی نگرانی میں بیت طلبہ و طالبات ماڈل پرائمری اسکول نے اس ورزش جسمانی کا نمونہ کھیل کی شکل میں تبلایا جو کمسن طلبار کے لئے مناسب و موزوں تھا۔ اس کے بعد طالبات میتھوڈسٹ بائز ہائی اسکول نے پیانو کے ساتھ پر ترنم لہجے میں نظمیں سنائیں۔ غرض کہ تینوں مدارس کا مظاہرہ نہایت دلچسپ و سبق آموز تھا جس سے حاضرین بے حد محظوظ ہوئے۔

اجلاس دوم

۲½ بجے دن سے بمقام سٹی کالج ضمنی جلسے شروع ہوئے۔ بصدارت جناب مولوی محمد عثمان صاحب بی۔ اے ڈپ ایڈ (لنڈن) و ائس پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج بلدہ کنڈر گارٹن پر بزبان اردو ضمنی جلسہ منعقد ہوا کنڈر گارٹن کمیٹی کی تیار کردہ رپورٹ سنائی گئی اس کے بعد بحث کا موقع دیا گیا۔ مولوی محمد سلطان صاحب مددگار فوقانیہ نامپلی نے رپورٹ کی تعریف کرتے ہوئے اپنے چند شبہات کا اظہار فرمایا جس کو جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ و اطراف بلدہ نے منجانب کنڈر گارٹن کمیٹی رفع فرمایا۔ اس کے بعد مولوی عبد الستار صاحب سبحانی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی۔ پرنسپل فوقانیہ دار العلوم نے تقریر فرمائی اور اس امر پر زور دیا کہ کنڈر گارٹن کا کام نہ صرف ٹرینڈ مدرسین ہی انجام دے سکتے ہیں بلکہ ہر ایک مدرس اگر وہ بچوں کی تعلیم کے مسئلہ میں غور و خوض کر کے نئے نئے طریقے سوچ کر نکالے تو اصول کے مطابق کام کر سکتا ہے۔ مولوی عبد المجید صاحب فاروقی مددگار فوقانیہ دار العلوم اور مولوی فضل اللہ صاحب مہتمم گشتی کتب خانہ کی مختصر تقاریر کے بعد صدر جلسہ جناب مولوی محمد عثمان صاحب نے افتتاحی تقاریر میں کنڈر گارٹن کی اہمیت بتلا کر رپورٹ کی موزونیت و کامیابی پر کمیٹی کو مبارکباد دی۔ بلغلبۂ آرا رپورٹ منظور ہوئی۔

دوسرے ہال میں بصدارت جناب ڈاکٹر ڈی۔ ڈی شنڈارکر صاحب پی۔ ایچ ڈی (لنڈن) لکچرار ٹریننگ کالج

طلبۂ پس افتادہ طلبہ کا ضمنی جلسہ بزبان انگریزی منعقد ہوا کمیٹی کی تیار کردہ رپورٹ پڑھی گئی اس کے بعد مباحثہ شروع ہوا مسٹر بی۔ اے جندرورکر نے ان مشکلات کا اظہار کیا جو پس افتادہ طلبہ کی تعلیم میں پیش آتی ہیں مولوی یوسف حسین صاحب و مولوی سید مجتبیٰ حسین صاحب نقوی نے بحث میں حصہ لیا بالآخر رپورٹ منظور ہوی

رات کو ۹ بجے بصدارت جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ جمنازیم ہال گرامر اسکول میں مجلس مشاعرہ منعقد ہوی جس میں متعدد اساتذہ صاحبان نے مصرع طرح ''زلف برہم تھی مزاج یار اگر برہم نہ تھا'' پر طبع آزمائی فرمائی۔ مشاعرہ کی تفصیلی رپورٹ آیندہ اشاعت میں ہدیہ ناظرین کی جائے گی۔

دوسرا روزہ ۲۶ر آبان سنہ ۴۲ف صبح کا اجلاس ۹ تا ۱۲ بجے ساعت

بصدارت جناب مولوی محمد عبدالستار صاحب سبحانی ۹ بجے ضمنی جلسہ شروع ہوا۔ جناب مولوی محمد عثمان صاحب بی۔ اے ڈپ ایڈ (لنڈن) نے اسکول ٹائم ٹیبل پر ایک تفصیلی اور مدلل تقریر فرمائی جو آیندہ اشاعت میں ہدیۂ ناظرین کی جائیگی مولوی عبدالستار صاحب سبحانی نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

حضرات! فاضل مقرر مولوی محمد عثمان صاحب نے ٹائم ٹیبل کے متعلق جو عالمانہ تقریر فرمائی اور اس کے مقاصد و اصول کو جس خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا وہ ہم سب کی رہنمائی کے لئے بہت کافی ہے۔ میں اپنی تقریر میں صرف ان دقتوں کو رفع کرنے کی کوشش کروں گا۔ جو ترتیب ٹائم ٹیبل میں عملاً کسی صدر مدرس کو پیش آتی ہیں۔

ٹائم ٹیبل کے متعلق دو باتیں نہایت ضروری ہیں ایک تو اس کی ترتیب میں مدرسین کی علمی و تعلیمی استعداد کا لحاظ دوسری اس میں اصلاح کی صلاحیت۔ سررشتہ کی ضروریات کا بعض اوقات یہ تقاضہ ہوتا ہے کہ اندرون سال ایک ہی مدرسہ کے متعدد مدرسین کا تبادلہ عمل میں آئے ان کے بدل بعض وقت ایسے مدرسین ہوتے ہیں جو یا تو اپنے پیش رو کے مضامین نہیں پڑھا سکتے یا بالکل امیدوار ہوتے ہیں جن کے تفویض ان کے پیش رو کا کام نہیں ہوسکتا ایسی صورت میں اگر ٹائم ٹیبل میں وقتاً فوقتاً خاطر خواہ ترمیم ناممکن ہو تو مدرسے کا کام خوش اسلوبی کے ساتھ کبھی انجام نہیں پاسکتا۔ بعض وقت کسی خاص مضمون کے لئے مدرسہ میں ایک ہی مدرس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض وقت مضامین کے اوقات اور ان کی مدرسین پر تقسیم ایسی پیچیدہ ہوتی ہے کہ ہم کسی مضمون کو اس کی اہمیت کے لحاظ سے ہر جماعت میں اس کے مناسب گھنٹے مقرر نہیں کرسکتے پس مجبوراً بلا لحاظ مناسبت اوقات مضامین کا رد و بدل عمل میں آجاتا ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ گھنٹوں کے معمول میں فرق کردیا جائے مثلاً پہلا گھنٹہ (۵۰) منٹ کا اور باقی گھنٹے تدریجاً کم وقت کے رکھے جائیں اس سے یہ ہوگا کہ طلبہ کو مدرسہ کی فضا سے متاثر ہونے میں کچھ وقت

صرف ہونے کے بعد مضمون کی تعلیم کے لئے کافی وقت بچ رہے گا۔

اکثر ماہرین فن تعلیم کا خیال ہے کہ بچوں کی عمر کے لحاظ سے مدرسہ میں طبقہ واری علٰحدہ علٰحدہ ٹائم ٹائبل رکھے جائیں۔ جن میں گھنٹوں کی مدت مختلف ہو یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہر طبقہ کے لئے عمارت علٰحدہ ہو اور مدرسین کی تعداد اتنی ہو کہ ہر طبقہ کا اسٹاف علٰحدہ ہو سکے۔ بصورت دیگر گھنٹوں کی مدت میں اختلاف کام میں بدنظمی پیدا کرتا ہے اور ایک طبقہ کے مدرس کو ہر گھنٹے میں بروقت پہنچنا ناممکن ہوتا ہے اس خصوص میں بحالت موجودہ یہ مناسب ہے کہ ٹائم ٹیبل تو ایک ہی رہے۔ مگر جن جماعتوں میں چھوٹے گھنٹوں کی ضرورت ہے ان کو ایک ہی گھنٹے میں ایک ہی مضمون کے مختلف شعبوں کی تعلیم دی جائے۔ تعلیمی گھنٹوں کے درمیانی وقفہ کا اصول سوائے جماعت کنڈرگارٹن کے اور کسی جماعت میں ممکن العمل نہیں وقفہ سے بچوں کو غیر حاضری کی ترغیب ہوتی ہے دوسرا وقفہ میں بچوں کا کھیل کود دوسری جماعتوں کے لئے ہرج کا باعث ہوتا ہے۔ اگر وقفہ سے یہ مقصد ہے کہ مدرسین کو آرام ملے تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ آرام بعض علما کے نزدیک تبدیل مشغلہ کا نام ہے بیکاری کو آرام نہیں کہتے۔ مدرس میں بے آرامی کے لئے ہمارا اپنا طرز عمل بھی ایک بڑی حد تک ذمہ دار ہے ہماری ہر وقت یہ کوشش رہتی ہے کہ ذرا سا بہانہ ملے اور رخصت اتفاقی کی درخواست پیش کردیں —— اس طرح ایک ایک وقت میں کئی کئی اصحاب مدرسہ سے غیر حاضر ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا کام ان مدرسین کو کرنا پڑتا ہے۔ جو ہمیشہ حاضر رہتے ہیں۔ اسی طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدرسین پر کام کا بار زیادہ پڑ جاتا ہے۔ پس اول تو ہم کو یہ چاہئے کہ جب تک شدید ضرورت نہ ہو رخصت کا خیال نہ کریں اگر بلحاظ حالات مدرسہ کا کام واقعی زیادہ ہو تو اس کو اس طرح انجام دیں کہ تھکاوٹ محسوس نہ ہو۔ مثلاً اگر مسلسل دو یا تین اہم مضامین پڑھانے پڑتے ہیں تو ایک گھنٹے میں پڑھائیں۔ دوسرے میں لکھائیں جس گھنٹے میں ایک دن پڑھائی ہو اسی گھنٹے میں دوسرے دن لکھائی ہو۔

اسکول کے ٹائم ٹیبل کے علاوہ ایک اہم ٹائم ٹائبل ہوم ورک کا ہے اگر ہوم ورک کا ٹائم ٹیبل نہ ہو اور اس کی کافی نگرانی نہ کی جائے تو ہر مدرس اپنے ہی مضمون کو اہم سمجھ کر ضرورت سے زیادہ کام دے گا جس کی وجہ سے اول تو عام مضامین کے ہوم ورک کی مجموعی تعداد طالب علم کے لئے بار ہو گی اور ہوم ورک سے جو فوائد ہیں ان سے وہ محروم رہے گا۔ دوسرے ہوم ورک کی تکمیل اس کو خانگی مدرس کے رکھنے پر مجبور کرے گی جس کا وجود اس کو بجائے فائدہ پہونچانے کے اس کی

خرابی کا باعث ہوگا۔ پس صدر مدرس کا یہ فریضہ ہے کہ مضامین کی اہمیت اور استعداد طلبا اور جماعت کے لحاظ سے ہر جماعت میں ہر مضمون کے ہوم ورک کے لئے وقت مقرر کر دے اور اس امر کی نگرانی رکھے کہ کام اسی قدر دیا جائے جو وقت مقررہ میں آسانی کے ساتھ انجام پا سکے۔"

بصدارت جناب مولوی سجاد مرزا صاحب کنڈرگارٹن کا ضمنی جلسہ بزبان انگریزی منعقد ہوا آغاز جلسہ سے قبل شامرٹ معلمہ مدرسہ عالیہ نے نیچر اسٹڈی پر عملی سبق دیا کمسن طلبہ کو زندہ خرگوش کا مشاہدہ کرایا گیا۔ خرگوش کے مختلف اعضا رنگ شکل و شباہت و عادات وغیرہ پر سوالات کئے گئے جن کے جوابات بچوں نے مشاہدہ کی بنا پر دئے مس موصوفہ نے نہایت دلچسپ پیرایہ اور سلیس اردو میں توضیح کی آخر میں بچوں نے خرگوش کی مختلف حرکات وسکنات کی تصاویر کو جو کاغذ سے کاٹ کر بنائی گئی تھیں ایک تختہ پر بلحاظ تصویر مناسب و موزوں جگہ پر چسپاں کیا تختہ پر جنگل کا ایک رنگین نقشہ اتارا گیا تھا جس میں خرگوش کے رہنے کی جگہ اور جنگل کا منظر بتایا تھا بچوں کے انہماک کا یہ عالم تھا۔ کہ باوجود مجمع کی کثرت کے ان کی توجہ سبق کی جانب تھی اور نہایت بے تکلفی سے معلمہ صاحبہ کے سوالات کے جوابات دیتے رہے اور نئے معلومات حاصل کرکے خوش ہو رہے تھے سبق نہایت کامیاب رہا۔

جناب مولوی سجاد مرزا صاحب نے افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ کنڈرگارٹن کی معلمات اس قدیم دستور کو توڑنے کی جانب پیش قدمی کر رہی ہیں۔ جس میں ذکور کو اناث پر ترجیح دی گئی ہے جس کی تائید مردم شماری کی تازہ ترین رپورٹ سے بھی ہوتی ہے۔ یعنے رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ اولاد ذکور کو والدین کے کریا کرم کے لئے نہ صرف ہنود ہی میں اہمیت دی گئی ہے بلکہ دوسری قوموں میں بھی ذکور کا وجود ضروری سمجھا گیا ہے غرض کہ عورتوں کے متعلق ہر جگہ نہایت تعصب برتا جاتا ہے، لیکن انگلستان یورپ امریکہ میں جنس ذکور کو تعلیمی معاملات میں ایک ثانوی درجہ دیا گیا ہے چنانچہ اکثر کتب تعلیمی میں جہاں معلم کا تذکرہ کیا گیا ہے وہاں ضمیر مونث شی استعمال ہوی ہے۔ ڈاکٹر مانٹی سوری نے فروبل اور اس کے پیش روؤں کے خیالات اور نظریوں میں بہت کچھ رد و بدل اور اصلاح کی ہے اسی نے بچوں کی تربیت میں عورتوں کی ضرورت کو ثابت کر دکھایا اور انھیں سے کام لیا۔ رپوٹ کے ان جملوں کو دہرانے کے بعد صاحب موصوف نے اپنی یہ رائے ظاہر فرمائی کہ آیندہ موقعوں پر صدر نشینی کے لئے کسی خاتون کا انتخاب موزوں ثابت ہوگا اور اس تجویز پر آیندہ ضرور لحاظ کیا جائے گا۔ آخر میں صدر نشینی کی عزت افزائی کا شکریہ ادا

کرتے ہوئے فرمایا کہ کنڈرگارٹن کی صدر کمیٹی سے اپنی رپورٹ سنانے کی درخواست کرنے سے پہلے میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ کنڈرگارٹن کے مظاہرات دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی اور نیز اس کانفرنس میں عملی مظاہروں کا وقت نظری بحثوں سے پہلے جو رکھا گیا نہایت مناسب تھا۔"
اس کے بعد جناب مولوی سید علی اکبر صاحب نے کنڈرگارٹن کمیٹی کی تیار کردہ انگریزی رپورٹ سنائی رپورٹ کے اختتام پر صدرنشین جلسہ جناب مولوی سجاد مرزا صاحب نے حسب ذیل تبصرہ فرمایا۔

۱۔ یہ تبلانا صحیح نہیں ہے کہ ہندوستان میں کنڈرگارٹن کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی جبکہ انگریزی تعلیم رائج کی گئی بلکہ ہندوستان میں تعلیم اوپر سے شروع ہوئی لارڈ ہیسٹنگز کے زمانے میں علوم شرقیہ کے کالج کا قیام اور ۱۸۵۷ء میں تین یونیورسٹیوں کی بنیاد اس کا کافی ثبوت ہے۔

۲۔ یہ بیان کیا گیا ہے کہ جدید طریقہ تعلیم کے بموجب کم از کم چھ سال کی عمر میں بچوں کو مدرسوں میں شریک کرایا جائے لیکن دیکھی جاتی ہے کہ مذکورہ عمر سے بھی کم عمر والے بچے جماعت اول میں شریک کئے جاتے ہیں کمیٹی نے اس طرز عمل کے جو وجوہ بیان کئے مدلل نہیں ہیں یہ کیا وجہ ہے کہ عہدہ دار خود اپنے مقرر کردہ ضوابط پر قائم نہیں رہتے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچے اور اس کی ابتدائی تعلیم کو اہمیت نہیں دی جاتی مدرسین اپنی کارگذاری دکھلانے کی غرض سے اعلیٰ جماعتوں کے سرکاری امتحانات کے نتائج کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ اسی طرح نچلی جماعتوں خاصکر صغیر جماعت میں تعداد میں اضافہ کرنا کارگذاری خیال کرتے ہیں۔

۳۔ یہ بہت اچھی تجویز ہے کہ مدارس کنڈرگارٹن کا افتتاح "آل انڈیا ویمنس کانفرنس" کی جانب سے عمل میں آئے لیکن حیدرآباد کے چائلڈ ویلفیر سنٹرس (مرکز ہائے بہی خواہان اطفال) سے اس کی ابتدا ہو تو اور بہتر ہے علاوہ ازیں گورنمنٹ کو بھی توجہ دلائی جائے کہ ہمارے کارخانوں کے مالکوں اور منتظموں کو اپنے اپنے ملازمین کے بچوں کے لئے ابتدائی مدارس اور کنڈرگارٹن قائم کرنے کی غرض سے جبریہ قانون نافذ کرے یہ تجاویز ان اساتذہ کی پیش کردہ ہیں جو عثمانیہ ٹریننگ کالج میں ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔

۴۔ سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ یورپ اور ہندوستان کے بچوں میں بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ ہندوستانی بچوں کا رجحان کھیل کی طرف نہیں بلکہ بیکار بیٹھے رہنا پسند کرتے ہیں۔ گو ہندوستانی مذہب پرست اور سنجیدہ مزاج ہوتے ہیں لیکن اس میں شک ہے کہ یہ خصوصیت بچوں میں بھی پائی جاتی ہے یا نہیں تمام دنیا کے بچے ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں لیکن ہندوستانی بچوں کی عدم توجہی کی سب سے بڑی وجہ

یہ ہے کہ یہاں کی ساٹھ فی صد عورتوں کو عدم تولید خون کی شکایت ہے صرف بنگال میں ۷۰ فیصدی عورتیں امراض شش میں مبتلا ہیں۔

۵۔ کمیٹی میں کنڈرگارٹن کے لئے موزوں مضامین کا قرار داد کیا گیا ہے لیکن ان کی تفصیلات نہیں دیگئی ہیں علاوہ ازیں مضامین میں باہمی تعلقات پیدا کرنے کے متعلق زور دیا گیا ہے جو چھوٹی جماعتوں میں بہت ضروری ہے۔ ہمارے مدارس میں مضامین جیسے ہیں ویسے ہی بلا تشریح و توضیح پیش کردئے جاتے ہیں۔ آلات تعلیمی کا مسئلہ ابھی تک عملی صورت میں پیش نہیں کیا گیا۔

۶۔ ٹرینگ کالج میں بچوں کی تعلیم کو لازمی قرار دیکر زور دیا جارہا ہے لیکن عملی کام کے لئے آسانیاں نہیں ہیں اگر ٹرینڈ اساتذہ حیدرآباد میں کنڈرگارٹن پر متعین کردئے جائیں تو ممکن ہے کہ کم صرفے سے اس کام میں ترقی ہوسکتی ہے۔

ہمارے مدارس میں دو سوال پیش نظر ہیں اول قابل تعریف نتائج نکالیں دوم بچوں کو اس قابل بنایا جائے کہ معمولی نصاب جلد از جلد پڑھ سکیں کمیٹی نے پروجکٹ میتھڈ اور ساتھ ہی ساتھ فروبل اور مانٹی سوری طریقۂ تعلیم کی بھی تجویز پیش کی ہے قصبات میں کنڈرگارٹن کا مسئلہ حل طلب ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دیہاتی مدرس کو کوئی باقاعدہ طریقہ نہیں بتلایا گیا جس کو اس طریقۂ تعلیم کے متعلق خاص اور تفصیلی ہدایات ملنی چاہئیں۔

بحیثیت مجموعی رپورٹ نہایت اچھی تھی کنڈرگارٹن کمیٹی کے صدر اور ارکان مستحق ستائش ہیں جنہوں نے اس اہم ترین مسئلہ تعلیم کے حل کرنے کی کوشش کرکے ایک قابل تقلید مثال پیش کی ہے جناب مولوی سید علی اکبر صاحب نے مولوی سجاد مرزا صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ صاحب موصوف نے جو مفید مشورہ دیا ہے وہ کنڈرگارٹن کمیٹی میں پیش کردیا جائے گا۔ رپورٹ بغلبۂ آرا منظور ہوی۔

بصدارت جناب مولوی سید مجتبیٰ حسین صاحب نقوی۔ بی۔ اے ڈپ۔ ایڈ (لنڈن) "پس افتادہ طلبا" کا ضمنی جلسہ بزبان اردو منعقد ہوا مولوی غلام دستگیر صاحب نے رپورٹ پڑھی۔ مولوی سید محمد سلطان صاحب نے فرمایا کہ بلاشبہ رپورٹ بہت اچھی ہے لیکن اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ کن ذرائع سے پس افتادہ طلبہ کی کمزوری کا پتہ چلایا گیا جن کو اعداد کی صورت میں رپورٹ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ مولوی غلام دستگیر صاحب نے فرمایا کہ جن پیمانوں سے کام لیا گیا ہے وہ پیش نہیں کئے جاسکتے اس کا سمجھنا وقت سے خالی نہیں البتہ دوسرے پرچے میں اس کی شکلیں بتادی گئی ہیں۔ اس کے ملاحظہ سے اطمینان ہوسکتا ہے۔ مکرر مولوی محمد سلطان صاحب نے یہ اعتراض کیا کہ عمر کی نسبت کس طرح اطمینان کیا جاسکتا ہے۔ مدرسہ میں جو عمر درج رہتی ہے۔ وہ اکثر غلط

بتائی جاتی ہے۔ مولوی نور الحسن صاحب اول مددگار فوقانیہ نامپلی نے تفصیلی جواب دیا جس کا حاصل یہ تھا کہ عمر کا اطمینان سوائے اس کے کہ رجسٹر سے کیا جائے ہمارے لئے اور طریقہ ممکن نہیں مزید بحث کے بعد رپورٹ تعلیۂ آرا منظور ہوئی۔

اجلاس دوم (دوپہر) ۲ تا ۴ ساعت سام۔

بصدارت عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر جلسہ شروع ہوا حاضرین کی خاصی تعداد تھی جناب مولوی شیخ ابوالحسن صاحب نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا "تاریخ افتتاح انجمن سے گذشتہ سال تک تقریباً سات سال جناب مولوی سید شریف صاحب شہیدی ناظر مدارس نے جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں انجمن انکا اعتراف کرتی ہے" معتمد عمومی نے اس کی تائید کی اور تعلیۂ آرا رزولیوشن منظور ہوا۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب پی۔ ایچ ڈی پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ نے "نفسیات جدیدہ اور مقامی حالات کی روشنی میں معلم کا کام" پر فلسفیانہ و پرمذاق انداز میں تقریر فرمائی جو آیندہ اشاعت میں شایع کی جائے گی۔ مولوی حسام الدین صاحب مددگار مدرسۂ فوقانیہ دارالعلوم نے عالمانہ انداز میں "طلبا و علمائے ماضی و حال" پر تقریر فرمائی جو علحدہ شایع کی گئی ہے۔ مولوی نظر حسین شریف صاحب معتمد نمایش کمیٹی نے رپورٹ نمایش سنائی جو علحدہ شایع کی گئی ہے۔

عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر صدر نشین جلسہ نے انعامات تقسیم فرمائے اور افتتاحی تقریر میں صدر انجمن جناب مولوی سید علی اکبر صاحب کو کانفرنس کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ انجمن کا قیام بہت مفید ہے نیز یہ سب سے بڑھ کر مجھے اس بات سے مسرت ہوئی کہ مدرسین نے نہایت جوش اور گہری دلچسپی سے انجمن کے کاروبار اور کانفرنس کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا ہے۔

صدر انجمن جناب مولوی سید علی اکبر صاحب نے جناب صدر نشین صاحب جلسہ کا انجمن کی جانب سے شکریہ ادا کیا کہ جناب ممدوح نے کرسی صدارت کو زینت بخش کر انجمن کی عزت افزائی فرمائی اس کے بعد ارکان کنڈرگارٹن کمیٹی و بیاک ورڈ چلڈرن کمیٹی کا شکریہ ادا کرکے فرمایا کہ ارکان مذکور نے اپنی انتھک کوششوں سے رپورٹ کی تیاری میں مدد دی نیز یہ کہ اب تک جس قدر کانفرنسیں ہوئیں اور کامیاب رہی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے اور یہ کامیابی استقبالیہ کمیٹی نمایش کمیٹی اور دیگر رفقا کار کی غیر معمولی محنت و کوشش کا نتیجہ ہے اس کے بعد مسٹر اے آئی اپسیٹ پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ و جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب و جناب سجاد مرزا صاحب و ڈاکٹر شنڈ ارکرو جناب مولوی محمد عثمان صاحب و مولوی حسام الدین صاحب و دیگر ان حضرات و خواتین کا جنہوں نے کانفرنس کو کامیاب بنانے میں مدد دی اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد کانفرنس کا آخری اجلاس ختم ہوا اور حاضرین و

ارکان انجمن ایٹ ہوم میں شریک ہوئے۔بینڈ کا انتظام کیا گیا تھا۔

مغرب سے قبل و بعد نماز مغرب "سوشیل گیاو زنگ" کا انعقاد کیا گیا اور ارکان انجمن نے اپنے اپنے کمال موسیقی سے دوسروں کو محظوظ فرمایا۔جناب مولوی سید رضا صاحب مددگار فوقانیہ دارالشفائے جناب مولوی سید علی اکبر صاحب کا ارکان کی جانب سے شکریہ ادا کیا کہ صاحب موصوف نے اس طرح یکجائی باہمی ارتباط و اتفاق کا موقع دیا جس سے کانفرنس کی تکان جاتی رہی جناب مولوی شیخ ابوالحسن صاحب نے سوشیل گیاو زنگ کو اپنے کمالات موسیقی سے کامیاب بنانے والے حضرات اور صدر انجمن جناب مولوی سید علی اکبر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

آخر میں جناب مولوی سید علی اکبر صاحب نے حاضرین کے باہمی اتحاد عمل کا شکریہ ادا فرمایا اور کانفرنس برخاست ہوئی۔

از مولوی مرزا ضیاء الدین بیگ صاحب بی۔اے بی ٹی۔
معتمد عمومی انجمن اساتذہ بلدہ حیدرآباد دکن۔

ایڈیٹوریل

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ انجمن اساتذہ بلدہ کی ساتویں سالانہ کانفرنس اپنی چند در چند خصوصیات کی وجہ سے بہ نسبت سالہائے سبق کے زیادہ دلچسپ اور کامیاب رہی اس سال بعض ارکان انجمن کی سعی و کوشش سے دو نہایت ہی مفید اور قابل قدر کام انجام پائے یعنی پس افتادہ طلباء اور کنڈر گارٹن کی کمیٹیوں کی مبسوط اور مفصل رپورٹیں پیش کی گئیں جن میں مدرسین کی رہنمائی کے لئے اچھا خاصہ مواد جمع کر دیا گیا ہے۔دوسری خصوصیت اس کانفرنس کی یہ تھی کہ اس میں کنڈر گارٹن کے نہایت دلچسپ اور سبق آموز مناظرے بتلائے گئے۔ جن سے نہ صرف حاضرین کو فائدہ بلکہ بے حد سرور و انبساط بھی حاصل ہوا تیسری خصوصیت مجلس مشاعرہ تھی جو مولوی عبدالحق صاحب بی اے پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ کے زیر صدارت منعقد کی گئی چوتھی خصوصیت سوشیل گیاو زنگ یعنی محفل احباب تھی یہ پہلا ہی موقع تھا کہ بلا امتیاز عہدہ و گریڈ کل مدرسین و عہدہ دار ایک جگہ جمع ہوئے اور تھوڑی دیر تک مل جل کر اپنا وقت بسر کیا آلات موسیقی بھی مہیا تھے جن جن حضرات کو فن موسیقی سے لگاؤ تھا انھوں نے اپنی دوستوں کی سامعہ نوازی تو فرمائی لیکن ذرا تکلف کے ساتھ انشاء اللہ تعالیٰ آیندہ محفل میں یہ تکلف باقی نہ رہے گا۔اور حسب الارشاد جناب مولوی شیخ ابوالحسن صاحب بہت سے اصحاب ایک سال کے عرصہ میں کافی مہارت پیدا کریں گے اور دل کھول کر اپنے کمالات سے دوستوں کو محظوظ و مسرور فرمائیں گے اس میں شک نہیں کہ ایسے موقعوں پر محفل احباب کی تجویز بالکل انوکھی اور دلچسپ تھی جس کی وجہ سے دو روز کی لگاتار حاضری او تگ و دو کی کوفت مطلق جاتی رہی اور کل احباب خوش و بشاش اور تر و تازہ ہو کر اپنے اپنے گھر واپس ہوئے۔امید قوی ہے کہ سال آیندہ مجلس مشاعرہ اور محفل احباب بہت زیادہ کامیاب ہونگے۔

نمایش اور فانوسی لکچر کا انتظام بھی سال حال اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا تھا اور ان ہر دو شعبہ جات کا کام بے حد اطمینان بخش اور قابل تحسین رہا جس کی وجہ سے کارپرداز حضرات مستحق مبارکباد ہیں۔

We can only make it our own by some service, and that service is to lend it love and beauty from our soul."

"Cherish the ideal of perfection, and to that, relate all your work, all your movement. Then though you love the material things of earth, they will not hurt you, and you will bring heaven to earth and soul into things."

Among the other important meetings which Dr. Tagore addressed during his stay at Hyderabad were one at the Nizam College and another at the City College. A report of the proceedings of the latter meeting, which had been arranged conjointly by the City College Union and the Hyderabad Teachers' Association, will appear in our next issue.

He expressed his appreciation of the principle of using an Indian language as the medium of instruction and congratulated the Chancellor, His Excellency the Maharaja Bahadur, on the success of the University. He also paid a fitting tribute to Sir Akbar Hydari, who had the vision and courage to launch the scheme and who has contributed so much to its success.

It was a lofty and inspiring message which the poet delivered to the students of the Osmania University. The following are extracts from his address:—

"Free yourselves from the meshes of self-abasement......and search in your own homes for things that are of undying worth..... Imitation belongs to the dead mould; life never imitates, it assimilates."

"We must accept truth when it comes from the West, and not hesitate to render it our tribute of admiration. Unless we accept it our civilization will be one-sided, it will remain stagnant. Science gives us the power of reason, enabling us to be actively conscious of the worth of our own ideals."

"We have been in need of this discovery to lead us out of the obscurity of dead habit, and for that we must turn to the living mind of the West with gratefulness, never encouraging the cultivation of hatred against her. Moreover, the Western people also need our help, for our destinies are now intertwined."

"No one nation of to-day can progress, if the others are left outside its boundaries. Let us try to win the heart of the West with all that is best and not base in us, and think of her and deal with her, not in revenge or contempt, but with goodwill and understanding, in a spirit of mutual respect."

"We, in the East, had once tried our best to muzzle the brute in man and to control its ferocity. But to-day the titantic forces of intellect have overwhelmed our belief in spiritual and moral power."

"Truth is for all...Science also is Truth. It has its own place, in the healing of the sick, and in the giving of more food, more leisure for life. But when it helps the strong to crush the weaker, to rob those who are asleep, that is using truth for impious ends and those who are so sacriligeous will suffer and be punished, for their own weapons will be turned against them as the signs are plain to-day."

"To be able to love material things, to clothe them with tender grace and yet not be grossly attached to them, this is a great achievement. Providence expects that we should make this world our own, and not live in it as though it were a rented tenement.

ing for expression, of directing its tendencies and instincts and impulses in right directions". The great problem of education is to find the right kind of teacher; and as Nawab Zulcadar Jung Bahadur said, the right kind of teacher is one who, possessing personality, sympathy and the spirit of self-sacrifice, "thinks of his duty as a test that is imposed upon him not by the educational authorities, but by something greater than they, that is, his own conscience", and who enters upon those duties "not with a sour face and words of grumbling but with deliberate determination to make of his surroundings something far better than he found them".

Nawab Zulcader Jung Bahadur's address is remarkable not only for the high ideals which he put before the teachers but also for his sympathy and regard for the teaching profession. It is encouraging for the teachers of Hyderabad to feel that the Educational Secretary has a keen appreciation of their disabilities. "I realise and regret", he said, "the disabilities under which so many teachers in these Dominions, as in other parts of the world, have to do their work. That work is always exacting for one who does it honestly, and, the material reward which is given to teachers is rarely an idex of the value of their work."

Dr. Rabindranath Tagore at Hyderabad, Deccan.

The public of Hyderabad owed to His Excellency Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, President of the Council, the opportunity and privilege which it recently had of hearing the great poet and international figure, Dr. Rabindranath Tagore, for it was on the invitation of the Maharaja Bahadur that the poet visited this city. The warmth of the welcome which was accorded to the distinguished guest could be guaged from the packed audiences which he addressed as well as the crowds of visitors who called at the Government Guest House personally to pay him their respects.

Shortly after his arrival here, Dr. Tagore delivered an Extension Lecture arranged by the Osmania University.

Editorial Notes

The Seventh Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

We publish elsewhere in this issue an account of the proceedings of the Seventh Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association, which was held on the 28th, 29th and 30th September, 1933, under the distinguished presidency of Nawab Zulcader Jung Bahadur, M. A. (Cantab), Barrister-at-Law, Home Secretary, H. E. H. the Nizam's Government. The Conference and the educational exhibition, which was held along with it, were a great success, on which we congratulate Mr. Shaik Abul Hasan, Chairman of the Reception Committee and Miss D. Webster, Chairman of the Exhibition Committee. The Kindergarten Displays, for which Miss M. E. Read, Miss J. A. Chamarette and Miss D. Nundy were mainly responsible, added greatly not only to the interest but to the usefulness of the Conference. Two reports were adopted by the Conference, viz., the reports prepared by the Kindergarten and Backward Children Sub-Committees, respectively. We are issuing the former as a supplement to the English Section and the latter as a supplement to the Urdu Section of this number of *The Hyderabad Teacher*, reserving the English version of the Backward Children Report and the Urdu version of the Kindergarten Report for the next issue.

The Teaching Profession.

The full text of the Presidential Address which Nawab Zulcader Jung Bahadur delivered at the Seventh Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association appears elsewhere in this issue. In this address he gave teachers much food for thought. Too often teaching in India is dominated by text-books and examinations. This is not education in the true sense of the word. As Nawab Zulcader Jung Bahadur has pointed out, "the teacher's great task is one of setting free the powers of the child which are struggl-

ficant in appearance that he was mistaken by strangers for a servant of the institution, had a wonderful record of attendance. During twenty-three years he had only been absent from duty for half a day, that on which his mother died.

I know you like a moral to be pointed—I will try to do it.

Why does Japan arouse such interest in you? Is it not because of moral qualities which have enabled her, alone of all Asiatic countries, to stand alone, to defy all invasion, and to make her independence not a reason for self-satisfaction and further seclusion, but a stimulus to struggle that is winning for her people the fullest opportunity to reveal and develop her great constructive powers in so many directions?

That is why we wish to know more of Japan, to visit the country and see the conditions in which her people live and work and make their wonderful plans.

Now every one of you here is a little Japan unknown, secluded, only to become of interest to the outside world if you assert your character and enhance it by sternness to yourself and kindness to others, strength of will, by endurance, by resolution, by opposition to evil, by a high conception of your duty in whatever situation, and by determination to make of that situation something more and better than when you entered upon it. By doing this you are making the best preparation for higher opportunities when they shall arise.

If you can imitate Japan in these ways, you too will become renowned, you will be sought out and however humble your work, you will add a fragrance and a glory to that work, and you will be given your country a fame of a kind she is happily, and largely through wise educational policy, now beginning to earn.

———

Physical Development to the Imperial Navy was so much troubled at having killed two Germans at Tsingtau, that he resigned and was spending his days and nights in meditation and religious practice. He had three fine children, a little girl and two younger boys, and when the two boys were taken from him by death within a month, he was convinced it was a direct result of his transgression of a divine law.

And I discovered that the true religious teachers of Japan are generally poor men of firm principles and earnest conviction, who, in school and jujitsu class, and still more often in private intercourse devote themselves to the encouragement of young men in the virtues which are the basis of Japan's greatness. "Who ever hath any advantage is priest to him that hath it not."

And everywhere there are men of affluence who are nobly and unostentatiously, like our generous friend the Nawab Salar Jung, helping students along their pilgrimage of learning.

Along with this great spiritual inheritance there goes a passionate devotion to self-improvement, and an ardent desire to learn everything of real value, from whatever land, everything which can enhance the fair name of Japan.

The marvellous increase in the vocabulary of the language during the present generation is a witness to this universality of interest. If you were to examine a good modern Japanese-English Dictionary you would realise what a task awaits those who, like Moulana Abdul Haq, are devoting their lives to the enlargement and ennobling of the Urdu language. And such is the efficiency and devotion of Japanese teachers, and such the eagerness and docility of Japanese children, that illiteracy is practically unknown. One of my colleagues in a certain College, an able professor who kept himself up-to-date by reading the latest books in European languages, and yet was so humble and insigni-

a lonely suicide, the complement of an overflowing population.

There is so much mystery about Japan because she lives in such close and affectionate touch with the Nature which commercial civilization is proud of subduing and turning to momentary use. Japanese houses are little more than arbours in the forest or on the mountain side, into which the sights and sounds and fragrance of the wide world freely enter. And the Japanese spirit has been chastened by countless disasters and cataclysms, to which the beautiful consolation of the Buddhist religion has always been an alleviation. The constant reverence of ancestors with slow and solemn ritual has also a steadying effect upon even the most perfunctory or volatile character. And the noble body of ethical teaching descended from Chinese sages who lived long before the Christian era, has established a stability of feeling and department and social intercourse which are most impressive.

The regulations established in this body of ethical precept and example are like sturdy pillars round which all the amenities and poetical moments of Japanese life cluster like ferns and mosses.

But these pillars themselves are only rigid as we feel conscience to be rigid. They stand as guides along the way of humanity, reminders of the supreme need of loyalty, and kindness, and self-sacrifice. And along with them are the lofty banners of enlightenment and salvation, borne by the first missionaries of Indian Buddhism, and still waving in every Japanese mother's heart; and many Japanese men of high standing who have been compelled to come out into the world and fight for their country have returned from the extreme of battle to the retreat of religious penance. Victorious generals and admirals have ended their days as Buddhist monks, in their distress at having had to take life. A Japanese friend of mine who had been Director of

The Japanese are play-actors, perhaps the ablest in the world, and the ability to play they can carry into the sternest circumstances of life. With them all they encounter can be expressed by a gesture, a few words like falling flower petals.

Because they are so close to nature, and so much at one, in their deeper, unalterable consciousness, with the deeper, unfathomable mysteries of Nature (just being symbolized by the advance guard of our physicists) they are being carried along as a people without the friction which we feel in Europe, where there are any number of people who possess the high and unconscious qualities of the Japanese but also other qualities beyond the reach of even the Japanese. The Japanese language does not permit of the existence of a Japanese Dante and Shakespeare; it does not even, except on its artificial Chinese side, exhibit that wonderful simplicity of English which has enabled it to be said that anything, however abstruse, from *a child is born to a soul is damned* can be expressed in words of one syllable.

Nor does the unique and solicitously fostered solidarity of the Japanese race allow of the individual rising to the height of independence attained in so many provinces of the soul as in Europe. But that will come, just because of the vitality which is the Mongol inheritance of the Japanese, and an adaptability which is inexplicable—a combination which will enable them to play in the larger world the great part which they feel is their destiny.

If you try to understand Japan in the way of Indian or Western logic you will be disappointed.

The spirit of Japan is a silence, a perfume, an empty shrine. You will find in it a falling leaf, which is the complement of the finest sword the world has ever known. You will find in it the echo of a bird's song, the complement of a huge and busy dockyard. You will find in it

When I reached Japan in 1908 I was much struck by one result of this. Out of the population of the Russian Empire, statistics declared that 97 % were illiterate; of Japan 97 % were literate.

This determination to educate herself in the modern sense Japan is extending to what she feels to be her greater self, the vast multipartite race from which she has descended, a race which comprises a third of the world's population.

She feels that, in the confusion caused by the limitless spread of new knowledge in a world which is fast losing the old wisdom, she has the secret of recognizing what is salutary in that new wealth of knowledge. And that being so she feels that the teaching she can give the other members of her family will be more efficacious just because it has gone through a process of internal selection: it is external knowledge that has been assimilated to the particular needs of minds and social conditions very differently organized than those of the West. The Japanese form of the Munroe Doctrine has an organic basis.

The Japanese are in the possession of a great secret; they know the meaning of restraint, of avoidance of excess, of a restrictive economy.

Paradoxical as it seems, they are being rapidly propelled into a future of undreamt of power and renown, just because they have this centripetal instinct of drawing back to organize more efficiently instinct of submitting to the wild stampede for so-called wealth which American life has exhibited—and which the world was imitating.

Their own greatness is as inexplicable to them as to us, and at best they can only suggest it as they have done in a few tiny poems and apologues.

It is organic, the greatness of a people far from being over-intellectualised, too wise to become merely cerebral, to succumb to any vogue or fashion.

In Japan it was the last which I heard most frequently discussed and enjoined. My own experience was rather wider. What I found to admire in the Japanese was his frugality, love of simple, natural things and hatred of extravagance; his patience and perserverance, kindness and courtesy, his readiness to face any kind of evil, including the evils of his own racial and individual inheritance; his passion for ensuring what he conceives to be necessary to the improvement and advance of his people, his fearlessness confronting any circumstances, his wisdom and far vision, the rapid extension of his human survey, not necessarily in challenge, but with a friendly readiness to co-operate in all good works,—and perhaps above all, a power of retrieval, of constructive amelioration which is not generally known, but without which he would be little more in the greater world than a Japanese.

We should also remember the restraint of the Japanese military organism during the past twenty years. They have had an army and a navy, both trained to the last effort, both spoiling for a fight, and they have held them on the leash while the rest of the world was going at it hammer and tongs. The wonder is that they have not broken out more frequently.

Japan's great value lies in the fact that she values discipline as few peoples in the world do, and combines in a wonderful way both sternness and almost universal good nature. And in imposing her discipline upon a considerable section of the people of the mainland of Asia she is deserving of gratitude.

Having undergone this discipline of centuries, the Japanese has a self-respect and a feeling of national worth and solidarity which, however, ill they may accord with his so-called physical deficiencies, make him peculiarly resentful of the shortcomings of other branches of his racial ancestry. He has something to teach them all that will save them, and about this he is just as keen as the religious missionary is about his task.

Russia when Japan was cheered on by the whole world? That on that fatal day more material loss was sustained in five minutes than in the whole of that war against Russia?

Just imagine what a similar disaster, spread over only two or three times the area of the last would mean to Japan. She would be finished. Except that she would again, for the sake of her human virtues, draw the sympathy and help of the civilized world. Before I left Japan ten years ago the establishment of a new capital on the mainland was being seriously discussed.

If it were possible for any one of us to project himself into the place of a Japanese for a few hours, he would understand another fact well realised by the people of Japan, that they have emerged from obscurity into a world in which they were not wanted, and that their national existence can only be maintained in this jealous world by resolutely facing the situation. They have passed the period when the sentiment of that world was on their side; they know that the huge accumulations of more and more deadly armaments can be only too readily let loose by the parties or powers interested in their production. This is not a point that needs to be laboured.

Thus the Japanese, dangerously isolated as he is, and thereby prone to magnify danger, feels himself insecure in his ancestral tenure, and faced by the hostility of the rest of the world.

His great qualities and abilities, which are precisely those that are needed in the world to-day, are ignored or but grudgingly recognised in our most common estimates of him. They have been enumerated by Prof. Harada as:

(1) Giri: the sense of Obligation.
(2) Hóon: the sense of Gratitude.
(3) Renketsu no Sei: the spirit of Disinterestedness.
(4) Chùkò: the virtue of Loyalty and Filial Piety.

Japan's interests here are vital, that just because Japan's trade with China is of paramount importance, Japan must be and will be the guardian of peace in the Pacific.'

" A good deal of the "trust and good will" to which he referred has been dissipated during the decade that has elapsed since the Washington Conference. Americans have allowed themselves to be fooled by Chinese propaganda into thinking that they will profit from acting as China's cat's-paw. The Chinese have no more love for Americans than they have for the Japanese or any people alien to themselves. The bitter anti-foreignism now being taught in their schools is indiscriminate and impartial. They boycotted American trade in 1905 as cheerfully as they did British trade in 1925 and as they have more recently boycotted Japanese trade. When they set out to murder foreigners, as in the Boxer uprising, they make no distinctions of nationality, age or sex.

The Chinese have a sense of humour. They laugh easily. The spectacle of Americans fuming over Japan's doing in its own backyard what we insist upon the right to do in ours affords them an opportunity to indulge one of their most natural propensities."

These lines I have just quoted come from a long article by an American who is one of the few to do justice to the Japanese point of view.

The Japanese win the admiration of many thoughtful Englishmen because they do things, they advance. For them to run away from a difficulty, in the Chinese way, is unthinkable.

The fall of Port Arthur, won by a self-sacrifice unequalled in history until the Great War, is a matter that cannot be forgotton with impunity. But there is one thing impending which can only be overcome by a kind of flight, and that is the ultimate submergence or destruction by earthquake of so much of Japan as to menace the very existence of the people as an independent nation.

Has there ever been anything in history to equal the recovery of Japan from the terrible losses incurred ten years ago?

Do you realise that on September 1st, 1923, more Japanese lives were lost in five minutes than in the War against

The Chinese have to undergo a fusion. The fusion of Japan is a wonderful example for both China and India to attempt without the bloodshed which it cost Japan up till 1600.

With regard to the relations of Japan and America, they were, in their inception, commercial, and mainly commercial they remain to-day. During the rapid advance of Japan's commerce with the outer world, a remarkable transformation has taken place in her attitude towards trade and traders. In the older days the merchant class, and all who handled money, occupied a very low position in the social hierarchy partly because trade involved the besting by one party of another by some means or other, and so a loss of face. But with the unparalleled transformations of Japanese life beginning in 1871, when the Samurai class was dissolved, the people who handle money have risen not only to the surface, but to a height from which they can dictate to the whole nation.

And during this process they have added to their own particular forms of ingenuity much which they have learnt from foreigners both reputable and disreputable Japan to-day has some of the finest representatives of commercial integrity in her great shipping and banking families. She has also, as all countries have, middlemen of another kind, who do not represent the almost universal honesty of the Japanese workman, but in their eagerness for immediate profit, force down the quality of workmanship, regardless of samples, and so bring about such disrepute as resulted in a very unjust condemnation of Japan during the War.

In the *American Mercury* for last January was an article entitled *American Delusions about China* containing this passage:

"Ambassador Castle made this significant statement, as he was leaving Japan shortly after the Washington Conference:

'What America must learn and can far more easily learn in this era of post-conference trust and good will is that just because

coming a chaos just for the want of all the restrictive and constructive ideals for which Japan stands, and in regard to which she has proved herself supreme.

The Chinese need a sterner discipline than any the West is likely to provide them with. And they need Japan's help in this matter just because they have failed to put themselves under the succession of the hardest disciplines which the Japanese have willingly undergone, especially since the decisive battle of Sekigahara in 1600, which united the turbulent feudal elements.

And the last discipline is one like those dreadful ones imagined by the monks of old. It is the discipline of *material civilization*, which Japan is passing through as in a desperate race with the great powers into whose company her wonderful qualities and abilities have led her.

It is a discipline, as all the world knows, which involves devotion, self-sacrifice, toil and patience equal to any of any age in history.

It is one which excludes triviality, slackness and useless talk. It demands pertinacity, wide-awakenness, and definite character. And above all its most serious demand upon the higher faculties is the recognition of the supreme importance of what our psychologists call the emergent process, by which higher levels of being and unexpected visions of possibility are attained through experiment, which means conscious active annexations of new fields, as opposed to the inevitable stagnation resulting from merely passive experience.

The Japanese know that they alone in the Far East have any chance of stemming or forestalling the coming dangers, and they have most drastically shown their own kinsfolk the Chinese how far they are from being able to defend themselves when matters become serious.

Both disasters may be ascribed partly to a want of higher wisdom, but also partly to a state of panic affecting the whole people, an abnormal disturbance arising from long brooding on some obsession.

The Japanese nation has not proved exempt from this liability in the past. She is still isolated, in spite of all modern conveniences of communication. And I can well imagine the quandary in which she finds herself now. I can imagine the strain imposed upon her statesmen and especially upon such benevolent and entirely lovable people as the Emperor and Empress and their families, beloved as few rulers have ever been.

Even thirty years ago a far-seeing Japanese thinker, Kakuzo Okakura, whose memory is now reverenced at a special shrine in Tokyo, and who is one of the few Japanese to compel our admiration by his command of style in English, wrote these words, which reveal something of the national anxiety.

"But to-day the great mass of Western thought perlexes us. The mirror of Yamato is clouded, as we say.... We know instinctively that in our history lies the secret of our future, and we grope with a blind intensity to find the clue. But if the thought be true, if there be indeed any spring of renewal hidden in our past, we must admit that it needs at this moment some mighty reinforcement for the scorching drought of modern vulgarity is parching the throat of life and art.

We await the flashing sword of the lightning which shall cleave the darkness. For the terrible hush must be broken, and the raindrops of a new vigour must refresh the earth before new flowers can spring up to cover it with their bloom. But it must be from Asia herself, along the ancient roadways of the race, that the great voice shall be heard.

" Victory from within, or a mighty death without".

With her faith in her destiny and mission as the mainspring of her national existence, Japan cannot consent to dictation by any power, not even the League of Nations, in the matter of her relations with the remnants of the Chinese Empire with which she has been bound up from time immemorial. The whole of that vast region is rapidly be-

After fifteen years of unbroken residence in Japan, during which time I enjoyed the friendship of people of all classes from the humblest to the highest in the land, my final belief is that in all the confusion of the Far East it is a fine thing to have this stern unbreakable spirit of national pride rising into very real power. It is not sinister ultimately, and the world will yet be greatly glad of it.

The Japanese are a people who love order, who have a passion for bringing chaos into constructive processes. They are not destructive by nature, and it is their pride that they draw the sword only in self defence.

If you ask me why they attacked China last year in defiance of the League of Nations I answer in this way.

They have drawn the sword against their own kinsfolk, the Chinese, because they sense a great treachery, the failure of the Chinese to put an end to the complacency and corruption which are so terribly dangerous, and which threaten the safety of the civilization of Japan which is not, as many people think, becoming merely imitative of Western Civilization.

No : Japanese civilization is one in which the basic concepts, so much more than material evidences, are of Chinese origin.

The child is now punishing the parents for doddering neglect of the common traditions which may be termed the practical religion of the Sino-Japanese race.

Anyone who knows Shanghai can understand how it is more than possible for the stern Japanese to regard it as a symbol of Chinese willingness to undergo a subservience to the danger to which Japan put an end at home exactly three centuries ago.

The massacre at Shanghai was a disaster to humanity. It cannot be justified, any more than the Great War, by any religion or system of ethics followed by civilized peoples.

7 The Japanese, with their cautious and negative ability, can show us how to do without things and yet be clean and happy and efficient.

8. A little Japanese girl of six or so, her mother and her young grandmother were racing up the mossy steps into the park, and the grandmother won.

9. They told me of a general whose anger made the tiger afraid, and whose laugh rejoiced the children.

10. An old Japanese poem says; We see a waterbird swimming easily, but we do not see the continual struggle of its feet.

11. A student wrote of a certain festival: See the smoke from burning incense drifting in the air, its end joining the Milky Way in which the souls of our ancestors are twinkling as stars.

12. Poor people in Japan plant a *kiri* tree when a daughter is born, and when she is to be married *kiri* is made into a *tansu* or chest of drawers.

13. As I walked home in the moonlight with my friend, he told me that his old mother in south still worships the new moon, and therefore whenever he sees it he thinks of her.

14. The voices of the students as they cluster in the school grounds are like the voices of sailors guiding a ship over a still and sunny sea. Life and vigour are in all their strong bass tones; even their laughter has the mellow resonance of deep and ancient jars.

15. The roof of my neighbour's house is held down by a thousand water-worn stones, but up into the infinite blue of the windy sky rise unchecked the mournful cadences of a deep harp, and the poignant music of a little girl innocently singing of olden tragedy.

16. In the lane is a boy of eight or nine, the son of a banker, playing with his sister. He has a wooden sword and his actions in wielding it either as a sabre or as a two-edged blade are amazing. It is as though all the skill of his forefathers had been born in him again. The sudden stop, parry, thrust, — all instinctive and swift as a swallow's flight.

17. In the heart of June in Japan there are no more delightful visions than the little school girls in their wide golden sun-hats and their skirts of crimson, maroon or purple, lingering in happy talk beneath the green shade of willows swaying in the wind.

To-day, ten years later, the whole world is watching the spectacle of a people just emerged from a feudal hierarchy in which trade and traders were regarded with contempt, and commercial intercourse with the rest of the world could hardly be said to exist, now united as one man in a determination to show the world how the gigantism of commerce can be reduced and the general inflation and parasitism of modern life drastically rectified.

These are the outstanding developments of Japan during the twentieth century, and besides these what do we know of that strange and astonishing people whose genius has stolen upon a heedless world in the slow and silent way of elemental things?

Let me just take you back with me into the Japan I know. Here are seventeen things I take from my many note books. Seventeen, because that is the number of syllables in the favourite kind of Japanese poem, the *hokku*. And you know that every syllable of a real poem is like a seed which may grow into a mysterious tree.

The seventeen syllables I have put togeter are these.

1. In the fifteen years of my stay in Japan I saw only two beggars.

2. I found the Japanese much interested in the subtle use of the useless.

3. Out of college hours I used to see my pupils putting up my telephone poles or delivering milk, anything to enable them pay themselves for their higher education.

4. I never saw children punished.

5. When I offered a railway porter some bakshish for helping me, he refused to take it. When I put it into his hand, he let it fall on to the ground. I felt very small and learnt that day some thing about Japanese character.

6. You can speak to any Japanese, of whatever rank, in a train, and you will get a kind and courteous answer. A Japanese friend said to me: 'If we wish to be happy, we must bid even the lowest servant good morning.'

that way they created the alphabet of forty seven letters used to-day in Japan to simplify writing.

And there is a little story still told in Japan about three travellers meeting in that old city of Lohang. One came from India, one from Japan, and one from China. The Chinaman said ; "We meet here as if to make a fan, of which China represents the paper, you from India the radiating sticks, and our Japanese guest the small but necessary pivot."

To-day we are reading daily of a momentous meeting, at Simla, of representatives of three great peoples. The Japanese are again guests, and it is my belief that their presence is symbolic of very momentous things indeed.

In all friendliness representatives of the ruling powers of the Far East and the Far West are meeting midway between East and West, both of them guests of Mother India, to whom they are so deeply indebted for ideas and ideals associated with the very origins of the civilizations they have evolved. Have we not reason to hope that these friendly talks about trade in the necessities of decent life may have a result which will go still deeper and bring about new relations between India, England and Japan such as all true and human effort aspires to, and which must be preceded by fuller and richer mutual understanding?

Only a few years ago the whole world was ringing with the renown of the poor brave Japanses who at a piteous sacrifice of lives struck the first blow at the corrupt tyranny of Russian people as no internal movements had been able to do.

Twenty years later in 1923 the whole world was watching the prosperous and powerful Japanese staggering under a blow which was one of the most awful natural catastrophes recorded in history.

Hyderabad, to worship at Elura and Ajanta, of whose glories their forefathers learnt from those early Chinese Pilgrims. Here let me just tell you something characteristic of Japanese thoroughness and patience. Some years ago two Japanese artists came to Hyderabad to make pictures of the frescoes at Ajanta and on their return to Tokyo the *Kokka*, the greatest art-journal in Asia, reproduced some of their pictures in colour. One of them I have with me. To reproduce the exact colouring of the original, the printers actually imposed the block in its various parts no less than one hundred and ninety times.

And I can assure you that to-day Japan knows a great deal more about India than India knows about Japan. It was a Japanese who wrote these words a few years ago: "In India, too, there is a lull in those discussions of the Abstract and Immutable, which began with the Upanishads and culminated with Nagarjuna in the second century; and we catch a glimpse of the great river of science which never ceases to flow in that country. For India has carried and scattered the date of intellectual progress for the whole world, ever since the pre-Buddhistic period when she produced the Sankhya philosophy and the atomic theory; the fifth century, when her mathematics and astronomy find their blossom in Aryabhatta; the seventh, when Brahmagupta uses his highly-developed algebra and makes astronomical observations; the twelfth, brilliant with the glory of Bhaskaracharya and his famous daughter, down to the nineteenth and twentieth centuries themselves. with Ram Chandra the mathematician, and Jagadis Chunder Bose the physicist."

A thousand years ago in China of the great Tang dynasty, there were present in Lohang, a city so famous in Chinese poetry, ten thousand Indian families and more than three thousand Indian religious teachers. And we are told that one of the things these teachers did was to give phonetic value to the characters used in Chinese writing, and in

she learnt in early days from India. Those great apotheoses of the noblest human qualities and aspirations which we sometimes call the gods of India are present everywhere in Japan. Close your eyes in festival time there and you will imagine you are in India. Open them wherever you travel and you will see the traces of Indian missionaries of over a thousand years ago. Siva is there, Sri Krishna is there, and on every little island round the coasts of Japan is a shrine to Sarasvati. That cultural invasion of Japan by Indian ideals came to an end because India was herself invaded in very different ways, and had to draw back upon herself; but not before she had been able to give to Japan enough to transform and beautify life there into something unique in the history of man, a process which was very powerfully supported by Chinese teaching, in which the supreme law of life was renunciation.

The wonderful art of Japan, of which I have no opportunity to speak here to-day, much as I should like to do so, would have been impossible without the humanizing influence of Indian religious teaching, which, providentially for Japan and the world, was able to subdue the tendency to devil-worship which is almost ineradicable in that most vigorous Central Asian stock we call Mongol, whose ramifications now reach all over the globe, and of which we have, perhaps, in our English poetry a last sublimation in *Paradise Lost*, though in our modern literature of terror and crime from *Frankestein* to *Wuthering Heights* and *Dr. Jekyll* and *Mr. Hyde*, we sense the possibilities of its revival.

In Japan it was Buddhism which softened all those ever-present terrors, and reduced them to the friendly region of the fairy-tale and the folk-dance. And that is a marvellous thing for missionary effort to have done. But it is only natural that Japan should look to India with affection as to a Holy Land and send her sons and daughters here on pilgrimage, here to this very State of

manhood and counsel you to avoid self-pity as you would the plague: to steel yourself against despair by giving yourself entirely to your work in the incomparable spirit of the poet Shelley, who said in ever memorable words:

> To suffer woes which Hope thinks infinite;
> To forgive wrongs darker than death or night;
> To defy Power which seems omnipotent;
> To love and bear; to hope till Hope creates
> From its own wreck the thing it contemplates;
> Neither to change, to falter, nor repent;
> This, like the glory, Titan, is to be
> Good, great and joyous, beautiful and free;
> This is alone Life, Joy, Empire, and Victory.

The Meaning of Japan

BY

Prof. E. E. SPEIGHT

(Of the Osmania University, Hyderabad, Deccan.)

In 1908 I was sent by my friend Sir Israel Gollancz, the Secretary of the British Academy, to teach English in a Japanese College. After nine years in an old western city I was called up to the Imperial University in Tokyo, to the post formerly held by Lafcadio Hearn, and I also lectured in what is now the University of Education. In 1923 Sir Syed Ross Masood brought me to India, the original home of so much in the religion and culture of Japan. For my Indian teacher friends I am writing these words on the meaning of Japan, at a time when the general ignorance about that country and its people is the cause of much injustice to them and to ourselves.

It is natural that young people of India wish to hear more about Japan, not only because of her modernity, but also because Japan owes so much of her goodness to what

will always be neccessary for us to invite and welcome representatives of both practical activities and ideal aspiration in which we are, and for long shall be, unable to enjoy the share we can only deserve by strenuous, faithful toil such as you teachers are called upon, with the help of God, to perform.

I have spoken like this because I wish to encourage you, not by flattery, but by helping to make your position and your duty, and the opportunities they afford you, more clear. I want you to feel that though your difficulties and disappointments are many and great, they are known and shared by others, though you may not be aware of it. And I want you to feel, above all, that though you may think that because you are given the great responsibility of training the dearest things we have, our little children, you should not conclude that your own education is complete. When you go out into the world the hardest part of your education is beginning. You have to be very earnest with yourselves, to read much, to resist much and to learn to understand much which you may think does not concern you. And for that you will find that what some of you regard as isolation and banishment in the country gives far greater opportunity than life in a city where there are so many temptations to throw away one's time and energy. Our Prophet has said :

> "You can no more mix with the world without being contaminated with it than you can go into water without being wet."

You are called upon to mix with a very different world, the purer world of children with their innocence. their affection and desire for affection, and their inexhaustible power to give the greatest of gifts, the consolation of happiness.

If you cannot find happiness in the company of the children you are teaching, then, in plain words, your own education has been on wrong lines. If, in spite of all, the world is too much against you, I can only appeal to your

that is, his own conscience. He must enter upon those duties, however mean they may seem, not with a sour face and words of grumbling but with deliberate determination to make of his surroundings something far better than he found them. There may seem to be no chance for him at all in such a situation, and the future may seem very dark to him. But let him remember the words of Oliver Cromwell: "No man rises so high as he who knows not whither he is going."

To retrace my steps a little, let me say to you that you can only at your own peril refuse to recognise the outer world and its claims upon your attention. The relations of human forces in this world are very difficult to understand; they move, like God, in a mysterious way, because they are the ways of God, the warning of God, the loving wisdom of God. It does really seem as if He intended that we shall only be able to advance in such ways as these, by a combined struggle against waves of opposition; and that our individual advance shall only be the result of gradually higher conflict, what scientists call evolution or accommodation to environment. Where your resentment is against the fact that less capable people than yourselves are usurping your rights, it is a just resentment. Where you are resisting the presence of outsiders whose efficiency should be an example to you, yor are most certainly not asserting yourselves in the right way. You are in difficulties, because you are yet in the dark. You forget that although Hyderabad is now very much better known than ever before, and although we have much latent human ability here, we are yet far too much isolated, far too little prepared for competition in the open world. That outer world is necessary to us; it is a condition of our progress, of our very existence. If you cannot realise this it will be forced in upon you in ways ever more convincing. And as it is physically impossible for many of us to live long enough in that outer world in order to bring about profitable relations with it, it

succeeding beyond expectation, both in class work and prowess in the athletic field. And our Osmania University, which is a dazzling landmark in the history of Indian Education in India, is drawing into its area an increasing number of students to whom Urdu is a second language By combining the cultures of East and West it is sure very soon to acquire international reputation, and so to bring wider recognition of our motherland and its gifted Ruler, who himself, by virtue of his scholarly and poetic interests and capacity, is very much at one with the ideals of the University.

I have spoken of the disabilities of a teacher's life, which I know are often aggravated by loneliness, by the feeling of banishment and the desire to be transferred to Hyderabad, where tempting and questionable forms of enjoyment are increasing. But for all but the few destined to high station, this inability to make oneself at home in one's allotted station and to draw the best from it is, in my mind, a still greater disability. And for a teacher it is fatal. For children, as we can remember ourselves, are very sensitive, very quick to sense the sincerity, or otherwise, of those with whom they are associated.

Every teacher who feels that, by being placed in what he regards as a lowly station among lowly people, life for him has no interest, must do as all great and true souls have done. He must face the facts and beat them by his character. Let him remember the words of Montaigne, the father of the modern essay :

'Even from the poor does Nature extract every day effects of constancy and patience, more pure and manly than those we so inquisitively study in school.'

He must never feel that he is being neglected, because if he feels so he will be neglecting himself, which is far worse than being neglected by others. He must think of his duty as a test that is imposed upon him not by the educational authorities, but by something greater than they,

which it can master, the much more vast regions which it can only dimly suggest to imagination, give to those whose minds have travelled beyond the daily round an amazing richness of material, an escape from the triviality and wearisomeness of familiar routine, by which the whole of life is filled with interest, and the prison walls of the common place are broken drown. The same love of adventure which takes men to the south Pole, the same passion for a conclusive trial of strength which leads some men to welcome war, can find, in creative thought an outlet which is neither wasteful nor cruel, but increases the dignity of man by incarnating in life some of that shining splendour which the human spirit is bringing down out of the unknown. To give this joy, in a greater or less measure, to all who are capable of it, is the supreme end for which the education of the mind is to be valued."

BERTRAND RUSSELL.

And let us not lament the glory that has gone. Much of it, especially in this much harassed land of brief dynasties and constant warfare, was wrongly based on love of pomp, on cruelty and vengeance. From that past we can learn of another kind of glory, of tense endeavour, of loyalty to great ideals, of the sense of duty and responsibility, which in themselves are treasures above all material accumulations. These are the treasures of the mind and of the heart, the possession of which has kept alive the noble and heroic names of the past. Mr. H. G. Wells has assured us that: 'Only the spiritlessness of our present depression blinds us to the clear intimations of our reason that in the course of a few generations every little country town could become an Athens, every human being could be gentle in breeding and healthy in body and mind, the whole solid earth man's mine and its uttermost regions his play-ground.'

This is a fine and encouraging prophecy, and to it I should like to add some words of my own, which seem, perhaps, likely to be realised even sooner. As you are all aware, Education has made great strides during the glorious reign of our beloved sovereign H E. H. Mir Osman Ali Khan. Real eagerness and earnestness mark the work of our educationists, from the kindergarten up to the highest institutions. The experiment of the Jagirdars' College is

we realise also that the most valuable excercises of the scientist, his methods and processes, are being brought into the service of education generally, we surely have reason to rejoice.

The acquisition of scientific method, an increasingly important part of the art of teaching, is a very valuable thing for the teacher. The knowledge that he is a forerunner of a spiritual renaissance that is assuredly preparing should support him in his arduous task. It has been asked how a man can live in the higher regions of human fellowship while he has to play a part in a world where most men are eagerly bent on self-advancement. 'How live in celestial places while our feet tread the modern streets?' And the answer is latent in these words of Miss Vida Scudder :

"To learn how is a task involving no small degree of self-restraint, initiative and endurance; it is of those hidden tasks involving unseen martyrdoms by which the world is saved."

Perhaps I may be excused for saying that I am not one of those who care to dream or talk vaguely of some Golden Age to be. My reading of history shows me the sad futility of that attitude. But in another sense I do look forward to the opening of possibilities, to the amelioration of life by earnest effort, to the discovery of things that are as fantastic dreams to-day, even as familiar things to-day, such as aviation, television and the revelations of the microscope, telescope and spectroscope, were but dreams, if even as much as that, to the great men of old. It is true in this sense that the present world with all its fever and trouble will pass away and in its place will arise a new world full of young spirit and hope, and what is still better, of determination. Again I have recourse to the words of Lord Russell :

"The world in which we live is various and astonishing; some things that seem plainest grow more and more difficult the more they are considered; other things, which might have been thought quite impossible to discover, have nevertheless been laid bare by genius and industry. The powers of thought, the vast regions

How is this to be effected is a matter which has long been engaging the attention of modern educationists, and many are the schemes and isms devised to bring us nearer to its attainment. But to me it seems to resolve itself into a question of personality, of readiness to sacrifice oneself, of devotion to a noble if a lowly task. All great teachers have given examples of renunication. We all know, and regret, that the work of teachers, and of primary school teachers especially, is hard and ill-paid, although it is just such work on which so much depends.

The late Principal of King's College, London, Prof. Ernest Barker, has given us clear lines of direction in this work of developing the cultured State. These are his words:

> "The concern of a community which is a community of minds is essentially with mind. And education, which is the way in which that concern is expressed, is a deep matter—deeper than it is assumed to be in our current thought. It is concerned with knowledge; but it is also concerned with taste and conduct. It is a preparation for work; but it is also a preparation for leisure. It is varied and divided according to aptitude and functions; but it is also a way of unification which makes an homogeneous society. It raises problems of grants and their methods—of salaries and pensions—of time-tables and curricula; but beyond administration there lies the most fascinating work which is given to man, the work of the teacher, the work of the grown, trained mind engaged in quickening contact with the growing mind of the young. What can a man desire more?"

This is a bright and inspiring programme made by one of the most hardworking of living teachers. But it is more than a programme. It has shown us clearly that the modern conception of education is one which combines that of the religious teacher of the nineteenth century at its best, and that of the man of method, the scientist. It is the resultant of two forces working for human welfare. We may deplore the obvious fact of decay of former religious beliefs; we may resent the encroaching and gathering strength of science. But when we realise that the zeal of the religious reformer and the missionary is being perpetuated in the school teacher, whose work is thus being spiritualised, and when

teachers. The outward helplessness of the child and the appeal of dependence make him conscious of the responsibility of a trust. His imagination shows him what the child may become, for good or evil, how its impulses may be developed or thwarted, how its hopes must be dimmed and the life in it grow less living, how its trust will be bruised and its quick desires replaced by brooding will. All this gives him a longing to help the child in its own battle; he would equip and strengthen it, not for some outside end proposed by the State or by any other impersonal authority, but for the ends which the child's own spirit is obscurely seeking. The man who feels this can wield the authority of an educator without infringing the principle of liberty.

In contrast to this ideal how often we find young people looking back to their school days with bitter remembrances of the harshness or dullness or want of sympathy of their teachers. Discipline and book-learning they may have had; but what of those other things, which they missed, though they may perhaps, not be able to name, such things as have been enumerated by an eminent former member of the Board of Education in London, Sir Robert Morant:

"Teachers can endeavour, by example and influence, to plant in the children habits of industry, self-control, and courageous perseverance in the face of difficulties; they can teach them what is noble, to be ready for self-sacrifice, and to strive their utmost after purity and truth; they can foster a strong sense of duty, and instil in them that consideration and respect for others which must be the foundation of unselfishness and the true basis of all good manners."

This, you will agree, is a large order, and a very different thing from the operation of moulding clay into the forms of vessels. The moulding has been done by God. The teacher's great task is one of setting free the powers of the child which are struggling for expression, of directing its tendencies and instincts and impulses in right directions. In other words, of giving opportunities as well as instruction to the young.

Education has been defined as the bringing of mind into the masses, and so developing the cultured State, which is the only possible foundation of a society worthy of humanity.

perhaps still fewer can see in imagination the as yet unnamed result which comes about when teachers and children are associated in happy conditions of sympathy.

It is a matter of pride to us all that we have in Hyderabad two very fine illustrations of this desirable attainment, of which I can speak from personal experience. There are perhaps too many who are unaware of the fact that in the Chadderghat High School, so ably directed by my friend Mr. Pickthall, one of the most excellent things in an excellent school is the Kindergarten, which has been for nine years a haven of delight to tiny Hyderabadis. I think I am right in saying that it is the first Kindergarten in the State conducted in Urdu, and in its able director, Mr. Syed Pir, we have a most valuable asset. The other example to which I would draw your attention as a place to visit before you leave the city to resume your duties, is the Victoria Memorial Orphanage, which under the control of Mr. and Mrs. Allix has been transformed as if by magic from its former pitiful condition into an institution which has by competent judges been declared to be the first of its kind in India. Any one who will take the trouble to spend an hour or two in the Orphanage, with the children in their study, manual work or play, will find his heart greatly lightened, and will understand why it is that their Highnesses our Princesses take such a keen practical and helpful interest in the institution.

A teacher of the kind I have referred to is too wise, too reverent, too full of enthusiasm and faith to regard himself as a potter moulding clay. He feels, as Bertrand Russell has said:

> "He feels in all that lives, but especially in human beings, and most of all in children, something sacred, indefinable, unlimited, something individual and strangely precious, the growing principle of life, an embodied fragment of the dumb striving of the world. In the presence of a child he feels an unaccountable humility not easily defensible on any rational ground, and yet somehow nearer to wisdom than the easy self-confidence of many parents and

despise even those who are outside the pale of society. He says: "Once I was walking with the Caliph Omar near Mecca when we met a shepherd's slave-boy driving his flock. Omar said to him: 'Sell me a sheep.' The boy answered: 'They are not mine, but my master's.' Then, to try him, Omar said: 'Well, you can tell him that a wolf carried one off, and he will know nothing about it.' 'No, *he* won't.' said the boy, 'but God will.' Omar then wept, and sending for the shepherd purchased the boy and set him free, saying: 'For this saying thou art free in this world and shalt be free in the next.' "

We have been reminded in recent years that the teacher of children has to face one of the great paradoxes of life. He who has lost his innocence has to guide the innocent; the child who is uncontaminated by what we call the world, that great bundle of contradictions in which the evil often seems so much more prevalent than the good,—the little child in its purity has to be handed over to the care of those who have lost their childlike nature, who at the very least have been saddened or hardened by the stern facts of life.

I am not going to suggest any possible logical or psychological fallacy here. My studies in Islamic history, in European Humanism, especially of the times of the Italian City States when the turbulence of life was extreme, these and my long contact with teachers and taught in this my own country, have borne it in upon me how much of the truth of fact there is in this statement. It is one of the things we have to take for granted. But, ladies and gentlemen, I should like to emphasize to-day that there is another way of looking at it. Too many people in their consideration of Education are obsessed by the superiority of the teacher to the child. Too few realise the possibilities of the child being able to teach his teacher, not, by instruction of course but by the quiet influence of his presence. And

profits by the experience and errors of its predecessor something will have been gained. 'Tis a good thing to have ideas and ideals. It is a finer thing to make the most of one's material and circumstances amidst the vagaries of human nature, the disappointments of experience, and the obstructions of life.' "

J. M MAXWELL.

As you are aware, the objects and methods of education are being subject to much criticism. It is right that these criticisms should be considered and that the theories arising from them should be discussed and tested, even though, as many of them do, they contradict one another diametrically. But it is most certainly not right that we should lose our heads as a result, that we should allow ourselves to forget the main duties of our strenuous lives as teachers. For these are duties which are dictated by the facts and needs of human nature, not by the superhuman possibilities which are being daily disclosed by mechanical developments or abnormal human ingenuity. These are fundamental duties, and as Sir William Ramsay has reminded us: 'From the teacher's point of view it is always well to be obliged to go back on fundamentals.'

Let me say at the outset that I realise and regret the disabilities under which so many teachers in these Dominions, as in other parts of the world, have to do their work. That work is always exacting for one who does it honestly, and the material reward which is given to teachers is rarely an index of the value of their work, though I admit that there are cases where these words can be taken in another sense. In Hyderabad, too, teaching has to be conducted in adverse conditions such as much poverty, much heat and dust, and dreadful epidemics, disabilities against which the Government is slowly but steadily making headway.

But a real teacher who knows the nature of his pupils, knows also that even among the very poor and those we call the illiterate, the greatest things are never absent. There is a beautiful little story related by an Arab writer named Abdulla Ibn Dinar which shows us how we should never

Presidential Address

BY

NAWAB ZULCADER JUNG BAHADUR, M. A. (Cantab.),
BARRISTER-AT-LAW

Home Secretary, H. E. H. The Nizam's Government

It is customary on such occasions to utter what has become a formula of thanks. In my case this is not going to be a formula. I deeply appreciate the honour which the Hyderabad Teachers' Association has shown to my office and to myself by inviting me to give the inaugural lecture here to-day. This I say because I am about to speak to teachers for whom and whose often thankless task I have the greatest respect and sympathy, knowing a good deal of their difficulties and the spirit with which they meet their responsibilities.

We are now passing through a period of reaction to the greatest, most exacting War the world has known, and in spite of all our advance, our wealth and our increase of knowledge and ability, we are unable to rise from the depression involved The depression is not merely a matter of financial readjustment. For many unfortunate people it means also the bankruptcy of so many beliefs, theories and assurances. The result is that we hardly know what we are doing or where we are moving. A recent writer, Mr. J. H. Maxwell, discussing some dissatisfaction with Education on the part of Mr. H. G. Wells has said:

"In education we are confronted with an insoluble problem, and grope blindly in the dark. Education should be a training or preparation for life, and no one can exactly tell us what life is or means. We have a hazy notion that education should develope capacity, mould character and impart knowledge. But human nature and character are not perfectly amenable to rules and dogmas, and slip through the meshes of the education net, however fine it may be drawn. That is why education has always been unsatisfactory and always will be more or less disappointing. The utmost we can hope for is for each generation of teachers to perform its allotted task and set before the young an example of work done thoroughly and conscientiously. If the next generation

members will take full advantage of the library. So far, the number of those who have availed themselves of the Urdu Section of the Library has been very small. A list of books which are purchased for the library is published in *Hyderabad Teacher* from time to time.

Finances.—At the end of Mehir, 1342 Fasli, the balance at the credit of the Association amounted to Rs 947–7–11, inclusive of the amount of Rs. 350/– sanctioned for this year's Conference. Mr. S. Khairat Ali, who continues to be our Treasurer, deserves our thanks for the economical management of the funds. Mr. Sharfuddin and Mr. Venkat Narsimham have been selected as Auditors for this year. They will duly audit the accounts in Azur 1343 Fasli and their report will be published in the *Hyderabad Teacher* in due course.

The Hyderabad Teacher.—During the year under review, owing to the enhancement in the postal rates, the difficulties in maintaining the magazine increased considerably, but these difficulties have now been overcome to a certain extent owing to the timely assistance which the Director of Public Instruction has kindly given by ordering 30 more copies of this journal for different schools with effect from Azur 1343 Fasli. The Association is sincerely grateful to the Director of Public Instruction for his kind help and patronage.

---

3. Remedies for the improvement of Backward children.
4. Discipline in Kindergartens.
5. Heredity and Environment in relation to Backward Children.
6. Value of play in the education of children.
7. Kindergarten apparatus.
8. Homework in relation to Backward Children.

Public Lectures.—During the year under report, four public lectures were organised.

1. Lecture on "The Trends of Modern Education" by Prof. Wadia of the Mysore University.
   Chairman.—Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur.
2. Lecture on "Backward Children" by Miss Wookey.
   Chairman.—Rev. F. C. Philip.
3. Lecture on "Kindergartens" by Miss M. E. Read.
   Chairman.—Mr. Ali Akbar, M. A. (Cantab).
4. Lecture on "Problems and Needs of Boys" by Dr. Tracy Strong.
   Chairman.—Mr. Ali Akbar, M. A. (Cantab).

The first lecture was held under the auspices of the Association, while the remaining three lectures were organised by the Chaderghat Branch.

It is to be hoped that the example of the Chaderghat Branch will be followed by the other branches.

Library of the Association.—The Teachers' Association Library contains at present 423 volumes, inclusive of 173 books added this year. The library is proving very useful to the members in general and to the special sub-committees in particular. A separate room has been set apart for the library at the Divisional Inspector's Office. During the year, 129 books were issued to 70 members. Mr. Chandawarkar, M. A., Head Master, Residency Middle School, rendered much help in arranging and cataloguing the books of the library and the other members of the Library Committee also evinced great interest in the library. Mr. Ali Akbar, M. A. (Cantab), Chairman of the Committee, personally supervises the library. It is to be hoped that the

Extracts from the Report of the General Secretary, Hyderabad Teachers' Association for the Year—Aban 1341 to Mehar 1342 F.

During the year under report, the work of the Association was hampered by the out-break of plague. Nevertheless, eight monthly meetings were held at different branches, and the two Sub-Committees appointed at the last Conference were able to complete their reports on the Kindergarten and Backward Children, respectively.

Branches of the Association.—The number of branches of the Association decreased from 14 to 12, for while the 3 branches at Secunderabad formed themselves into a separate Association, one new branch was opened at the Model Primary School.

Membership.—The number of members at present is 800. There has thus been a decrease of 350 in membership owing to the formation of a separate Association at Secunderabad. The Secunderabad Teachers' Association has, however, sought for affiliation, and their application is under the consideration of the Executive Committee of this Association.

Meetings of the Central Executive Committee.—During the year under report, 5 meetings of the Central Executive Committee were held in order to draw up a programme for the monthly meetings at different centres and to consider other matters, such as arrangements for the annual Conference.

Ordinary Monthly Meetings.—As the subjects for the Sub-Committees were "the Kindergartens" and "Backward Children," the subjects chosen for the monthly meetings concerned different aspects of these two problems. They were as follows :—

1. Backward Children : Detection of Backwardness.
2. What arrangements should be made in the existing schools for children below 6.

ing and a resting but a growing and a becoming" deserves to be our motto. Sir C. V. Raman, recently addressing the Bangalore Educational Association, pertinently remarked: "A nation cannot be built out of specialists in history, sciences or other subjects. We can make a nation out of full blooded men and women and it is the duty of a teacher to produce such full-blooded men and women." I may assure you that our Association is not unmindful of this aspect of a teacher's work. The All-India Education Bulletin says: "The Hyderabad Deccan Teachers' Association is one of our strongest branches which raises high ideals of educational work under the inspiring guidance of Mr. Syed Ali Akbar."

International Fellowship.—One word more and I am done. Our Hyderabad to-day with its two great educational experiments—The Osmania University with its Urdu medium of Instruction in all the faculties of Arts, Sciences, Theology, Medicine and Engineering and the Model Primary School recently opened at Hyderabad with its Montessori system of child education, both of which owe their existence to the munificence of our benign ruler, H. E. H. the Nizam, —is the cynosure of the eyes of educationists all over the world and this our Teachers' Association is in its own humble way endeavouring to strengthen the foundations of that great educational edifice by directly aiding the cause of intellectual co-operation, which in my opinion, is the shortest route to the haven of "*International Fellowship.*" May the Lord of Life and Light endow the members with strength enough to steer the barge safe on to that haven is my earnest prayer!

Ladies and gentlemen, let me once again thank you individually and collectively for the patient hearing you have given to the feeble voice of a humble teacher to whose lot it has fallen this year the onerous but pleasant duty of welcoming you all to this Conference.

In this connection, let me draw your attention to the following resolution moved and passed at the Second Conference of this Association :—

> "That in the opinion of this Conference the introduction of the system of provident fund for the benefit of employees of Aided Schools is a measure calculated to ensure stability of service in such schools, and that in view thereof this Conference requests Government to take early steps in the matter by appointing a thoroughly representative Committee for formulating a scheme and submitting it for sanction."

From this it is evident that this Association is not unmindful of the welfare of the teachers in Aided Institutions. If the Doctors in their Medical Registration Councils and Lawyers in their Bar Associations feel legitimate pride, I do not see any reason why we should not feel similar pride in our Teachers' Association.

Extra-curricular Activities —It is usually considered that a teacher's activities are confined to the four walls of a school building but such a view is exceedingly narrow. Time-spirit demands that we should keep ourselves abreast of the times and take active interest in various healthy activities such as adult education, the opening of night schools, and schools for defective children, the popularising of the Library movement or any kind of social service, such as rural uplift, wherever possible. The demons of illiteracy, ignorance and poverty are stalking over the land and we cannot imagine of a duty more sacred, a purpose more dignified and an ideal more sublime than the one of driving these demons from our country and then only we can aspire for the position of genuine Nation-builders. Of course, the work of Nation-building is an uphill task and needs Herculean labour, but the pleasureof endeavouring todo it by all possible means at one's commands is indescribable. Struggling, scrambling and striving to reach a noble ideal is decidedly better than the actual fruition or even an achievement of an object. In the words of R. L Steevenson, "To travel hopefully is better than to arrive." "Not a havi-

dealing with important educational topics year after year, may we not reasonably hope that this eight-year old institution will in due course develope into full manhood and become a power in the land for raising the power, the status and dignity of the teaching profession?

The Teaching Profession.—This profession is usually, and rightly too, considered to be a noble one. One of our distinguished Ex-Presidents, Sir Nizamat Jung Bahadur, spoke of teachers as "Leaders of Mankind", "High priests of human nature" and "the moulders of world civilisation". No greater compliment can be paid to this profession. If, in the educational system, grand buildings, good equipment, up-to-date methods of instruction, an excellent syllabus and carefully chosen text-books may be considered as skeleton of the school, the teacher should all the more be regarded as the heart or rather the brain thereof. But can it yet be confidently asserted that all the teacher's problems have been effectually solved? I am afraid not. His problems like those of life are varied and complex. For our present purpose, we may state that a teacher's problem has two aspects, one the internal and the other the external. While the external aspect deals with the technical side—the how and the why of education—the internal may be said to deal with his salary, status, security of tenure and the giving of opportunities for self-improvement and contentment. In its external aspect much has been done and is being done to improve the lot of the teacher, but it is the internal aspect that will, in future, present greater complications and demand more effective solutions. For one thing, there should be standardisation of salaries in all the schools, Government or Aided. The lot of teachers in Aided schools should be improved so as to place them, as far as possible, on an equal footing with teachers in Government schools as regards pay, status, etc. In Aided Institutions the institution of Teachers' Provident Fund should be compulsory.

facilities to teachers to improve their professional knowledge and to widen their outlook. To this end, firstly, we maintain a library consisting of very valuable and up-to-date books on education. These books have been of inestimable value not only to the members of the Association but also to the Sub-Committees that have been dealing with special subjects like "Kindergartens" and "Backward children." Secondly, *The Hyderabad Teacher*, a quarterly magazine which is being regularly issued and ably edited, has already gained an All-India reputation ; nay, its fame has gone far beyond the seas. Not long ago there was an article in *The Times' Educational Supplement* (London) on the Educational Journals of India, and in this special mention was made of *The Hyderabad Teacher.* Such a magazine has a claim on your sympathy and support. Thirdly, with a view to enable the teachers to make a comparative study of the various systems of education prevailing in different educationally advanced countries, three remarkable books have been published by Hyderabad educationists. Nawab Masood Jung Bahadur's scholarly book on "The system of education in Japan" has been followed by another thought-provoking volume on "The German School System." We take legitimate pride in saying that Mr. Syed Ali Akbar, who is not only the President but the soul of the Association, is its author. This book has been very favourably reviewed by many educational journals in and outside India. Next to this, I should refer to another valuable book on the "Schools of Denmark" by our Deputy Director of Public Instruction Mr. Syed Mohamed Hussain Jaffrey. Its Urdu edition has already been published and I understand that very soon the English edition, part of which has already been published in *The Hyderabad Teacher*, is also going to be issued. May I hope that books on systems of education in America and England also may follow and that that credit too may be shared by Hyderabad educationists ? With such eminent educationists creating the special facilities for widening the knowledge of the members and with special Sub-Committees

But with your kind permission I shall draw your attention only to one particular aspect of our work.

Last year two Sub-Committees were appointed to deal with two educational problems, *viz.* " Backward Children " and " Kindergartens ". These Committees were at work throughout the year and, with the full benefit of the discussions held at various centres of this Association, they have drawn up two valuable reports which will soon be placed before you for adoption. Both these subjects I need hardly mention are of paramount importance to the educational well-being of our country. It was Alexander Pope, a poet of classical age in English literature, who declared that " the proper study of mankind is man ". Some ladies who are the admirers of the romantic school of thought may feel inclined to differ from this view and say that " the proper study of mankind is not man but woman ". May I go a step further and say: " the proper study of mankind is neither man nor woman but child "? There can be no denying the fact that the welfare of children should be the basis of not only social reform but also of educational reform. All the civilised world over today, the child is the cynosure of eyes of statesmen and educationists alike. Hence we have concentrated our attention on these two important problems dealing with the " Child "; and when the two Sub-Committees place the results of their labour before you, you will be in a position to realise that we are pledged to the policy of sustained efforts and constructive work. It can, therefore, be said that this year's Conference is one of 'Determinations', though not of 'Resolutions.'

The Hyderabad Teachers' Association—I do not want to tax your patience unduly, ladies and gentlemen, by recapitulating the history, the aims and objects of the Association, for during the previous Conferences my predecesssors have dealt with that subject exhaustively. Let me, however, just in passing refer to one or two aspects or our work. It has been our aim to offer opportunities and special

a great scholar and a legal luminary. We assure you, Sir, that all of us highly appreciate your kindness in gracing this chair. Year after year when our deliberations are guided by such eminent persons, even the most irreconcilable pessimist amongst us is bound to realise that brighter days have dawned upon the teachers and glorious chapters are being added to the history of education in our country. The presence of our D. P. I. also on this occasion is a source of inspiration and delight to us all, inasmuch as he, as the patron of our Association, is our "guide, philosopher and friend". To other distinguished visitors also we offer our heartfelt thanks for their kind response to our invitation and assure them all that we greatly appreciate their good-will, sympathy and co-operation towards the great work of national uplift so courageously undertaken by a band of earnest teachers.

Now turning to the business of the Conference, I have to say a few words. From a perusal of our programme you will have noticed in it a striking change this year. In all Conferences one invariably finds a certain number of resolutions brought forward for discussion and adoption; but in our Conference this year they are conspicuous by their absence. Critics may perhaps feel inclined to point their finger of scorn at us and say, "You are acting the play of Hamlet with the Prince of Denmark left out". To such my answer is: "We are acting the play leaving only the irresolution of Hamlet and retaining in it the quintessence of the spirit of determination". We believe that the mere passing of a few resolutions at any annual gathering is not worth the paper on which they are drafted, but instead, there should be substantial work turned out throughout the year by sustained efforts. Keeping this principle in view, we have scrupulously avoided this year all resolutions. Regarding the work turned out during this year, you will be able to form some idea of it from the annual report which will be presently read out to you by the General Secretary.

that he had been particularly impressed by the enthusiasm which the members of the Association had displayed throughout the proceedings of the Conference.

On behalf of the Association, Mr. Ali Akbar proposed a hearty vote of thanks to the President. He also thanked all those ladies and gentlemen who had helped to make the Conference a success. The proceedings concluded with the singing of the National Anthem.

The members of the Executive Committee were then 'At Home' to all the guests. A little later, there was a musical entertainment in which a number of teachers displayed their musical talents. Thus the whole function was a success both from the educational and social standpoints.

Welcome Address

BY

G. A. CHANDAVARKAR, M. A.

As Secretary of the Reception Committee, it is my pleasant duty, nay a proud privilege, to extend a hearty welcome to you all, to this the Seventh Conference of the Hyderabad Teachers' Association. When I see before me such a vast gathering of distinguished ladies and gentlemen, some of whom are not directly connected with the teaching profession, I feel that the pendulum of the people's outlook on matters relating to education in general and teachers in particular, has swung from apathy to sympathy. When I think of the great honour done to us by Nawab Zulcadar Jung Bahadur in presiding over this Conference, I feel confident that the members carrying on this "sorriest of trades", will feel greatly encouraged in their arduous task of putting the shoulders to the wheels of educational progress. In conformity with the glorious traditions of the presidential chair, this year we have been singularly fortunate in having as our President one who is not only a statesman, but also

Afternoon Session.—The afternoon session began at 2 p. m. with Nawab Zulqadar Jung Bahadur in the chair. Mr. Shaik Abdul Hasan, Vice-President of the Association, proposed a resolution expressing the appreciation of the Association of the services rendered by Mr. S. M. S. Mushadi as General Secretary from 1925 to 1932. After being seconded by Mr. Ziauddin Beg, the resolution was passed unanimously. The Conference then formally adopted the Kindergarten and Backward Children Reports. This was followed by a very fascinating and humorous lecture in Urdu on " The Role of the teacher in the light of modern Psychology and the local conditions" by Dr. Khalifa Abdul Hakeem, Professor of Philosophy, Osmania University. The learned lecturer traced the development of educational theories from the time of Plato and Aristotle to the present times. He also stressed the importance of encouraging and developing the instinct of curiosity in children. Finally, he criticised the present system of education on the ground of its being too literary and urged strongly on the need for giving it a vocational bias.

Moulvi Hisamuddin next spoke in Urdu on " Scholars and Students of Ancient and Modern Times ". Mr. Nazir Husain Sharif, Secretary of the Exhibition Committee, then read his report. This over, Nawab Zulcader Jung Bahadur distributed the Exhibition prizes. Sixty one schools took part in the Exhibition, and the largest number of prizes were won by the Urdu Sharif Middle School, which also carried away the cup awarded by the Association for the best school garden.

In his concluding speech, Nawab Zulcader Jung Bahadur congratulated the Association on the success of the Conference and expressed his appreciation of the useful work which the Association was doing under the able guidance of its President Mr. Syed Ali Akbar. He said

make laws compelling the owners and managers of our factories to establish nursery schools and Kindergartens for the children of their employees. These suggestions were made by some teachers under training at the Osmania Training College.

4. It is highly questionable that there are fundamental differences between the European and Indian children, that the Indian children have no inclination for play, and that they are prone to sit still rather than move about. Though Indians are deeply religious and serious minded, it is doubtful if this characteristic is inherited by children. Children all the world over are alike. The listlessness of Indian children is mainly due to the fact that 60 p. c. of our women are anæmic; it is reported that in Bengal alone 87 p. c. women suffer from T. B.

5. The Committee suggest a number of subjects suitable for the kindergarten, but have not worked out the details. Moreover, they have not laid emphasis on the correlation of subjects, so necessary in the lower classes. The treatment of school subjects in water-tight compartments is the bane of teaching in our schools.

The problem of apparatus has not been tackled in a practical way. Miss Gillingham of Saidapet College claims in her "Indian Kindergarten" that she could work a class of 100 pupils at the wonderful cost of Rs. 2-3-0 per mensem. In 1907-08, Mysore also made some experiments after engaging a kindergartener from England, details of which have been published. No notice seems to have been taken of these attempts.

6. The Training College has given due consideration to Child Education by making it a compulsory subject, but there are no facilities for practical work. If trained teachers were attached to some of the Kindergartens of Hyderabad, it would be possible to improve their work without much cost.

7. In our schools we have to face two problems—to produce certain appreciable or rather spectacular results, and to enable children to pursue the ordinary school course as soon as possible. The Committee have suggested Project Method as well as work on the lines of Frœbel and Montessori. As the aim is to solve the problem of the kindergarten in the village, no clear lead seems to have been given to the village teacher who needs most definite and detailed instructions with regard to the method he should follow in the village.

While proposing a vote of thanks to the Chairman for the able manner in which he had guided the deliberations of the meeting, Mr. Ali Akbar said that he would place before the Kindergarten Sub-Committee the valuable suggestions which Mr. Sajjad Mirza had offered

for the early education of children was more the domain of women than of men. He also expressed his appreciation of the demonstration lesson given by Miss Chamarette. It was in the fitness of things, he said, that practice should precede theory in this Conference. Mr. Ali Akbar then read the report prepared by the Sub-Committee. Opening the discussion, Mr. Chandawarkar said that owing to the cost of the necessary apparatus, many thought that the kindergarten system was unworkable in our primary schools. He suggested the substitution of cheap models made of clay and other cheap material for costly apparatus, and expressed the opinion that it was possible to work out the scheme in all schools provided the teachers took enough interest and were given the necessary training.

After congratulating the Kindergarten Sub-Committee on the exemplary way in which they had worked to solve a very important educational problem, Mr. Sajjad Mirza made the following observations on the report:—

1. It is not quite correct to say that the Kindergarten is as old as English education in India. Education in India filtered from the top. The establishment of the college for Oriental Studies under Hastings and the foundation of the three Universities in 1857 are ample proof, if proof were required. This trend in education continues in India even to this day.

2. It is stated that according to the new curriculum boys of not less than six years of age should be admitted into schools, but the Committee found that boys much below the stipulated age were commonly found in Class I. The reasons given by the Committee for this practice were not quite convincing. How is it that the authorities connive at such flagrant contravention of their own regulations? The fact is that the importance of the child and his education in early stages are not realised. The schools look to the top classes for results in the Government Examinations for a show of their *Karguzari* and to the lower classes, especially the lowest, for the sake of the strength of the school—another show of their *Karguzari*.

3. It is an excellent suggestion that the All India Women's Conference should take up the opening of Kindergartens, but it would be better still if a beginning is made with the child welfare centres in Hyderabad. Also, Government may be asked to

arrangements which were made is due to Mr. Sadatulla Khan, Secretary of the *Mushaira* Committee.

Proceedings of the Third Day.

Morning Session.—The proceedings began at 9 a. m., when Mr. Mohamad Osman, B. A., Dip. Ed. (London), opened a discussion on "School Time-tables." Mr. Abdus Sattar Sobhani, B. A., B. T., Principal, Darul Uloom High School, presided. Mr. Md. Osman dwelt at length on the importance of the time-table and offered valuable suggestions regarding the duration and number of periods to be assigned to each subject in the Primary, Middle and High Sections. Speaking of the arrangement whereby as many subjects as possible are assigned to one teacher, Mr. Osman said that this arrangement was only suitable for the Primary Section. For the Middle and High Sections he advocated subject teachers. The learned lecturer also urged the need for the Head-Master preparing the time-table in consultation with the other members of the teaching staff.

In his concluding remarks, the Chairman said that the suggestions made by the lecturer were very useful and deserved a trial in all the schools.

Mr. Mohamad Osman's lecture was followed by Sectional Meetings on Backward Children (Urdu), presided over by Mr. S. M. H. Nakavi and on Kindergartens (English), presided over by Mr. Sajjad Mirza, M. A., (Cantab), Principal, Osmania Teachers' Training College.

The English Sectional Meeting on Kindergartens.

This meeting was held in the Great Hall and was well attended. The proceedings began with a very interesting and instructive Demonstration Lesson on Nature Study by Miss J. A. Chamarette of the Madrasae Aliya.

While thanking the Teachers' Association for asking him to take the chair, Mr. Sajjad Mirza said that a lady president would have been more suitable for the occasion,

Sectional Meeting on Kindergartens and the English Sectional Meeting on Backward Children. Mr. Mohamed Osman, B. A., Dip. Ed. (London), Vice-Principal of the Osmania Training College, presided over the former and Dr. Shenderkar, Ph. D. (London), over the latter meeting. Mr. Ziauddin Beg, B. A., B. T., read the Kindergarten Report. A discussion followed, in which Messrs. Mohamed Sultan, Abdul Majeed and Abdus Sattar Sobhani, B.A., B.T., took part. Mr. Ali Akbar, Chairman of the Kindergarten Sub-Committee, answered the objections which were raised against the Report. Mr. Mohamed Osman, Chairman of the Sectional Meeting, congratulated the Kindergarten Committee on the excellent report which they had produced.

At the Sectional Meeting on Backward Children, the report drawn up by the Sub-Committee on Backward Children was read by Mr. Faiz Mohamed, B. A., Dip. Ed. Mr. Chandawarkar opened the discussion, while Mr. S. H. Nakavi, B. A., Dip. Ed. (Leeds) and Mr. Noorul Hasan, B. A., B. T., Dip. Ed. (Glasgow), answered the questions which were raised in connection with the report. In his concluding remarks, Dr. Shenderkar praised the work of the Sub-Committee and offered some valuable suggestions.

Mushaira.—At 9 p. m. at the Gymnasium Hall of St. George's Grammar School a "Mushaira" was held, in which a large number of teachers took part, including Mr. Shaukat Ali Khan Fani, Moulvi Alla Baksh Towheed, Mr. Abdus Salam Zaki and Mr. Sadatulla Khan. Moulvi Abdul Haq Saheb, B. A., Professor of Urdu, Osmania University, presided. The Gymnasium hall was packed and great enthusiam prevailed throughout the "Mushaira," which lasted till almost midnight. From the success achieved, one found it hard to believe that this was the first "Mushaira" organised by the Association. The function helped to bring out a good deal of poetic talent among the teachers of the local schools. The credit for the excellent

Proceedings of the Second Day.

Morning Session.—The proceedings of the second day began at the City College at 9 a. m. with prayers, which were offered in Arabic and Sanskrit by Moulvi Abdul Bari and Mr. G Pathak, respectively. There was a large gathering of distinguished ladies and gentlemen, including officials of the Education and other departments. Mr. Sheikh Abul Hasan, B. A., B. T., Chairman of the Reception Committee, delivered his welcome address in Urdu. After eulogising the literary and educational work done by the President, he described the various activities of the Association, mentioning especially the reports prepared by the Sub-Committees during the last 4 years. This was followed by an address in English by the Secretary of the Reception Committee.* The General Secretary of the Association then read his report for the year 1342 Fasli.*

Nawab Zulcader Jung Bahadur rose amidst applause to deliver his able presidential address, wherein he referred to the responsibilities of a teacher and the great educational progress recently made in these Dominions.*

The presidential address was followed by a very interesting Kindergarten Programme. The demonstration lessons on rhythm given by Miss M. E. Read, Head-Mistress, Primary Department, Madrasae Aliya and her assistant Miss J. A. Chamarette and on physical education by Miss D. Nundy of the Model Primary School were greatly appreciated. The action songs of the children of the Stanley Girls' High School were also very good.

The morning session came to a close with an eloquent and inspiring address on "The Meaning of Japan" by Professor E. E. Speight of the Osmania University.*

Afternoon Session.—The afternoon session which began at 2.30 and lasted till 5 p. m. was restricted to the Urdu

*The full texts of Mr. Chandawarkar's Welcome Address, Nawab Zulcader Jung Bahadur's Presidential Address and Prof. Speight's lecture as well as extracts from the General Secretary's Report are published elsewhere in this issue.—*Ed.*

The Seventh Annual Conference of The Hyderabad Teachers' Association

BY

G. A. CHANDAWARKAR, M. A.,
Secretary of the Reception Committee.

First Day.

The proceedings of the Conference began with the opening of the Educational Exhibition on Thursday, 28th September, 1933, at the Assembly Hall of the Methodist Boys' High School at 5 p. m. by Nawab Zulcader Jung Bahadur, M. A. (Cantab), Bar-at-Law, Home Secretary to H. E H. the Nizam's Government. The exhibition was arranged in two different sections, one being mainly devoted to Kindergarten apparatus and the other to drawings, maps, pictures, clay models, art and craft work, embroidery and needle work.

At 7 p. m. Mr. Syed Yusufuddin, Deputy Director of Archaeological Department, delivered a lantern lecture on "Bidar" at St. George's Gymnasium Hall. The lecturer dealt with the ancient and the modern history of that famous town and threw out on the screen pictures of the tombs and other historical buildings, such as the school of Mahmood Gawan and the fort.

Nawab Zulcader Jung Bahadur, who presided over the meeting, thanked the lecturer for his instructive address. Mr. Syed Ali Akbar, President of the Association, proposed a hearty vote of thanks to the distinguished President for the trouble he had taken in presiding over the meeting. The proceedings then concluded at 8-30 p m.

Conference Number

THE HYDERABAD TEACHER

CONTENTS

PAGES.

THE SEVENTH ANNUAL CONFERENCE OF THE HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION By G. A. CHANDAWARKAR, M. A., Secretary of the Reception Committee. 51

WELCOME ADDRESS By G. A. CHANDAWARKAR, M. A. 58

EXTRACTS FROM THE REPORT OF THE GENERAL SECRETARY, HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION FOR THE YEAR ABAN 1341 TO MEHAR 1342 F. 65

PRESIDENTIAL ADDRESS By NAWAB ZULCADER JUNG BAHDUR, M. A. (Cantab.) Barrister-at-Law, Home Secretary, H. E. H. the Nizam's Govt. ... 68

THE MEANING OF JAPAN By PROF. E. E. SPEIGHT, of the Osmania University, Hyderabad-Dn. ... 79

EDITORIAL NOTES

THE SEVENTH ANNUAL CONFERENCE OF THE HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION. ... 97

THE TEACHING PROFESSION. 97

DR. RABINDRANATH TAGORE AT HYDERABAD-DN. ... 98

VOL. VIII. REGISTERED ASAFIA NO. 47. NO.

THE

HYDERABAD TEACHER

OCTOBER—DECEMBER, 1933

Quarterly Magazine of the Teachers' Association,
Hyderabad-Deccan
Under the Patronage of
Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M. A.,
Director of Public Instruction.

Editorial Staff

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD
1933

Annual Subscription Rs. 3.

Vol. VIII No. 2.

THE

HYDERABAD TEACHER

OCTOBER—DECEMBER, 1933

Editorial Staff

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD
1933

جلد (۸) شمارہ ۳

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مقاصد

(۱) طبقہ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔
(۲) طبقہ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔
(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)
صرف اردو حصہ (عہ) سالانہ قیمت فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲ر) صرف اردو (۸ر)

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہوسکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم سے تعلق ہوں۔
(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔
(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	چھ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عسہ	صہ	ے
نصف صفحہ	صہ	عہ ۱۲ر	عہ ۸ر
ربع صفحہ	عہ ۸ر	عہ ۶ر	۱۵ر
فی سطر	۱۰ر	۸ر	۶ر

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوکر دفتر انجمن اساتذہ واقع مدرسہ وسطانیہ بلدہ سے شائع ہوا

فہرست مضامین

جلد حیدرآباد ٹیچر شمارہ ۳

بابت اسفندار لغایتہ اردی بہشت

	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
(۱)	نیا چاند (نظم)	محمد عبدالسلام صاحب ذکی بی۔اے۔ٹی۔ڈی	۲
(۲)	نظام الاوقات	مولوی محمد عثمان صاحب وائس پرنسپل ٹریننگ کالج	۳
(۳)	تعلیم سائنس سے متعلق چند مشورے	سید عبدالحکیم صاحب ایم ایس سی۔ ال ٹی	۶
(۴)	خطبہ جلسہ تقسیم اسناد عثمانیہ یونیورسٹی	نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم، اے اکسفورڈ صدر المہام سیاسیات۔	۱۷
(۵)	ہماری تعلیم سے متعلق چند مشورے	ایس ڈبلیو کلکلر صاحب مترجمہ غلام جیلانی صاحب	۲۲
(۶)	کارگزاری انجمن اساتذہ بابت شش ماہ اول ۴۳ف	مرزا ضیاء الدین بیگ صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی معتمد عمومی انجمن اساتذہ۔	۲۸
(۷)	طریقہ تعلیم ریاضی	ڈی۔ سی۔ بھوگلے صاحب	۳۳ تا ۴۸ ۸۵ تا ۱۰۰

نیا چاند

از

محمد عبدالسلام ذکی۔ بی۔ اے۔ ٹی۔ ڈی

ال سی۔ فولن کی نظم دی نیو مون کا ترجمہ

ذکی صاحب نے قدیم ڈگر کی شاعری سے ہٹ کر ننھے بچوں کے لئے نظمیں لکھنی شروع کردی ہے۔ چنانچہ حال ہیں بچون کی نظموں کا ایک مجموعہ "گلزار اطفال" کے نام سے شائع کیا ہے "نیا چاند" اسی مجموعہ کی ایک نظم ہے، جو ذیل میں درج کی جاتی ہے گلزار اطفال کی طباعت اور اشاعت سے پیشتر ہمیں یہ نظم ملی تھی مگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے بروقت شائع نہ ہوسکی۔

ہمیں اُمید ہے کہ ملک کے نونہال اِس سے فائدہ اُٹھائیں گے اور یقین ہے کہ ذکی صاحب بھی ننھے بچوں کے دیگر اصناف سخن مثلاً لوریاں، بچوں کے اجتماعی اور حرکاتی گانے نیز ڈرل کے گانوں پر طبع آزمائی فرمائیں گے۔ (اشرکیا)

(۱) آج شب چاند خوشنما نکلا۔
ساری دنیا کا دلربا نکلا
سینگ چھوٹے ہیں دو طرف نکلے
خوشنما نازک اور چمکیلے
خوشنما تھا نہ چاند ایسا کبھی
سب کو سینگوں کی روشنی بھائی

نہ بڑھیگا امید ہے پھر وہ
نہ چڑھیگا امید ہے پھر وہ

(۲) کاش منزل کی اس کی رہ پاتا
دوستوں کو بھی ساتھ لے جاتا
اِس فضا سے جو پار ہوتا میں
جا کے اِس پر سوار ہوتا میں

بیٹھ جاتا میں بیچ میں اِس کے
دونوں ہاتھوں سے تھام لیتا
اچھا سا ہوتا میرا گھوارا
کس قدر دلفریب اور پیارا
(۳) پھر وہاں سے پکارتا تارو!!
راہ سے میری دور ہٹ جاؤ
تاکہ جس دم مری سواری چلے
مُفت روندے نہ جاؤ پاؤں تلے
میں نہ جاؤں گا واں سے اور کہیں
صبح تک جھولتا رہوں گا وہیں
دیکھوں جاتا ہے میرا چاند کہاں
اور پڑتا ہے جا کے ماند کہاں

(۴) خوشنما کوئی آسماں سا نہیں
پھرتے ہم خوشی سے وہیں
درمیان ان حسین رنگوں کے
کس مسرت سے گھومتے پھرتے
دیکھتے واں طلوع سورج کا
اس منور چراغ کا جلوا
سارے دن اسکو خوب دیکھتے ہم
شام میں پھر غروب دیکھتے ہم
بیٹھ کر پھر دھنک پہ گھر آتے
واں کے قصوں سے سب کو بہلاتے

(ماخوذ از گلزار اطفال)

نظام الاوقات

از مولوی محمد عثمان صاحب وائس پرنسپل ٹرینگ کالج بلدہ

ترتیب نظام الاوقات کے وقت تین اُمور کا ملحوظ رکھنا ازبس ضروری ہے اولاً طالب علم ثانیاً مضامین نصاب ثالثاً مدرس۔ یہ گویا تعلیمی مُثلث کے تین زاویے ہیں۔ اگر اُن میں سے کسی ایک کو بھی نظرانداز کر دیا جائے تو تعلیم کے عمل میں خرابیوں کے پیدا ہوجانے کا قوی احتمال ہے۔

طالب علم قوانین توجہ کی رُو سے ہر شخص کی توجہ میں بہت جلد جلد تبدیلی ہوتی رہتی ہے یعنی کوئی چیز چند لمحوں سے بڑھکر ہمارا مرکز توجہ نہیں بن سکتی اِس قاعدہ کے لحاظ سے طلبہ میں عموماً اور کمسن طلبہ میں خصوصاً توجہ کے مرکز کا جلد جلد تبدیل ہونا ضروری ہے اِسلئے کمسن طلبہ کے ساعات تعلیمی بڑی عمر کے طلبہ کے ساعات کے نسبت کرتے چھوٹے ہونے چاہئیں تاکہ مضامین میں جلد جلد تبدیلی ہوتی رہے اور

طلبہ تعلیم سے کماحقہٗ استفادہ کرسکیں۔ بڑی جماعتوں کے ساعات تعلیمی بھی ۴۵ یا ۵۰ منٹ سے زیادہ کے نہ ہوں کیونکہ ان جماعتوں کے طلبہ بھی اس سے زیادہ دیر تک کسی مضمون پر توجہ نہیں دے سکتے۔

قوانین توجہ کے مطالعہ سے اس امر کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی کام کے آغاز ہوتے ہی اس پر اپنی توجہ پوری قوت کے ساتھ مبذول نہیں کرسکتا بالفاظ دیگر کسی کام میں ۵ یا ۱۰ منٹ سے قبل انہماک نہیں پیدا ہوتا اسلئے اس قاعدہ کی رُو سے پہلے ساعت تعلیمی میں انگریزی یا ریاضی کی تعلیم، جو اور مضامین نصاب کے مقابلہ میں زیادہ مشکل اور اہم ہیں، ہرگز نہیں دی جانی چاہیئے بلکہ اس ساعت میں کسی قدر مشکل مگر مانوس مضمون مثلاً مادری زبان کی تعلیم دی جائے تو مناسب ہے۔

ماہرین نفسیات کی تحقیقات سے اب یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ من حیث الکل صبح کے کام کی نوعیت سہ پہر کے کام کی نوعیت سے بہتر ہوتی ہے اسلئے سارے اہم اور مشکل مضامین مثلاً انگریزی و ریاضی کی تعلیم صبح کے دوسرے اور تیسرے ساعات میں دی جائے اور اگر مضامین نصاب کی کثرت کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو مجبوراً سہ پہر کے درمیانی گھنٹے میں باقی اہم مضامین کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔

مضامین نصاب۔ ترتیب نظام الاوقات کے موقع پر مضامین نصاب میں اوقات تعلیمی کی تقسیم کا سوال بھی بہت اہم ہے۔ ماہرین تعلیم کی رائے ہے کہ مشکل اور اہم مضامین کی تعلیم کا روزانہ انتظام کیا جانا چاہیئے تاکہ وقت مقررہ سے قبل نصاب کی تکمیل کی جاسکے اور طلبہ کو آموختہ کے ایک دو دور کرنے کا موقع بھی مل جائے اس کے علاوہ ایسے مضامین کی تعلیم بھی روزانہ ہونی چاہیئے جن کا حجم زیادہ ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو مدرس کو اپنی تعلیم کی رفتار تیز کردینی ہوگی اور طلبہ کو حقیقی استفادہ سے محروم رہنا پڑے گا لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ جن مضامین نصاب کی تعلیم روزانہ نہیں ہوتی ہے وہ کم اہم یا غیرضروری ہیں مثلاً دینیات یا اخلاقیات بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ نصاب وقت پر ختم ہوجائے اور طلبہ تعلیم سے خاطرخواہ استفادہ کرسکیں۔

مدرس۔ تقسیم کار کے وقت مدرس کا خیال رکھنا بھی بیحد ضروری ہے کیونکہ وہ بھی

ایک انسان ہے مشین نہیں اور ہر انسان کی طرح وہ بھی جذبات، خواہشات، اجتماعی ذمہ داریاں رکھتا اور دوسروں کی طرح تھک بھی جاتا ہے۔ اگر ترتیب نظام الاوقات کے وقت صدر مدرس اپنے مددگاروں کے صلاح ومشورہ کے بعد ان میں کام کی تقسیم کرے تو بہت مناسب ہو ایسے موقع پر اس کو نہ صرف ہر مدرس کے اسنادی قابلیت، اس کے مذاق، طبیعت، تجربہ اور فرائض غیر از اوقات مدرسہ ہی کا خیال رکھنا چاہیئے بلکہ اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ ہر مدرس کے ذمہ کتنے مضامین کی تعلیم دی جائے وہ روز آنہ کتنے مضامین کی خاطر خواہ تیاری کرسکتا ہے اور اس کے مفوضہ کام میں تبدیلی کیسے کی جانی چاہیئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر تقسیم کار کے وقت مدرسین کے مذاق کو ملحوظ نہ رکھا جائے گا تو اس سے اساتذہ اور طلبہ دونوں کو فائدہ کے بجائے نقصان ہوگا کیونکہ مدرسین کسی مفوضہ کام سے دلچسپی اور لگاؤ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تیاری معقول طور پر نکر سکینگے۔ اس سے نہ صرف ان کی زندگی بے لطف ہو جائے گی بلکہ طلبہ بھی ان کی تعلیم سے کچھ زیادہ فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے مدرسین کی طبیعت کا بھی لحاظ کرنا اس لئے ضروری ہے کہ بعض مدرسین فطرتاً ایسے ملنسار ہوتے ہیں کہ وہ کمسن طلبہ میں خصوصاً بہت جلد گھل مل جاتے اور ان کے راز دار بن جاتے ہیں چھوٹی جماعتوں کی تعلیم ایسے مدرسین کے تفویض کرنا بے حد مناسب ہے تاکہ وہ ہر بچہ کی قدرتی اور خانگی مجبوریوں سے واقف ہو کر اپنی تعلیم میں اس کے مطابق ردوبدل کرسکیں۔ جن مدرسین میں کمسن طلبہ کے راز دار بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی اُنہیں بڑی جماعتوں کی تعلیم کا کام دیا جائے۔

مدرس کا تجربہ یہ بھی اس کی کارکردگی کا ایک اہم جزء ہے۔ بقول "پیش طبیب مرو پیش تجربہ کار برو" کام کی تقسیم کے وقت اگر مدرسین کی محض اسنادی قابلیت پر بھروسہ کیا جائے اور اُن کے تجربہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو کام میں ابتری پھیل جانے کا قوی امکان ہے اس لئے ایک تازہ اور نوآموز گریجویٹ پر ایک ایف۔ اے کامیاب مگر تجربہ کار مدرس کو ترجیح دینے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے۔ اُن مدرسین کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے جن کو اوقات تعلیمی کے علاوہ اپنے خانگی وقت میں مدرسہ کا کام کرنا ہوتا ہے مثلاً ریاضی یا ترجمہ یا انشاء کی بیاضوں کی تصحیح، کھیلوں کی نگرانی یا بزم ہائے ادب تاریخ وجغرافیہ کی تنظیم وغیرہ اگر اس کو ملحوظ نہ رکھا جائے گا تو مدرس کی صداقت اور خلوص میں تنزل اور کام میں ابتری پیدا ہو جائے گی

یہ سوال کہ ہر مدرس کے ذمہ کتنے مضامین کی تعلیم ہونی چاہیئے بہت اہم ہے۔ اس زمانہ کو "متخصصین کا زمانہ" کہا جاتا ہے اس لیئے ماہرین کا خیال ہے کہ اگر متخصصین کے تفویض صرف انہی مضامین کی تعلیم کی جائے جس کے وہ متخصص ہیں تو اُن کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت گھٹ جائیگا اور زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق ان کی نظر میں وہ وسعت پیدا نہ ہوگی جو ہر مدرس میں ہونی چاہیئے اس لیئے ہر متخصص کو اپنے خاص مضمون کے علاوہ کوئی اور مضمون بھی ضرور پڑھانا چاہیئے البتہ چھوٹی جماعتوں میں تین مضامین کی تعلیم ہر مدرس کے تفویض کی جاسکتی ہے کیونکہ ماہرین تعلیم کی رائے میں کسی مدرس سے اس سے زیادہ مضامین کی روزانہ خاطرخواہ تیاری کرنے کی توقع رکھنا عبث ہے۔ اس کے علاوہ مدرسین کے کام میں جلد جلد تبدیلی بھی نہ ہونی چاہیئے مثلاً ایک سال یا اس سے کم مدت میں انگریزی کی تعلیم کے بجائے تاریخ وجغرافیہ یا ریاضی کی تعلیم تفویض کرنا کیونکہ یہ معلم اور متعلم دونوں کے لیئے مضر ہے ہاں اگر کسی مدرس کے غلط طریقہ تعلیم سے طلبہ کو یقینی طور پر نقصان پہنچ رہا ہو تو اور بات ہے۔

تعلیم سائنس سے متعلق چند مشورے

از سید عبدالحکیم صاحب ایم ایس۔ سی۔ ایل۔ ٹی

انگلستان، امریکہ، جرمنی، جاپان اور دوسرے ممالک میں جنہوں نے آئے دن کے عجیب وغریب ایجادات سے دنیا کو محوحیرت بنادیا، تعلیم سائنس کے مختلف طریقہ رائج ہیں۔ امریکہ اور انگلستان میں (HEURISTIC) طریقہ تعلیم کو مقبولیت حاصل ہے۔ جرمنی اور جاپان اس طریقہ کے زیادہ قائل نہیں۔ امریکہ کے مدارس میں میکنکس پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ جرمنی میں تعلیم کیمیا کو اہمیت حاصل ہے۔ ایسے ہی دو چار اختلافات کے علاوہ ان میں سے ہر ایک تعلیم سائنس کو عملی جامہ پہنانے اور سائنس کے اُصولوں کو زندگی میں آنے والے روزمرّہ واقعات سے وابستہ کرنے میں منہمک ہے۔ طلبہ کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ صنعت وحرفت کے کارخانوں کا اُستاد کی نگرانی میں معائنہ کریں اور دیکھیں

کہ سائنس کے اُصولوں کو عملی صورت دے کر کس طرح کار آمد بنایا جاتا ہے۔ طلبہ کے گروہ کے گروہ سائنس سے متعلقہ مقامات کو بذریعہ ریل دیکھنے جاتے ہیں۔ اس قسم کی دیکھ بھال طلبہ کے نصاب کا ایک جز قرار دے دی جاتی ہے۔ جاپان میں جن دنوں یہ تعلیمی دَورے شروع ہوتے ہیں تو ریل گاڑیاں ہفتوں طلبہ سے بھری ہوئی چلتی ہیں اِس میں شک نہیں کہ ہمارا ملک غریب ہے ہمارے یہاں صنعت و حرفت کے صرف گنتی کے کارخانے ہیں اور ذرائع آمد و رفت میں وہ سہولت نہیں ہے جو اِن ترقی یافتہ ممالک میں ہے۔ لیکن اس سے بھی اِنکار نہیں کہ ہمارے پاس جو ذرائع ہیں ہم اُن سے بھی کام نہیں لیتے۔ بلدہ میں پڑھنے والے طلبہ برقی کارخانے، واٹر ورکس، گیس ورکس، آگ بجھانے کے انجن، لاشعاؤں کے تجربہ لاسلکی اسٹیشن، صابن اور بٹن بنانے کے کارخانے تھوڑی سی کوشش کے بعد دیکھ سکتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ سائنس کے دوران درس میں ہم صرف اُس کے اُصول ہی سمجھانے پر اکتفا کرتے ہیں اور اِن اُصولوں کے عملی رُخ کی طرف کبھی نظر نہیں ڈالتے ایک یا دو مثالیں اس خیال کو واضح کر دیں گی۔ مثلاً

ارشمیدس کا اُصول پڑھانے میں شیشہ یا لوہے کے ٹکڑوں کو ہوا اور پانی میں متعدد مرتبہ تول کر مندرجہ ذیل نتیجہ طلبہ سے اخذ کرایا جاتا ہے "اگر کسی چیز کا جُز یا کُل پانی میں ڈبویا جائے تو اس پر اوپر کی طرف اُچھال پڑے گا اور یہ انتصابی اُچھال کی طاقت پانی کے اُس حجم کے وزن کے مساوی ہوگی جتنا پانی اُس چیز کے ڈبونے سے ہٹ جاتا ہے" لیکن اِس اُصول کے عملی حصہ کو ہم بالکل چھوڑ دیتے ہیں مثلاً اِس اُصول کو اخذ کرانے کے قبل اگر ہم وزنی جہازوں کا سمندر میں تیرنا۔ سمندر میں ڈوبتے مسافروں کو بچانے کے واسطے تیرنے والے ڈاکس (DOCKS) اور ربر کے لباس جس کے پہننے کے بعد اِنسان پانی کے اُوپر قائم رہتا ہے۔ غرق شدہ جہازوں کا پتہ سمندر سے نکالنا۔ آبدوز کشتیوں کا حسب خواہش پانی کے اندر جانا اور اوپر نکلنا، غباروں اور طیاروں کا ہوا میں اُڑنا تصاویر اور ماڈل کے ذریعہ دکھایا جائے تو سبق میں ایک خاص دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

مادّہ کی تین حالتیں۔ ٹھوس، مایع، گیس کو عام طور سے برف، پانی، بھاپ کی آپس میں تبدیلیوں سے سمجھا دیا جاتا ہے اور اس کے بعد ٹھوس، مایع، گیس کی تعریفیں لڑکوں کو یاد کرا دی جاتی ہیں۔ لیکن اگر اِسی سبق میں زمین کی ابتدائی حالت نظام فلکی کے سیاروں کی

بناوٹ اور اُن کے گرد سوڈیم، ہائیڈروجن، ہیلیم وغیرہ عناصر کے ابخرات کا خول اور اُن کی شناخت، دھاتوں اور پتھروں کا برقی بھٹی میں پگھلنا، تاروں کی برقی ترتیب میں فیوز کا استعمال، گیس کاربن ڈائی آکسائڈ کا مایع اور ٹھوس میں تبدیل ہونا اور اُس کے ذریعہ ہوا کا مایع میں تبدیل ہونا اور اسی طرح کے دوسرے عملی کاموں کے متعلق دلچسپ معلومات دی جائیں تو طلبہ کی دلچسپی ابتدا ہی سے اُس سبق سے وابستہ ہوجاتی ہے اور اِن تمہیدی واقعات کو تفصیل سے معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوجاتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ طلبہ سائینس کو نہایت مشکل مضمون خیال کرتے ہیں اور اِس میں شک بھی نہیں کہ اگر ہم صرف سائینس کے دقیق اُصولوں پر اکتفا کریں تو مضمون سوکھا اور غیر دلچسپ ہوجاتا ہے اور طلبہ کی بیزاری کا باعث بنتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ابتدائی جماعتوں سے کامیاب ہو کر جب میں نے سائینس کو اپنا مضمون اختیاری قرار دیا اُس وقت سائینس میرے خیال میں نہایت دلچسپ مضمون تھا۔ سائینس کے کمرہ اور دار التجربہ میں برق اور نور سے متعلقہ جو آلات تھے اُن سے عجیب عجیب خیالات اور اُمیدیں وابستہ تھیں۔ تعلیم کا آغاز ہوا اور جس قسم کے تجربات اور طریقہ تعلیم سے سابقہ پڑا اُن سے جلد اِس امر کا پتہ چل گیا کہ ہمارے خیالات اور اُمیدیں ایک خواب یا افسانے سے زیادہ نہ تھیں۔ ذیل میں ابتدا کی دو ایک باتیں دی جاتی ہیں۔

۱۔ متعدد مختلف لمبائیوں کے خطوط مستقیم کھینچو پھر اُن کو انچ اور سینٹی میٹروں میں ناپو اور یہ معلوم کرو کہ ایک انچ میں کتنے سینٹی میٹر ہوتے ہیں۔

۲۔ چند دائرے مختلف نصف قطر کے کھینچو پھر دھاگے کے ذریعہ اُن کے محیط کی لمبائیاں ناپو اور یہ معلوم کرو کہ اُن کے محیط اور قطر میں کیا نسبت ہے۔ بعد ازاں رقبہ اور حجم کے پیمانہ شروع ہوئے۔ اُن کو زبانی یاد کرنا پڑا۔ گراف کاغذ پر متعدد مثلثات، مستطیل، زوار بعتہ الاضلاع بنا بنا کر اور خانے گن گن کر اُن کے رقبے معلوم کئے گئے۔ شیشے کے ٹکڑوں کو دھاگے سے باندھ کر اُن کے حجم معلوم کرنا پڑا۔ وغیرہ وغیرہ اور یہ سلسلہ ۴ یا ۵ ماہ تک جاری رہا۔ ظاہر ہے کہ اِس سوکھی ساکھی ابتدا سے مُبتدی کی کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ اگر اِس قسم کی ابتدا ضروری ہے تو زیادہ بہتر ہوتا کہ یہ عملی حصہ ریاضی کے اسباق کے ساتھ شامل کردیا جاتا۔ اِس طرح سے ریاضی کا مضمون بھی پہلے کی بہ نسبت دلچسپ ہوجاتا اور سائینس کا پھیکا پن بھی دور ہوجاتا۔ سائینس ٹیچر کو چاہیئے کہ وہ اس مضمون میں طالب علم کا

ابتدائی ذوق اپنے دلچسپ طریق عمل سے برابر قایم رکھے۔ دلکش تجربوں کو وقتاً فوقتاً طلبہ کے سامنے عمل میں لانے کی اہمیت کو برابر مدنظر رکھے۔ تجربات اِس نوعیت کے ہوں کہ جس اُصول کی وہ وضاحت کردے وہ بھی طالب علم پر پورا پورا واضح ہو جائے اور طالب علم کی دلچسپی بھی قایم رہے اِس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ سائینس ٹیچر مثل آتش باز یا بازیگر کے ہمیشہ دلچسپی کی خاطر تماشا دکھایا کرے۔ بلکہ موقعہ اور محل کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً ایسے تجربات کی ضرورت ہے جو وقتی سبق پر بھی روشنی ڈالتے ہوں اور ساتھ ہی ساتھ خوش کن بھی ہوں۔ بطور مثال کلورین گیس پر ایک تمہید دی جا رہی ہے۔

مدعا۔ کلورین گیس کی تیاری اور خواص۔

تمہید۔ یہ گیس آج سے قریب ۱½ سو برس پیشتر شیل نے دریافت کی تھی (شیل کی تصویر دکھائی جائے)۔ لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جرمنی نے اتحادیوں کے مقابلے میں اول اول وائی رس (YPRES) کے میدان میں زہریلی گیس کی حیثیت سے اس کو اِستعمال کیا۔ ذیل کا خاکہ وائی رس کا میدان۔ جرمنوں کی خندقیں جن کے سامنے فولادی استوانوں کی قطاریں جن سے حسب خواہش ٹونٹی گھما کر کلورین گیس کھولی یا بند کی جاسکتی ہے دکھا رہا ہے۔ کلورین کا خارج ہونا اور شمالی ہواؤں سے اِس ہلکی ہلکی سبز اور زرد گیسوں کے دل بادلوں کا

ایک نقاب پوش سپاہی ناک کو ایک بنج سے دبا لیا ہے اور منھ پر ایک نقاب چڑھی ہے۔ سانس منھ کے ذریعہ لیتا ہے۔ زہریلی گیس نقاب میں جذب ہو کر ہوا کے ساتھ منھ کے اندر نہیں جا سکتی۔

زہریلی گیس سے حفاظت اور کیمیائی ۱۹۱۶ء مرکبات سے بنی ہوئی ایک نقاب جس میں سے ایک سونڈ کی طرح نالی نکلکر ایک صندوقچہ میں داخل ہوتی ہے اس میں گیس کو جذب کرنے کے لئے ایک مرکب رہتا ہے

فرانسیسی فوجوں کی طرف حرکت کرنا۔ اِن سپاہیوں کی اِس گیس سے غیرواقفیت اُن کا کلورین کے سبز اور زرد دھوئیں میں دُشمن کی گولہ باری سے پناہ لینے کیواسطے چھپنا اور اِس زہریلی گیس سے متاثر ہوکر بہتوں کا وہیں پر ایسے گرنا کہ پھر تا قیامت نہ اُٹھنا۔ اِسطرح سے ۲۰۰۰ سپاہیوں کا اس کا شکار ہو جانا، بچے ہوئے سپاہیوں کا مثل پاگلوں کے بدحواس ہوکر اِدھر اُدھر بھاگنا بعد ازاں اِس گیس کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے چہروں پر کیمیائی مُرکبات سے بنی ہوئی نقابیں ڈالنا۔ جو مثل جاذب کے کام کرتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ طلبہ کے سامنے بیان کرنا اور اُن کو ضروری متعلقہ تصاویر دکھانا۔ کلورین گیس کی سمیت کے متعلق اِس واقعہ کے بتانے کے بعد طلبہ کو یہ بتایا جائے کہ یہی مُہلک گیس معمولی نمک کا ایک جُز ہے جو کہ ہم سب روز مرّہ کھانے میں اِستعمال کرتے ہیں۔ نمک کا دوسرا جز سوڈیم جو مثل موم کے نرم ایک دھات ہے (اس کے ایک ٹکڑے کو چاروں طرف چاقو سے تراش کر اس کی چاندی کی ایسی چمک لڑکوں کو دکھائی جائے) پانی پر سوڈیم کا تعمل اور اُس کا پانی کی سطح پر مثل مکھی کے بھنبھنانا اور اِدھر اُدھر گردش کرنا اور چھوٹا پڑتے پڑتے غائب ہوجانا اس کے بعد ایک چوڑے برتن میں پانی لے کر اُس کی سطح پر ایک جاذب کاغذ کا ٹکڑا رکھنا۔ اُسپر سوڈیم کا ایک ٹکڑا رکھنا۔ پانی کے چھوٹے چھوٹے قطرے جاذب کے مسامات سے نکلکر سوڈیم سے مَس ہوں گے اور کاغذ میں آگ لگ کر شعلہ پیدا ہوجائے گا۔ اب طلبہ سے اِس کیمیائی تعمل کے متعلق دو ایک سوال کئے جائیں۔ (نمبر ۱۔ سوڈیم کا ٹکڑا خشک جاذب کاغذ پر رکھنے سے شعلہ کیوں نہیں پیدا کرتا؟ نمبر ۲۔ جاذب کاغذ کے نم ہو جانے کے بعد آگ کیوں لگتی ہے؟ پانی کی سطح پر سوڈیم مثل مکھی کے کیوں اِدھر اُدھر گردش کرتا ہے؟) اِن تمام تجربات اور واقعات دیکھنے اور سننے کے بعد طلبہ کو نہایت حیرت ہوگی کہ نمک کے دونوں اجزا علٰحدہ علٰحدہ اِنسانی زندگی کے واسطے کِس قدر مہلک ہیں لیکن دونوں کیمیائی تعمل کے بعد کِس قدر مُفید ثابت ہوتے ہیں۔ (اُستاد کو اِس موقع پر اِس امر پر پھر روشنی ڈالنا چاہیئے کہ ۲ یا ۲ سے زیادہ عناصر یا مرکبات میں کیمیائی تعمل کے بعد اُن کے خواص میں کتنی اہم تبدیلیاں ہوتی ہیں) اِس تمہید میں ۱۰ سے ۱۵ منٹ کا وقفہ صرف ہوگا اُسوقت جماعت کا ہر طالب علم کلورین کے متعلق اور زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے خاص طور پر بےچین نظر آئے گا۔ اب اصل سبق پر آنا چاہیئے دار التجربہ میں اِس کی تیاری اور خواص دیکھنے کے

بعد اِس گیس کے متعلق مزید اور تفصیلی حالات معلوم کرنے کے لئے طلبہ کو چند کیمیا سے متعلق کتابیں پڑھنے کو بتا دی جائیں۔

اِس طرح سے طلبہ میں مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے اور یہ کام اُستاد کا ہے کہ وہ اُن کے واسطے اُن کی قابلیت کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب کتب کا انتخاب کرے اور اُن کو اپنے اسکول کے سائینس کے کتب خانہ میں فراہم کرے۔ اگرچہ ہماری زبان میں سائینس سے متعلقہ مناسب کتابوں کی نہایت ضرورت ہے لیکن انگریزی میں اس مضمون پر سینکڑوں کتابیں موجود ہیں اور ہمارے مدارس کی نویں جماعت کے لڑکے تھوڑے سے اصطلاحات سمجھنے کے بعد اِن کو آسانی سے پڑھکر سمجھ سکتے ہیں۔ عام طور سے ہمارے مدارس میں اُردو میں سائینس کی کتابیں نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ کو نوٹس لکھا دئیے جاتے ہیں۔ اور طلبہ اُنہیں پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ یہہ طریقہ ممکن ہے کہ امتحان کی کامیابی کے واسطے مناسب ہو لیکن اِس طریقہ سے لڑکوں کے عام معلومات بالکل محدود ہو جاتے ہیں اور سائینس کے آسان اُصولوں کا مفہوم بھی اُن پر پوری طور سے واضح نہیں ہوتا۔ ذیل میں میٹرک جماعت کے ایک طالب علم کا اسکول میں لکھا ہوا نوٹ متعلقہ برقی لیمپ درج کیا جاتا ہے۔

" . . . . برقی لیمپ میں جو برقی توانائی صرف ہوتی ہے اُس کو واٹوں سے تعبیر کرتے ہیں اور واٹ ایمپیروں کے اختلاف قوت اور رو کے حاصل ضرب سے حاصل ہوتا ہے۔ ١٠٠٠ واٹس مِلکر ایک کِلوواٹ بناتے ہیں اور ٧٤٦ واٹس مِلکر ایک گھوڑے کی طاقت کے مساوی ہے۔ ذیل کی مثال سے تم واٹ کے معنی پورے طور سے سمجھ جاؤ گے۔

٢٨ء امپیر کے رو ٢٢٠ وولٹ کے دَور سے گذرتی ہے تو بتاؤ فی گھنٹہ کتنی برقی توانائی صرف ہوتی ہے۔

واٹ = برقی رَو × اختلاف قوۃ

= ٢٨ء × ٢٢٠

= ٦١ء٦ وَاٹ فی گھنٹہ "

یہہ طالب علم میرے ایک دوست کا لڑکا تھا اُس کے مکان کے برآمدہ میں بجلی کا میٹر نصب تھا میں نے اُس لڑکے سے کہا کہ اِس میٹر کو پڑھ کر بتاؤ کہ اس وقت تک تمہارے مکان میں کتنی بجلی صَرف ہو چکی ہے اُس طالب علم نے جواب دیا کہ اگر آپ اس نوٹس کو ایک منٹ

پڑھنے کی اجازت دیں تو غالباً میں آپ کے سوال کا جواب دے سکوں گا۔ میں نے نوٹ بک
اُس کے حوالے کردی اُس نے متعدد مرتبہ غور سے اِس بات کو پڑھا "برقی لیمپ میں
جو برقی توانائی صرف ہوتی ہے اُس کو واٹون سے تعبیر کرتے ہیں اور واٹ سیرون کے
اختلاف قوۃ اور رَو کے حاصل ضرب سے حاصل ہوتا ہے۔"
بعدازاں اُس طالب علم نے بجلی کے میٹر کو غور سے پڑھا اور ایک ایسا جواب دیا
جو میرے خیال میں بھی نہ آسکتا تھا۔ اگرچہ جواب بالکل غلط لیکن نہایت دلچسپ تھا۔ ذیل
میں اس وقت میٹر کی سوئیاں جن نشانات پر تھیں درج کی جاتی ہیں۔

بجلی کا میٹر

KILOWATT HOURS

1000 100 10 1

5 AMPRS 230 VOTH

1/10 K.W.H.
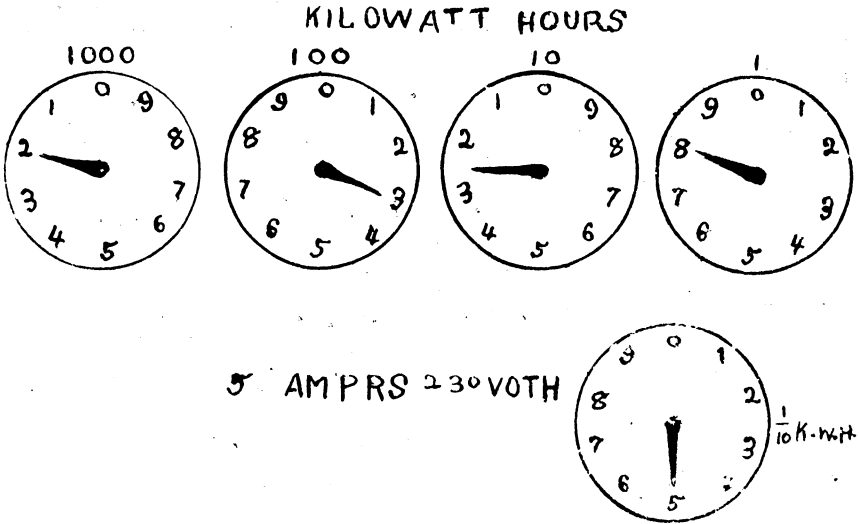
طالب علم کا جواب یہ تھا۔ " ۲۸، × ۲۳۰ = ۶۴،۴ واٹس "
سوال۔ تم نے یہ جواب کیسے معلوم کیا؟
جواب۔ میرے خیال میں پہلی دو گھڑیوں کی سوئیاں برقی رَو کو ظاہر کر رہی ہیں اور
دوسری دو گھڑیاں اختلاف قوۃ کو اور دونوں کا حاصل ضرب ۶۴،۴ واٹس ہوا۔
سوال۔ یہ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ پہلی دو گھڑیاں برقی رَو اور دوسری دو گھڑیاں اختلاف
قوۃ کو بتاتی ہیں۔

جواب ۔ (اگرچہ غلط لیکن دلچسپ ہے) نوٹ میں دیا ہے کہ واٹس دو عددوں کے حاصل ضرب سے ملتا ہے۔ ایک برقی رَو اور دوسرا اختلاف قوۃ۔ یہاں پر دو عددوں کا ہونا ضروری ہے اس لئے میرے خیال میں پہلی دو گھڑیاں برقی رَو کو ظاہر کر رہی ہیں (دی ہوئی مثال میں بھی ۲۸ ، ایمپری کی رَو دی ہے) اور آخری دو گھڑیاں اختلاف قوۃ کو کیونکہ ان سے ۲۴۰ کا نمبر ظاہر ہوتا ہے)

سوال ۔ لیکن مثال میں اختلاف قوۃ ۲۰۳ لکھا ہے۔ یہاں پر ۲۳۰ ہے۔ یہ کیوں؟

جواب ۔ چونکہ روزانہ بجلی کا پنکھا اور برقی لیمپ چلتے ہیں اس لئے اس میں اضافہ ہو گیا۔

اِن جوابات سے پتہ چلتا ہے کہ طالب علم مذکور صرف واٹس ہی سے ناواقف نہیں ہے بلکہ برقی رَو، اختلاف قوۃ کے متعلق اُس کے علمی معلومات بالکل غلط ہیں۔ اُس کے جواب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ برقی رَو کی مقدار ہمیشہ مستقل رہے گی اور اختلاف قوۃ میں کمی بیشی اور یہ صرف نوٹ پر اکتفا کرنے کا نتیجہ ہے۔ صحیح جواب جو طالب علم مذکور کو سمجھا دیا گیا یہ: پہلی گھڑی ۸، ، ۔ دوسری گھڑی ۲ ۔ تیسری گھڑی ۴۰ اور چوتھی گھڑی ۲۰۰ جملہ ۲۴۲،۸ واٹس تھے۔

اگر ہم کو اپنے طلبہ کی عام معلومات اور قابلیت میں اضافہ منظور رہے تو ابتداء سے اُن میں مطالعہ کی عادت پیدا کرنا ضروری ہے۔ عام طور سے طلبہ کی کیفیت یہ رہتی ہے کہ جب امتحان کے دو چار ہفتے باقی رہ جاتے ہیں تب وہ اپنی داخلی کتب یا نوٹس کو یاد کرنا شروع کرتے ہیں۔ اور اپنے دماغوں میں تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور ریاضی وغیرہ کے واقعات اُصول اور ضابطے ایسا ٹھوس ٹھوس کے بھرتے ہیں جیسے فٹ بال میں ہوا بھری جاتی ہے۔ امتحان میں شرکت کی اور اگر خوش قسمتی سے کامیابی حاصل کرلی اور معیار قابلیت کا صداقت نامہ مل گیا تو پھر کبھی بھول کر بھی ان پڑھی ہوئی یا ایسی دوسری کتابوں پر نظر نہیں ڈالتے اور بموجب ذیل کے مصرع کے

"ایسے بیگانے بنے گویا شناسائی نہ تھی"

اِن کی غرض وغایت امتحان، امتحان و امتحان تھی۔ امتحان ختم ہوا سمجھے کی سر سے بلا اُتری۔ ہم کو چاہئے کہ اپنے بچوں کی طبیعتوں میں ابتداء ہی سے مطالعہ کا شوق پیدا کردیں اور بتادیں کہ اِن کتابوں کے اوراق میں ایک بیش قیمت اور لافانی سرمایہ

زمانہ سلف سے جمع ہوتا آرہا ہے اور یورپین قومیں آج اسی خزانہ سے مالامال ہو رہی ہیں
اکثر مدارس کے طلبہ میں مطالعہ کا شوق اور سائنس کی فضا پیدا کرنے کے لئے دارالمطالعہ اور دارالتجربہ اور جماعت کے کمروں میں مشہور سائنسدان کے فوٹو۔ صنعت و حرفت کے بڑے بڑے کارخانہ جات، طبیعات اور کیمیا سے متعلق دلچسپ گراف اور خاکے آویزاں رکھتے ہیں۔ ان تصاویر اور خاکوں میں اِن کے متعلق ضروری اور مختصر حالات بھی درج کر دئیے جاتے ہیں۔ تفصیلی حالات اُستاد موقع اور محل کے لحاظ سے یا تو دوران سبق میں بتا دیتا ہے یا کسی کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتا ہے۔ فراڈے (ڈائینمو۔ موٹر اور موجودہ برقی کارنجات کا موجد)۔ نیوٹن (نور اور کشش زمین)۔ ڈیوی (برق کشیدگی اور ملمع سازی)۔ رانجن (لاشعائین)۔ ڈاروِن (وجود انسانی)۔ مارکونی (لاسلکی) ہالینڈ (آبدوز کشتیاں)۔ دِلبر رائیٹ (ہوائی جہاز)۔ بل BELL (لاؤڈ اسپیکر)۔ بے یر (رنگ)۔ نوبل (بمب کا مادّہ) اور دوسرے مشہور سائنسدان کی تصاویر آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اگر ان تصاویر کے ساتھ ان قابل فخر ہستیوں کے کارناموں کا کوئی خاکہ بھی بنا رہے تو اور بھی زیادہ مناسب ہو۔ مثلاً رانجن کی تصویر کے ساتھ لاشعاعوں کا برقی لیمپ۔ یا لاشعاؤں سے فوٹو لیا ہوا کسی بیمار کے اندرونی جسم کا ایسا حصہ جس کی خرابی باہر سے نظر نہ آتی ہو۔ یا مارکونی کی تصویر کے ساتھ لاسلکی کا آلہ۔ بڑے بڑے کارنجات میں مصنوعی ربر۔ مصنوعی ریشم کے تیار کرنے کے کارخانے، کاغذ، برقی لیمپ۔ آلات جنگ۔ ہوائی جہاز۔ ریلوے انجن۔ لاسلکی آلات۔ رنگ سازی اور دوسرے کارخانہ جات کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ خاکے اور ماڈل اگر طلبہ ہی کے تیار کردہ ہوں تو اور زیادہ مناسب ہے۔ یہ خاکے اور ماڈل اس قسم کے ہوں کہ ان سے سائنس کے کسی اہم اصول کی توضیح ہو رہی ہو۔ بطور نمونہ ذیل میں بھاپ سے چلنے والے انجن کا ایک خاکہ دیا جاتا ہے۔

نوٹ:۔ بھاپ پہلے راستہ سے داخل ہوتی ہے
نمبر ا پسٹن بائیں جانب حرکت کرتا ہے۔ اور پسٹن نمبر ۲
داہنی طرف جب بھاپ دوسرے راستہ سے
داخل ہوتی ہے تو پسٹن نمبر ا داہنی طرف اور نمبر ۲
بائیں طرف۔
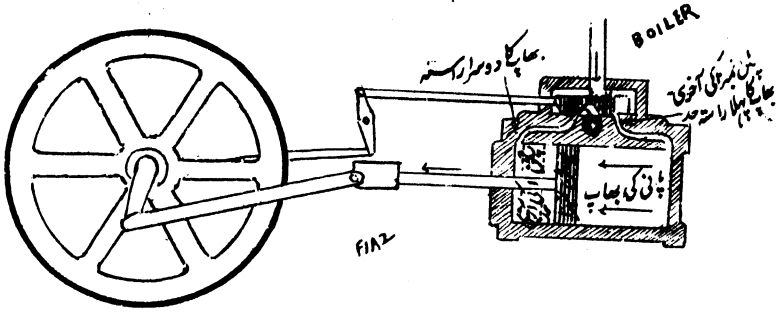
طلبہ اِس قسم کے خاکے اور ماڈل بنانے میں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔ اِس قسم کا کام دستی مشاغل کے اسباق کے ساتھ وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ لڑکوں کی خوشی کی کوئی حد نہیں رہتی جب وہ اپنے ہاتھ سے تیار کردہ ماڈل کو حرکت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ برق اور مقناطیس کے اسباق میں اِس قسم کے دستی کام کے واسطے کافی مواد ہے۔ مثال کے طور پر متحرک موٹر۔ ڈائنمو۔ برقی گھنٹی۔ ٹیلیفون۔ اور ٹیلگرام۔ برقی سِل تیار کر کے چھوٹے چھوٹے لیمپ کا روشن کرنا۔ برقی مقناطیس کے ذریعہ جاپانی گتّا پارچہ کی بنی ہوئی بطوں اور آبدوز کشتیوں کا حسب خواہش پانی کے اندر اور اُوپر آنا۔

نور سے متعلق۔ قوس قزح، نیوٹن ڈِسک، ٹیلس کوپ، پن ہول کیمرہ۔ فوٹو لینا اور اُن کا دُھونا۔ اسٹریا سکوپ کیلڈا اسکوپ وغیرہ بنانا۔

گرمی سے متعلق۔ بھاپ کا انجن۔ تپش پیما۔ باد پیما۔ مختلف دھاتوں کو پگھلا کر آپس میں جوڑنا۔ اِن کے علاوہ پانی کے دباؤ سے گردش کرنے والے چکر یا فوارے ہائیڈروجن سے بھرے ہوئے غباروں کا ہوا میں اُڑنا۔ برق کشیدگی اور ملمع سازی وغیرہ۔ ایسے ہی دوسرے کام جو تھوڑی سی کوشش اور خیال کے بعد انجام دئے جا سکتے ہیں۔ جارج اسٹوانسن، نیوٹن، مارکونی۔ تھامسن۔ رابنجن کے مثل سائنس کی ممتاز ہستیاں ہمیشہ اِس قسم کے دستی مشاغل کے شیدائی ہیں۔ اور اِن کے معرکتہ الآرا کارنامے

اِس شوق اور شغل (HOBBY) کے نتائج تھے۔

اِن تمام باتوں کی کامیابی کا انحصار بہت کچھ سائینس ٹیچر کی ذات سے وابستہ رہتا ہے۔ دار التجربہ سائینس کے تمام ضروری سامان سے آراستہ ہو۔ کتب خانہ میں سائینس سے متعلقہ تمام مفید کتابیں موجود ہوں۔ سائینس کا نصاب بھی نہایت سوچ سمجھکر مرتب کیا گیا ہو لیکن اگر سائینس ٹیچر کو اپنے کام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اُس میں ضروری علمی قابلیت کی بھی کمی ہے تو یہ سب سامان بیکار ہے اِس کے برعکس ان تمام سامان اور آسانیوں کی غیر موجودگی میں بھی اگر اُستاد کو اِس مضمون سے دلچسپی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُس میں ذاتی قابلیت بھی موجود ہے تو وہ اپنے کام کو کامیاب بنالے گا۔ وسطانیہ اور فوقانیہ جماعتوں کی حد تک اُستاد کا سائینس سے متعلق ایک یا دو مضامین میں گریجویٹ ہونا کافی نہیں ہے۔ مثلاً کیمیا اور طبیعات کا گریجویٹ اگر علم نباتات اور علم حیوانات کے معمولی اُصولوں سے ناواقف ہے تو وہ اپنے کام کے لئے پورے طور سے موزون نہیں ہے اور یہی صورت علم نباتات اور علم حیوانات کے گریجویٹ کی ہے۔ سائینس ماسٹر حتیٰ الامکان ٹرنیڈ اور اپنے مضمون کا اسپشلسٹ ہونا چاہیئے ورنہ کم ازکم فنِ تعلیم سائنس کی ضروری کتابوں کا ضرور مطالعہ کرچکا ہو۔ اِس میں شک نہیں کہ کسی فن میں اُس فن کے متعلق قدرتی موزونیت ہونا بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن اگر اِس قدرتی موزونیت کے ساتھ ساتھ ضروری تربیت اور اُس شخص کا اِنہماک بھی شامل کرلیا جائے تو کیا کہنا۔ سائینس میں آرے دن آہم انکشافات اور ایجادات ہوتے رہتے ہیں۔ اور اِن سے اکثر سائینس کے پُرانے نظریہ بالکل غلط ثابت ہوجاتے ہیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب کسی عنصر کا جوہر اُس عنصر کا جُز لاتیجزا سمجھا جاتا تھا لیکن جوہر کا رُون (الکٹرن) میں منتشر ہونا اس نظریہ کو غلط کردیتا ہے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ سائینس ٹیچر سائینس سے متعلقہ مضامین اور رسالوں کے مطالعہ سے اپنے معلومات کو برابر تازہ رکھے۔ اور اُنہیں معلومات پر قانع نہ رہے جو اُس نے دوران تعلیم میں اسکول یا کالج کے درس میں دس پانچ برس قبل حاصل کئے تھے۔ فنِ تعلیم میں بھی برابر نئے نئے خیالات اور مفید طریقوں کا اضافہ ہورہا ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ بحیثیت اساتذہ ہم اپنے فن کی تمام ضروری ترقیوں سے واقف رہیں اور اُن میں عملی حصہ لیں۔

—— از عالی جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم، اے، آکسفورڈ ——

(صدر المہام سیاسیات)

یہ پُر مغز خطبہ نواب صاحب ممدوح نے جلسہ تقسیم اسناد عثمانیہ یونیورسٹی کے موقع پر دیا تھا۔ جس کا ضروری اقتباس درج ذیل ہے۔

صاحب مُعز نے ہماری نظام تعلیم کا مطالعہ بنظر تعمق فرماکر بکمال سلامت وجدت اچھوتے خیالات ظاہر فرمائے اور بعض سُلجھی ہوئی اہم تجاویز پیش کی ہیں، جو ارباب فن کے لئے غور وفکر اور سابقہ خیالات کے نظر ثانی کا باعث ہوں گی۔

بلحاظ سہولت اِس اقتباس میں جابجا سُرخیاں بھی قائم کر دی گئی ہیں جو ہماری ہیں۔ (شریک مدیر)

قیام جامعہ کے اُصول اور اُن پر ایک نظر

مجھ کو اِن اُصولوں پر بیحد اعتقاد ہے جن پر آپ کی جامعہ مبنی ہے اور مجھے یہ بھی کامل اُمید ہے کہ اِس میں آئندہ ترقی کی بہت کچھ استعداد موجود ہے۔ میں نے اِس عظیم الشان منصوبہ کو بغور دیکھا تو صاف معلوم ہوا کہ یہ کوئی انیگلو ورنیکولر مخلوط مرکب نہیں ہے بلکہ خالص ہندوستانی پیداوار ہے۔ گویا آخرکار ہم کو اپنی زبان پر اعتماد ہو چلا جو قومی اتحاد کی پہلی شرط ہے۔ اِس کے ساتھ ہی ساتھ طرز تعلیم کی کمزوری بھی نمایاں ہونے لگی جس نے ہماری زبان کو بے قصور

قعر مذلت میں ڈال رکھا تھا اور اس نظریہ کو بطور ایک حقیقت کے تسلیم کر لیا تھا (جس میں
دراصل ہم ہندوستانیوں کی خاصی توہین مضمر تھی) کہ کوئی جدید علم نہ تو ہم سیکھ سکتے ہیں
اور نہ سکھا سکتے ہیں جب تک کہ ہم ایک غیر زبان کا وسیلہ اختیار نہ کریں اس کے ساتھ ہی
مجھ کو یہ بھی یقین ہونے لگا کہ قطع نظر اس دشواری کے جو ایک غیر زبان کے حاصل کرنے
میں لابد ہے اور جو نفس مضمون کی مشکلات پر مزید ہے۔ اس مروجہ طریق تعلیم سے ہم لوگوں
کو اپنی پستی کا ایک وہم سا ہوگیا تھا جو طبیعت میں جدت کے پیدا ہونے کے مانع تھا اور درسی
کتابوں کو زبانی رٹنے کی عادت پیدا ہوگئی تھی جس کی وجہ سے انسانی علوم کے ذخیرہ میں
ہم کوئی تازہ اضافہ بہت کم کر سکتے تھے۔

اس مفروضہ کو تسلیم کر لینا کہ ہماری زبان ایسی مفلس اور ادنیٰ ہے کہ وہ نہ تو علم کا
مخزن بن سکتی ہے اور نہ تعلیم کا ذریعہ بعینہ وہ ذہنیت پیدا کرنا ہے جو علمی اور عملی جدت
کے حق میں سم قاتل ہے۔

کامل ایک صدی تک ہماری زبان کی پستی کا یہ غلط اعتقاد بلا کسی تردید کے جاری
رہا۔ بلکہ جس وقت سے مکالے نے اپنی مشہور مگر بداصول رپورٹ (انگریزی میں تعلیم
دینے کی نسبت) مرتب کی اُس وقت سے اب تک اس کو خاموشی سے تسلیم کیا گیا۔
حتیٰ کہ لوگ اِس خیال سے اتنے متاثر ہوگئے کہ ہماری نئی جامعہ عثمانیہ کو جس نے ہندوستانی
زبان کو تعلیم کا ذریعہ قرار دیا سخت اختلاف بلکہ مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اِس اعتبار سے
یہ طفل بہت ناموافق آب و ہوا میں پیدا ہوا۔ بعض طفل کش موقع پاتے تو فوراً اس کا
گلا ہی گھونٹ دیتے۔ بعض یہ پیشین گوئی کرتے تھے کہ یہ بچہ جیا بھی تو بالغ ہوکر اپنے
پورے قد و قامت کو نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ ان کی رائے میں ہندوستانی زبان اعلیٰ علوم کا
مخزن اور تعلیم کا ذریعہ بننے کی استعداد ہی نہیں رکھتی تھی۔

نتائج قیام جامعہ | متعدد ہندوستانی اور برطانوی جامعات نے اس کو تسلیم کر لیا ہے
جس سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارا تعلیمی معیار دیگر مماثل جامعات کے
مقابل میں پست نہیں ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ مختلف طور پر طلبہ میں علمی احساس کے آثار
نمودار ہونے لگے۔ مثلاً دوسری جامعات کے اساتذہ جو ہمارے طلبہ کے ممتحن مقرر
ہوئے تو انہوں نے اپنی رائے میں اِس بات کا خصوصیت سے اظہار کیا کہ ہمارے

طلبہ میں بہ نسبت ہندوستان کی دوسری جامعات کے ذاتی تحقیق کا مادہ زیادہ نظر آتا ہے۔ اس کے سوا ہمارے بعض طلبہ نے برطانیہ عظمیٰ کی جامعات میں اعلیٰ ترین درجہ کی ڈگریاں حاصل کیں بالخصوص سائنس اور ریاضی میں اُنہوں نے کچھ جدید کام بھی کر کے دکھایا ہے۔ علاوہ بریں اِن نوجوانوں میں تصنیف و تالیف کا بھی شوق بڑھ رہا ہے۔ اور کئی علمی کاموں میں مشغول ہیں۔ یہہ بھی امید افزا ہے کہ اسی جامعہ میں علوم جدیدہ نے بہت مقبولیت حاصل کی ہے اور بالخصوص سائنس، ریاضی اور معاشیات طلبہ میں بہت عام پسند ہیں۔

حاصل کلام یہہ کہ گوناگون علوم و فنون میں ہندوستانی زبان سے خواہ کیسا ہی سخت کام لیا گیا ہو وہ ہر ایک موقع پر بہ ضرورت کو کافی ثابت ہوئی۔ اِس تجربہ نے نوجوانان ملک میں خوداعتمادی کی ایک تازہ لہر دوڑادی اور اُس زبان پر فخر و اعتماد پیدا کر دیا جو اپنی زبان ہے۔

ابتدائی و ثانوی تعلیم

یہہ مسلمہ اصول ہے کہ ابتدائی تعلیم بچوں کی مادری زبان میں دینی چاہیئے اور اس ریاست میں ہندوستانی کے سوا اور بھی کئی زبانیں رائج ہیں لہٰذا تحتانیہ مدارس میں اس اُصول پر عملدرآمد ضروری ہے رہی ثانوی تعلیم تو بدقسمتی سے اس ریاست میں اس کے دو جداگانہ طریق مروج ہیں اور اس کی وجہ یہہ ہے کہ بعض درس گاہیں اب تک انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا کام یہہ ہے کہ مدراس یونیورسٹی کے واسطے طالب علم مہیا کریں۔ لیکن میں اس موقع پر اسی طریق کا سرسری ذکر کرونگا جو جامعہ عثمانیہ سے متعلق ہے۔ یہہ تو ہر کسی کے واسطے ممکن نہیں کہ جامعہ میں داخل ہونے کے واسطے اس کو مہلت اور استطاعت میسر ہو اور دوسری طرف جامعہ کو بھی اپنی گنجایش اور کارکردگی کے مدنظر داخلہ کو محدود کرنا ضروری ہے اور علاوہ اس کے یہہ بھی کچھ مناسب اور مفید نہیں ہے کہ محض ادبی تعلیم دے کر کوئی بڑی جماعت تیار کی جائے۔ اس لئے یہ سوال بہت اہم ہو جاتا ہے کہ جو لوگ جامعہ میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور اُن سے کہیں زیادہ وہ لوگ جو کسی نہ کسی وجہ سے عملی پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، اِن دونوں طبقوں کے درمیان کس طرح اور کہاں حد فاصل قائم کی جائے۔ اس ضمن میں میں خیال کرتا ہوں کہ چند سال قبل کی تجویز کو دوبارہ زندہ کرنا چاہیئے۔ وہ یہہ کہ ثانوی مدارس میں دو قسم کی تعلیم جاری ہو۔ یعنی جو جامعہ میں داخل ہونا چاہیں وہ بدستور عثمانیہ میٹرک کے ذریعہ داخل ہوں اور جو باقی رہیں اُن کو حرفتی تعلیم دی جائے۔ اِس تعلیم کا دیہاتی علاقوں میں زراعت اور قصباتی مرکزوں میں

صنعت و حرفت سے تعلق ہوگا اور اس طرح سے ایک چھوٹی تعداد میں، فوقانیہ مدارس جو معدودے چند ہونے کی وجہ سے اعلیٰ کارگزاری دکھا سکیں گے، جامعہ عثمانیہ کے واسطے طلبہ مہیا کریں گے۔ اور عام طور پر جو حرفتی تعلیم دی جائے گی، اس سے بے روزگاری کا مسئلہ ایک حد تک حل ہو جائے گا۔

مقصد تعلیم

جامعہ کی تعلیم کا بلکہ تمام تعلیم کا نصب العین کیا ہے؟ میرے نزدیک تعلیم کا مقصد یہہ ہے کہ ہم میں جو اعلیٰ ترین اوصاف ہوں وہ ظاہر ہو جائیں اور اس طرح دنیا میں ہمارے فرائض جو کچھ ہوں وہ سب سے احسن طریق پر انجام پائیں۔ یہہ تعریف جامع ہے اور اس میں ہر قسم کی دماغی، اخلاقی، اور جسمانی ترقی شامل ہے بلکہ یہہ تعریف حاوی ہے ہر اس چیز پر جو زندگی کے لئے ہم کو تیار کر سکتی ہے۔ یہہ سوال کہ کس حد تک یہہ ترقی ممکن ہے اور انسان میں کمال عروج کس چیز کو کہتے ہیں ایسا ہے جس پر قیاس دوڑانا بے سود ہے۔ مگر کوئی وجہ نہیں کہ ہم میں سے ہر شخص ترقی کے لاتمناہی راستہ پر جس حد تک اس سے ممکن ہو گامزن کیوں نہ ہو۔ اسی طریق سے جس چیز کو اصطلاح میں ہم "تکمیل" کہتے ہیں وہ عمل میں آسکتی ہے، یعنی جس حد تک ممکن ہو ہم کمالات حاصل کر سکتے ہیں اور جن فرائض زندگی کا ادا کرنا ہمارے ذمہ ہو اُن کو بجالانے کی قابلیت حاصل کر سکتے ہیں ورنہ زندگی کا کوئی نیتجہ نہ ہوگا۔ مختلف لوگ مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو دنیوی زندگی کے لئے تیار کرتے ہیں مثلاً اپنے میلان طبع یا حوصلہ کے مطابق کسی خاص پیشہ یا کسب معاش کے کسی مخصوص طریقہ کے لئے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح کی مخصوص اغراض کے لئے تیاری ہماری ترقی کی معاون ہو سکتی ہے نہ کہ مانع بشرطیکہ ہم تناسب کا لحاظ رکھیں یعنے جو مقاصد مقابلتاً ادنیٰ ہوں اُن کو اعلیٰ مقاصد پر ترجیح نہ دیں کیونکہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا سب سے افضل اور اعلیٰ نصب العین انسانی تکمیل ہے۔ ہم جس قدر بہتر انسان بن سکیں گے اُسی قدر ہم پیشہ یا شغلہ کو بہتر انجام دے سکیں گے۔ ہمارا مسلک یہ ہونا چاہیئے کہ "اول انسان بنو اُس کے بعد جو چاہے بن سکتے ہو" یہہ طریق دراصل اُن خصائل انسانی کے حاصل کرنے کا ہے جو آدمی میں سب سے اعلیٰ ہوں۔ اس طریق سے انسان گویا کثافت کو دُور کر کے لطیف ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی اس کی قابلیتیں نشو و نما پاتی ہیں۔ اس مذکورہ "انسانیت" اور خلوص کا حصول صرف اس علم کے ذریعہ سے ممکن ہے جو صحیح ہو یعنی

جو حقیقت پر مبنی ہو اور اس میں عمل بھی شرط ہے، محض اکتساب علم کافی نہیں کیونکہ ہماری قابلیتیں صرف استعمال ہی سے ترقی کرتی ہیں۔ پس ہم کو چاہیئے کہ ہر چیز میں سچائی یعنی حقیقت کو تلاش کریں اور اپنے اعمال کو کسی اور غرض کا تابع نہ کریں شلاً مصلحت وقت کا کہ اس لفظ کے پردہ میں بہت سے معائب پنہاں رہتے ہیں اور مصلحت کوشی کو اکثر ان طریقوں کے اختیار کرنے کا بہانہ بنایا جاتا ہے جو خلوص اور راستی سے بہت دور ہوتے ہیں، یاد رہے کہ غلط راستوں سے کوئی اعلیٰ مقصد کو نہیں پہنچ سکتا۔

علاوہ حقائق کی تلاش و تجسس کے اور علاوہ اس آمادگی کے کہ ہم اپنے کردار کو ہمیشہ راست بازی اور غیرت کی تحت میں رکھیں گے جس چیز کی ضرورت ہے وہ جد وجہد اور کاوش کا ولولہ ہے۔ اس سے میرا مطلب وہ جوش و انہماک ہے جس کی بدولت زندگی کارآمد اور نتیجہ خیز بن جاتی ہے۔ اس عملی طاقت کے بغیر حقیقت کا تجسس صرف ایک آرام طلب اور کاہلی پسند سا فلسفہ ہوگا۔

جسمانی تربیت کسی ایسے ادارہ میں جہاں بہت سے نوجوان جمع ہوں اس سرگرمی اور انہماک کو (جس کا میں نے ذکر کیا) ہر وقت اور ہر کام میں نمایاں ہونا چاہیئے۔ اگر اس میں کمی یا زوال نمودار ہو تو یہ بری علامت ہوگی جوان مرد قوموں شلاً انگریز، فرانسیسی اور المانی لوگوں میں ہر ایک صحیح الجسم شخص یا تو فی الواقع سپاہی ہوتا ہے یا وقت پر بآسانی سپاہی بن سکتا ہے۔ اسی قسم کی روح ہمارے نوجوانوں میں بھی پیدا ہونی چاہیئے۔ کیونکہ جو شخص اپنی حفاظت خود نہ کر سکے اس کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ اس لئے کمزور خواہ اپنے حقوق کی بابتہ کیسی ہی لسانی کرے اُس کی دنیا میں کوئی توقیر نہیں ہوتی۔ سپاہیانہ تربیت دنیوی زندگی کے محاربہ کے لئے سب سے بہتر تیاری ہے اور جو اس طرح تیار اور مسلح نہ ہو، اُس کو شکست اور ذلت کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

ہماری تعلیم سے متعلق چند مشورے

از ایس۔ ڈبلیو کلکر صاحب

تعلیم سے کیا مُراد ہے؟ بظاہر سوال معمولی معلوم ہوتا ہے اور اس کا جواب بھی اسی طرح سادہ طور پر دیا جا سکتا ہے کہ لکھنا پڑھنا سیکھنے کا نام تعلیم ہے۔ اور اس لحاظ سے ہر ایسا شخص جو تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہو تعلیم یافتہ کہلانے کا مستحق ہو جائے گا۔ لیکن ہم تعلیم کے لفظ کو اُس کے وسیع معنوں میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

انسان سے عقل و تمیز کی قوت علیحدہ کر دی جائے تو حیوان و انسان میں کوئی مابہ الامتیاز فرق باقی نہیں رہتا۔ کھانے، پینے، رہنے، سہنے، اور توالد و تناسل میں وہ دوسرے حیوانوں کے برابر ہو جاتا ہے۔ صرف عقل و تمیز کی قوت سے کام لے کر انسان ان ضروریات کو بہتر سے بہتر صورت میں پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور عقل و تمیز کو ٹھیک طور پر استعمال کرنے کی صلاحیت تعلیم ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ صحیح اصول پر حاصل کی گئی ہو۔

ہمارا خیال ہے کہ تعلیم صحیح اصول پر نہ دی جائے تو اُس سے بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً سینما کو لیجئے، سب مانتے ہیں کہ اس کو تعلیم کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے گھنٹہ دو گھنٹے میں یہاں حاصل کرنے والا کسی درسی کلاس میں ۵، ۶ گھنٹے صرف کر کے تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو عام طور پر بری طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ مخرب اخلاق تماشے بتلائے جاتے ہیں۔ اکثر فلم متمدن ممالک کے ڈاکوؤں کے کارناموں سے بھرے رہتے ہیں۔ اور بعض بدطینت تماشہ بین ان تصاویر کو دیکھ کر چوری کے نئے نئے کرتبوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں ان کے افعال شنیعہ میں مدد ملتی ہے۔ برخلاف اس کے اخلاقی اور تعلیمی ڈرامے جو متحرک تصاویر کے ذریعے پیش کئے جاتے ہیں تھوڑی سے

دیر میں دیکھنے والوں کو بہت کچھ تبلا جاتے ہیں۔ یہی حال تعلیم کا ہے۔

تعلیم کے کئی شعبہ ہیں:۔ شعبہ فنون، پیشہ وری تعلیم، صنعت و حرفت، طب، تجارتی تعلیم وغیرہ۔

(۱) شعبہ فنون:۔ جس میں ادب وغیرہ شامل ہیں عام طور پر تعلیم کا مقصد بنے ہوئے ہیں۔ لوگوں کا رجحان زیادہ تر اسی طرف پایا جاتا ہے۔ اس شعبے میں طالب علم کی علمی ترقی کے لئے اعلیٰ اعلیٰ مدارج موجود ہیں۔ وہ اے۔ بی سے لیکر پی۔ ایچ۔ ڈی وغیرہ تک ترقی کرسکتا ہے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایک وسیع میدان اس کے سامنے پیش ہوتا ہے سرکاری ملازمت میں وہ داخل ہوسکتا ہے۔ خانگی طور پر معلمی کا پیشہ اختیار کرکے روزی وہ کما سکتا ہے۔ کسی اخبار کا اڈیٹر وہ بن سکتا ہے۔ تصنیف و تالیف کو اپنی روزی کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ کوئی مذہبی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ غرض اپنے مذاق کے مطابق کوئی نہ کوئی کام اختیار کر لیتا ہے۔ خود بھی اچھا شہری بنتا ہے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اچھے شہری بنا سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اگر بھٹک جائے تو اپنے ساتھ دوسروں کو گمراہ کرنے میں بھی کافی حصہ لیتا ہے۔

(۲) پیشہ وری تعلیم:۔ اس سے وہ تعلیم مراد ہے کہ انسان مقررہ نصاب ختم کرنے یا عملی امتحان پاس کرنے کے بعد آزادی کے ساتھ روزی حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ اگرچہ کہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ پیشہ وری تعلیم، طبابت، انجنیرنگ، قانون وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ان میں ترقی غیر محدود ہوتی ہے۔ پولس، جنگلات، فنانس، مالگزاری اور کروڑ گیری بھی اگرچہ کہ اسی شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ بہت ہی محدود شاخیں ہیں۔ جو لوگ ان میں مہارت حاصل کرتے ہیں صرف سرکاری ملازمت ہی پر ان کی روزی کا انحصار رہتا ہے۔

(۳) صنعت و حرفت:۔ اس شعبے میں بہت سی شاخیں داخل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مانچسٹر کی صنعتی جامعہ سے کم و بیش ۸۰ صنعتی پیشوں کا ڈپلوما اصولی طور پر مل سکتا ہے موجودہ زمانے میں جب کہ کسب معاش کے لئے مشکل سے مشکل دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہاں ان اصولی پیشوں کی بحث کرنا تحصیل حاصل ہے۔ ہمارے ملک کے لئے صنعت و حرفت کی یہ شاخیں مثلاً:۔ نجاری، لوہاری، پارچہ بافی، سناری، کارچوب

سازی، مصوری، طباخی، جوتہ سازی، ڈھلوائی، فرنیچر سازی وغیرہ اہم ہیں۔ جو ہماری زندگی کے ضروری حوائج کی تکمیل کرتے ہیں۔

متذکرہ بالا شاخوں میں سے ہر ایک میں کمال حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شعبہ فنون کے مدارج کی طرح اس کے بھی درجے قرار دئیے جا سکتے ہیں۔ جس طرح مدرسہ یا کالج میں طالب علم علمی ترقی حاصل کر سکتا ہے اسی طرح یہاں بھی انسان کافی ترقی کر سکتا ہے۔

ان سب پیشوں میں سے ہم صرف پکوان کی تعلیم پر مختصر طور پر کچھ عرض کریں گے۔ اس وجہ سے کہ ہر شخص کے لئے یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ حال حال تک یہہ کام ہندوستان میں گھر کی عورتیں انجام دیتی تھیں۔ اور یہ علم یہاں اپنے کمال کو پہنچ گیا تھا۔ آج کل مغربی تہذیب کے اثر سے ہوٹل اور رسٹورنٹ کا عام طور پر رواج ہو چلا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں لوگ زیادہ تر یہیں کے کھانے کھاتے ہیں۔ اور بعض لوگ بٹلر نوکر رکھ کر اپنے کھانے پینے کا انتظام کر لیتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہہ ہوا کہ ہماری کاہلی کی وجہ سے یہہ ایک نیا گروہ پیدا ہو گیا۔ چونکہ بٹلری کا پیشہ اختیار کرنے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے اس لئے وہ ملازمت کے وقت من مانے شرائط پیش کرتے ہیں۔ جن کا قبول کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ اور اکثر یہ مالک کا ناک میں دم کر دیتے ہیں۔

عموماً دیکھا جا رہا ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ ہمارے کھانے کے ذائقے بھی بدلتے جا رہے ہیں۔ یہہ عیب ہم میں اس لئے پیدا ہو گیا ہے کہ ہماری نگاہ امیر لوگوں کی غذاؤں پر رہتی ہے جنہیں شاید ہی حقیقی بھوک کا لطف حاصل ہوتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غذا کو مرغوب بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرغن اور پُر تکلف غذا سے سیدھی سادھی تازہ غذا بہت بہتر ہوتی ہے۔ اس طرح ہماری زندگی کے اس شعبے کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے اور اس کی تکمیل کے ذرائع محدود ہوتے جا رہے ہیں۔ یعنی بٹلروں کی تعداد ضرورت کے لحاظ سے کم ہے۔ جس کی وجہ سے ہماری تقلید ہمارے لئے مصیبت کا باعث بن جاتی ہے۔

یہی حال درزیوں کا ہے۔ ایک امیر آدمی اپنے لئے کسی خاص وضع قطع کا لباس تیار کروا کر جدت اختیار کرتا ہے۔ اور دوسرے لوگ اس کی تقلید کو فیشن کا ضروری جز سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح آئے دن نئے نئے طرز کے لباس وجود میں آتے رہتے ہیں۔

اور درزی ہیں کہ من مانے مزدوری حاصل کرنے کے ذریعے نکال لیتے ہیں۔ اِن کی تعداد بھی ہماری اس ضرورت کی تکمیل کے لئے عام طور پر ناکافی معلوم ہوتی ہے۔ اِس قسم کی جدتوں کی وجہ سے ہماری زندگی تصنع کا شکار ہوتی جارہی ہے۔ اگر ہم اپنے اسلاف کی سادہ زندگی سے ہماری پرتکلف زندگی کا مقابلہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم ایسی خطرناک چٹان کی طرف چلے جارہے ہیں جس کے خطرے سے بچنا ہمارے امکان سے باہر ہوجائے گا

ہمارے متذکرہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ کاریگروں کی تعداد ہماری ضروریات کے لحاظ سے بہت کم ہوتی جارہی ہے۔ اور ہماری پرتکلف زندگی کی وجہ سے ضروریات میں برابر اضافہ ہورہا ہے۔ لوگ عام طور پر فنی تعلیم کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ اور کاریگروں کی تعداد بجائے بڑھنے کے گھٹ رہی ہے۔

مثلاً بعض پیشہ ور لوگ بھی عام لوگوں کے رجحان کو دیکھ کر اپنی اولاد کو عام لوگوں کی طرح مروجہ تعلیم دلاتے ہیں۔ وہ تھوڑی بہت تعلیم پانے کے بعد اپنے آبائی پیشہ کو حقیر سمجھ کر ملازمت کے دائرے میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس طرح تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ اور کاریگروں کی تعداد گھٹ رہی ہے۔

حال ہی کا واقعہ ہے کہ ایک ادارہ میں دس بارہ تنخواہ یاب امیدواروں کی ضرورت تھی۔ اعلان کرنے پر کوئی سو درخواستیں وصول ہوئیں۔ جن میں زیادہ تر گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ کی تھیں۔ برخلاف اس کے اگر آپ کو کسی کاریگر کی ضرورت ہو تو بجائے اِس کے کہ وہ آپ کے پاس آئے آپ کو اس کے پاس تلاش کرکے جانا ہوگا۔ مختصر یہ کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت تعداد کا اثر زندگی کے دوسرے شعبوں پر بُرا پڑ رہا ہے۔

(۳) تجارتی تعلیم:۔ اِس تعلیم میں تجارتی لین دین کا حساب اور اُس کے عام معلومات وغیرہ شامل ہیں۔ زراعتی تعلیم بھی ہمارے مُلک کے لئے ضروری ہے۔ اِس وجہ سے کہ ۷۰ فی صدی آبادی زراعت پیشہ لوگوں کی ہے۔ لیکن یہاں ہم ان سب پر تفصیلی بحث کرنے سے قاصر ہیں۔

اِنسان کو جسمانی قوت قائم رکھنے کے لئے غذا، تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا، اور رہنے سہنے کے لئے مکان کی ضرورت ناگزیر ہے۔ ان میں سے ہر ایک چیز بغیر محنت کے

حاصل نہیں ہوسکتی۔ ان ضروریات کی تکمیل کے لئے یا تو انسان کو خود محنت کرنی چاہیئے یا دوسروں سے محنت لے کر ان کا معاوضہ نقدی کی شکل میں ادا کرے۔ یہاں ہمارے ملک کی مالی حالت کی نسبت بھی کچھ اشارہ کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

ایک زمانہ ہندوستان میں ایسا بھی تھا کہ صرف سونے اور چاندی کا سکہ ہی عام طور پر پسند کیا جاتا تھا۔ اِس طرح سونے کی حفاظت کا خیال ہر ایک کے دل میں خود بخود پیدا ہوتا تھا۔

آج کل سونے، چاندی اور تانبے کے سکوں کا رواج کسی خاص وجہ سے برابر زوال پذیر ہے۔ اور اس کا حال دن بدن پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔ ملک کی درآمد برآمد سے کئی حصے بڑھی ہوتی ہے۔ ملک کی زیادہ پیداوار خواہ صنعتی ہو یا زراعتی دوسرے ممالک کو بھیج کر دولت حاصل کی جائے تو ملک کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور عام مالی حالت درست رہ سکتی ہے۔

باوجود عام مالی انحطاط کے ہمارے اخراجات روزافزوں زیادہ ہوتے جارہے ہیں مثال کے طور پر تعلیمی اخراجات کو لیجئے اب سے ٢٠ سال پہلے کسی طالب علم پر ۳۵ روپیہ سالانہ صرف ہوتے تھے تو اب [illegible] روپیہ سالانہ اخراجات ہوتے ہیں۔ شائد آپ خیال کریں گے کہ تعلیمی استعداد پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ نہیں معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ گذشتہ زمانے کے تعلیم یافتہ لوگوں اور موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ لوگوں میں عام طور پر فرق ضرور محسوس کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اتنے اخراجات برداشت کرنے کے بعد بھی اس زمانے کی طالب علم کی آئندہ زندگی میں مالی حالت درست رہنے کی توقع نہیں۔

اس زمانے میں ایک طالب علم کو میٹرک کی تعلیم ختم کرنے کے لئے کم ازکم ٥٠٠ روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ سال بہ سال بلارکاوٹ تعلیمی ترقی حاصل کرتا جائے۔ اس کے بعد اگر وہ گریجویٹ ہونا چاہتا ہے تو مزید [illegible] روپیہ کا صرفہ برداشت کرنا پڑے گا۔ اِس قدر اخراجات برداشت کرنے اور محنت اُٹھانے کے بعد بھی وہ [illegible] تا [illegible] کے گریڈ کی توقع نہیں کرسکتا۔

برخلاف اِس کے اگر کوئی طالب علم کسی ایسے مدرسہ میں تعلیم پائے جہاں

صنعت وحرفت کی تعلیم دی جاتی ہو یا کوئی لڑکا کسی فرم یا کارخانے میں کام سیکھنے کے لئے بامعاوضہ یا بلا معاوضہ اُمیدوار ہو جائے تو یقین ہے کہ تھوڑے عرصہ کے بعد وہ اِس قابل ہو جائے گا کہ کم ازکم (عمـ) ایک روپیہ روز حاصل کر سکے۔ اور وہ ابھی آزادی کے ساتھ۔

اِن سب باتوں سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمارے لڑکوں کو تعلیم ایسی دی جائے جس کے بعد وہ اپنی روزی آسانی کے ساتھ حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ ہمارے مدارس میں مروّجہ تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعتی تعلیم کا بھی اِنتظام کیا جائے۔ طلبہ کو نجاری، پارچہ بافی، زراعت وغیرہ کی تعلیم دی جائے اور طالبات انتظام خانہ داری، نرسنگ سینا پرونا اور مختلف گھریلو صنعتوں کی تعلیم پائیں۔

صرف سر رشتہ تعلیمات ان سب باتوں پر بذات خود کوشش نہیں کر سکتا۔ اس کام کے لئے پبلک کی مدد کی بھی ضرورت ہے اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ اس تعلیم کے لئے ایسے اساتذہ مقررہ ہوں جو صنعت وحرفت میں کافی مہارت رکھنے کے علاوہ دوسروں کو سکھانے کی بھی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس قسم کے اداروں کا انتظام ایسے عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہو جو صنعت وحرفت سے دلچسپی رکھنے کے علاوہ ملک کو فائدہ پہنچانے کا سچا ذوق بھی رکھتے ہوں اور اس کام کے لئے ایثار سے کام لینے کو باعث فخر سمجھتے ہوں نیز قوم کی خدمت کے خیال سے ان عہدوں کو قبول کرنے کے خواہش مند ہوں۔ غرض موزوں عہدہ داروں کا انتخاب ضروری ہوگا۔

ہم نے اس قسم کی تعلیم کا ایک مختصر سا خاکہ کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ لوگ اس پر مختلف طریقوں سے غور کریں۔ اور کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ جائیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہمارے مدارس میں صنعتی تعلیم موزون طریقہ پر لازمی طور سے جاری کر دی جائے اور ارباب مقتدر سے استدعا ہے کہ وہ اس طرف اپنی توجہ مبذول کریں۔

کارگزاری

انجمن اساتذہ بلدہ بابت شش ماہی اول ۱۳۴۳ف

از مرزا ضیاء الدین بیگ صاحب معتمد عمومی

امسال آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں جو بہ تواریخ ۲۷ تا ۳۰ ڈسمبر ۱۹۳۳ء بمقام کراچی منعقد ہوئے جناب مولوی سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے (کنٹب) پرنسپل ٹریننگ کالج بلدہ نے شرکت فرمائی اور جناب ممدوح نے ہماری استدعا پر انجمن کی نیابت بھی فرمائی۔

شش ماہی اول ۱۳۴۳ف میں مرکزی انتظامی کمیٹی کے دو جلسے منعقد ہوئے جن میں اہم و ضروری امور طے پائے۔ حسابات انجمن کی تنقیحی مبسوط رپورٹ کا خلاصہ جس کو مسٹر وینکٹ نرسیہم و مولوی شرف الدین صاحب نے محنت سے مرتب کیا ہے پڑھا گیا۔ رپورٹ میں جو مفید مشورے دیئے گئے ہیں اُن پر و دیگر امور پر غور کر کے قطعی رائے ظاہر کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر ہوئی جو حسب ذیل حضرات پر مشتمل ہے۔

(۱) جناب مولوی سید خیرات علی صاحب۔ (۲) جناب مولوی سعادت اللہ خاں صاحب

(۳) " " عبدالوہاب " (۴) معتمد عمومی۔

آیندہ سالانہ کانفرنس انجمن اساتذہ میں رپورٹ پیش ہونے کے لئے "امتحان" عنوان مقرر ہوا۔ رپورٹ کی تیاری کے لئے حسب ذیل اصحاب کا انتخاب عمل میں آیا ہے:۔

(۱) جناب مولوی نورالحسن صاحب ایم۔ اے (گلاسگو) معتمد۔

(۲) " " محمد عبدالستار صاحب سبحانی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ رکن۔

(۳) جناب مولوی سید مجتبیٰ حسین صاحب نقوی بی۔ اے۔ ڈپ۔ ایڈ (لیڈز) رکن
(۴) ریورنڈ جی۔ بی۔ گارٹون۔ بی۔ اے۔
(۵) مسٹر جی۔ اے۔ چندراورکر ایم۔ اے۔

ذیلی مرکزوں کے ماہواری جلسوں کے لئے مضامین ذیل منتخب کئے گئے۔

ماہ آذر ۱۳۴۳ف خانگی تعلیم
〃 دی جماعتوں میں ڈرامہ کے انداز پر اسباق۔
〃 بہمن مدرسہ میں سزا کی نوعیت۔
〃 اسفندار ہر جماعت کے لئے سال میں کتنے امتحان ہونے چاہئیں
〃 فروردی ذہنی مقابلوں کے جدید طریقے یا تعلیمی تفریح۔
〃 اردی بہشت امتحان کے پرچہ کی ترتیب و جانچ۔

انجمن کی جن شاخوں سے رپورٹیں وصول ہوئی ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

شاخ قلعہ گولکنڈہ علاوہ دیگر مضامین کے خانگی تعلیم پر کافی بحث ہوئی اور اس بات پر زور دیا گیا کہ مدرسین کو متعدد ڈیوشن کی بجائے اعتدال سے کام لے کر اصلی ضرورت کو پورا کرنا اور صحت کو مقدم رکھنا چاہیئے۔ اساتذہ کی کمزوری بھی طالب علم کو خانگی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے طلبہ کی آوارگی کی وجہ سے خانگی تعلیم کی جو ضرورت ہوتی ہے اس کے ذمہ دار والدین ہیں۔ خانگی تعلیم میں بجائے فائدہ کے کمزوری پیدا ہوتی ہے جس کا سبب مدرسہ و گھر کی تعلیم کا اختلاف ہے خانگی تعلیم کی ضرورت نہ ہوگی جب کہ نصاب مقررہ یا استعداد سے زیادہ ہوم ورک نہ دیا جائے۔ مدارس کے طلبہ کی حد تک خانگی تعلیم کی ضرورت نہیں بشرطیکہ مدرس، طالب علم و والدین مذکورہ بالا امور سے واقف ہوں۔

شاخ وسطانیہ سلطان بازار، کلاس میں ذریعہ ڈرامہ تعلیم پر پُرجوش تقاریر ہوئیں۔ مسٹر گیش پرشاد، مسٹر سبرو مونم، و مولوی صدرالدین صاحب، مسٹر شیشا چاری و مسٹر ایس، ایم نایک نے نمایاں حصہ لیا۔ مسٹر گیش پرشاد مددگار نے مولوی محمد ابراہیم صاحب صدر مدرس تحتانیہ عثمان شاہی کا تیار کردہ ڈرامہ "ایفائے عہد" خوش اسلوبی سے پیش کیا جو کامیاب رہا۔

مسٹر سبرومونم مددگار سلطانیہ سلطان بازار نے Duck & the Giant کے نام سے ڈرامہ تیار کیا ہے جس کو نوآموز طلبہ نے بہ زبان انگریزی دلچسپی اور خوبی سے ادا کیا۔ مسٹر ایس۔ ایم نایک مددگار کنٹر و دیالہ گولی پورہ نے کہا کہ انسان کی زندگی ایک ڈرامہ ہے۔ ڈرامہ کے ذریعہ تعلیم دینے سے کمزور طلبہ دلچسپی سے کام کرتے ہیں خصوصاً تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم کے لئے یہ طریقہ مناسب و مفید ہے۔ مولوی صدر الدین صاحب نے ڈرامہ کی مخالفت تو نہیں کی مگر اس سے اخراجات کی زیادتی کا ذکر کیا۔ مسٹر جی۔ اے چندراورکر صدر نشین جلسہ نے فرمایا کہ یہ طریقہ جدید مغربی اصول پر ہی نہیں ہے بلکہ بہت قدیم ہے چنانچہ ہمارے اسلاف اس پر اس وقت عمل پیرا تھے جب کہ کتابوں کا وجود نہ تھا چنانچہ وید وغیرہ میں تعلیم کا یہی طریقہ بتلایا گیا ہے اور شاہان سلف کے درباروں میں بھانڈ قدیم تاریخی حالات بیان کرتے وقت یہی طریقہ اختیار کرتے تھے جس کے حسب ذیل فوائد ہیں (۱) پورا سین پیش نظر ہوجاتا ہے۔ (۲) قوت مشاہدہ و سامعہ کی تربیت کے سبب سے تاثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ (۳) اس کی مدد سے طلبہ عام تقاریر میں حصہ لے سکتے ہیں۔

شاخ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ۔ سزا کی مختلف قسموں پر تقاریر ہوئیں۔ مولوی شیخ نہتاب صاحب مددگار و مسٹر ونیکٹیشور صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ تعلیم العلوم۔ و مولوی خواجہ حفیظ الدین صاحب و مولوی بہار الدین صاحب نے حصہ لیا۔ مولوی بہار الدین صاحب نے فرمایا کہ جسمانی سزا ماہران فن تعلیم کے نزدیک حیوانیت کا درجہ رکھتی ہے امپوزیشن کی سزا آسان تو ہے لیکن بچہ کی دلچسپی جاتی رہتی ہے ورزشی سزا کے متعلق ماہران نفسیات کا خیال ہے کہ بچے اس کی تعمیل حکماً کرتے ہیں۔ امریکی ممالک میں بلا سزا جو کام کیا جاسکتا ہے وہ وہاں کے ماحول کا نتیجہ ہے۔ ہمارا ماحول اس بات کا مقتضی ہے کہ سزا دی جائے جو بچہ کی اصلاح کی غرض سے ہو مولوی یوسف حسین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی صدر جلسہ نے بیان کیا کہ امپوزیشن کے غلط طریقہ استعمال کی وجہ سے بچہ کی دلچسپی مفقود ہوجاتی ہے صدر جلسہ نے جلسہ کی کامیابی پر اظہار خوشنودی فرمایا۔

شاخ وسطانیہ شاہ گنج۔ طلبائے مدرسہ نے ایک مختصر ڈرامے کا ایک دلچسپ سین

ادا کاری کے ساتھ حاضرین کے سامنے پیش کیا۔ مولوی کرم علی صاحب، مولوی احسان علی صاحب و مولوی حفیظ اللہ میر صاحب نے تقاریر میں حصہ لیا۔

اظہار مدعا کے ذرائع، اشارے، حرکات و سکنات، تحریر و تقریر کا ذکر کرتے ہوئے عملی طور پر کام یعنی ڈرامہ کا ذکر کیا گیا۔ اس کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی کرم علی صاحب مددگار نے فرمایا کہ ڈرامہ کرانے سے بچوں کا ناجائز رُعبِ مجلس دور ہوتا ہے جو ہم لوگوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ مولوی احسان علی صاحب نے ڈرامہ کے فوائد و نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے انتخاب کرنے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ مولوی حفیظ اللہ میر صاحب مددگار نے ڈرامہ کی ماہیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ بچوں کے لئے ڈرامے مختصر ہونے چاہئیں۔ اور تعلیمی ڈراموں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے۔ مولوی اللہ بخش صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی صدر جلسہ نے فرمایا کہ ہم کو صرف تعلیمی ڈرامہ کی ضرورت ہے۔ تاریخی ڈراموں سے گذشتہ زمانہ کے حالات ہمارے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ بعض ادبی شہ کار اداکاری کے بعد ہی صاف طور پر سمجھ میں آسکتے ہیں۔ ڈرامہ سے اظہار خیال کے صحیح طریقے عملی طور پر معلوم ہوتے ہیں۔ پس لڑکوں کو اخلاقی و تعلیمی ڈراموں کی جانب راغب کرنا چاہیئے۔

شاخ فوقانیہ چنچل گوڑہ۔ زیر صدارت جناب مولوی سید ابرار حسین صاحب ایم اے جلسے منعقد ہوئے جن کی کارروائیوں کا خلاصہ موصوف نے مختصر و نہایت موزوں طریقہ پر ترتیب دیکر بھجوایا ہے جن میں بیان کیا گیا کہ امتحان کے موقعوں پر جب بچے کمزوری کے سبب سے ناکام رہ کر اوپر کی جماعتوں میں ترقی نہیں کرتے تو خانگی استاد مدرسہ میں آکر ان کی ترقی کے لئے مجبور کرتے اور ان تھک کوشش کرتے ہیں اور بعض دفعہ جب کمزور بچوں کو شرکت مدرسہ سے روک دیا جاتا ہے تو والدین ٹیوشن کے انتظام پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں نامناسب ہیں۔

ڈرامہ کے مفید اثرات بتلاتے ہوئے بیان کیا گیا کہ ڈرامہ کے طریق پر تعلیم سے بچہ عملی کام سے واقف ہوتا ہے اور عمل سے علم کو تقویت پہونچتی ہے اور تعلیم ڈرامہ کی غرض یہ ہے کہ خصوصاً پرائمری جماعتوں کے بچے کام کرنا سیکھ جائیں۔ عملی حیثیت سے بعض اسباق سینما کے ذریعہ دئے جاتے ہیں اور موجودہ زمانہ میں ڈرامہ کی تعلیم کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا۔

ڈرامہ کی تعلیم مدارج کے لحاظ سے تینوں طبقوں (تحتانیہ ۔ وسطانیہ ۔ فوقانیہ) میں ہوسکتی ہے
بیان کیا گیا کہ تعلیمی اور اخلاقی قصور سے سزا کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تعلیمی قصور
میں ہوم ورک نہ لانا ۔ غیر حاضر ہوجانا ، واسباق یاد نہ کرنا ۔ اور اخلاقی قصور میں کوئی
ایسا فعل جو خلاف تہذیب خلاف انسانیت ہو سرزد ہونا بیان کیا گیا ۔ نیز کہا گیا کہ بصورت
اول یعنی تعلیمی قصور میں صرف تنبیہ کرنے اور سمجھا کر کام لینے کی ضرورت ہے اور طلبہ
کی توجہ قایم رکھنا بڑی چیز ہے ۔ بصورت دوم یعنی اخلاقی قصور میں حقیقتاً سزا کی ضرورت ہے
تاکہ دوسرے بچوں پر برا اثر نہ پڑے ۔

سزا کا مقصد اصلاح ہے اس لئے سزا دیتے وقت انتقامی جذبات سامنے نہ آنے
پائیں ۔ بچون کو ایسی سزا نہ دی جائے جو ان کے حق میں ضرر رسان ہو بلکہ علی الرغم و نفع
رسان ہو ۔ استاد بچون کے حق میں مشفق ماں باپ کی طرح ہے بدین وجہ ہر وقت ان کی
بہبودی اور بھلائی اس کے پیش نظر رہے ۔

شاخ چنچل گوڑہ کے جلسوں میں علاوہ مولوی ابرار حسین صاحب معتمد کے مولوی
عبدالغفور صاحب بی ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی ۔ مولوی شیخ محبوب صاحب ۔ مولوی محمد ابراہیم صاحب
مولوی سید علی محمد صاحب اجلال ۔ مولوی ظل حسین صاحب بی ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی ۔ مولوی
نعمت اللہ خان صاحب صوفی اور مولوی ظفر الرحمٰن صاحب مددگاران مدرسہ
فوقانیہ چنچل گوڑہ اور مولوی محمد عبدالرحمٰن صاحب مدرسہ تحتانیہ دائرہ برہنہ شاہ صاحب
مولوی شیخ امان اللہ صاحب مددگار مدرسہ تحتانیہ الاوہ یتیمان اور مولوی فصیح الدین
صاحب مدرسہ تحتانیہ رین بازار نے تقاریر میں حصہ لیا ۔ انجمن کی دوسری شاخون کے
معتمد صاحبان سے استدعا کی جاتی ہے کہ ہر سہ ماہی کے اختتام پر براہ کرم جلسوں
کی روئیداد معتمد عمومی کے پاس بروقت روانہ فرمائیں تاکہ وہ رسالہ حیدرآباد ٹیچر
میں طبع کی جاسکیں ۔

ہمارے پڑھاتے وقت تقسیم کے عمل کے چند سوالات بچے حل کر چکے ہیں اگرچہ ان کو تقسیم کی اصطلاح معلوم نہ ہو۔ مثلاً (۱) ۲۴ بیر ۳ لڑکوں میں برابر برابر تقسیم کرو۔ (۲) ہر لڑکے کو ۹ گولیوں کے حساب سے ۲۷ گولیاں کتنے لڑکوں میں تقسیم ہوسکیں گی۔ وغیرہ اس قسم کے سوالات بچے مقرون اشیاء کی مدد سے اور پہاڑوں کے ذریعہ حل کر چکے ہیں۔ اس قسم کے سوالات حل کرنے سے دی ہوئی چیزوں کے حصے یا ڈھیر کس قدر بنتے ہیں اس کا علم ان کو ہوسکتا ہے۔

تقسیم دو طرح کی ہوتی ہے۔

(۱) چیزوں کی کل تعداد معلوم ہے۔ اُن چیزوں کے جتنے مساوی حصے یا ڈھیر بنانے ہیں اُن حصوں کی یا ڈھیروں کی تعداد معلوم ہے اب ہر ایک حصہ یا ڈھیر کی مقدار معلوم کرنی ہے

مثال۔ ۱۲ سیب ۳ لڑکوں میں برابر بانٹ دو (تقسیم کرو) یہاں سیب کی کل تعداد ۱۲ ہے۔ اُن کے ۳ حصے یا ڈھیر بنانے ہیں اب یہہ دریافت کرنا ہے کہ ہر ایک حصہ یا ڈھیر میں سیب کتنے ہونگے۔

(۲) چیزوں کی تعداد معلوم ہے۔ ہر ایک حصہ یا ڈھیر کی مقدار معلوم ہے۔ اب یہہ دریافت کرنا ہے کہ ان چیزوں کے ایسے کل کتنے حصے یا ڈھیر ہوسکیں گے یعنے حصوں کی تعداد معلوم کرنی ہے۔

مثال۔ ہر ایک لڑکے کو ۳ سیب کے حساب سے ۱۲ سیب کتنے بچوں میں تقسیم ہوسکتے ہیں۔ یہاں سیب کی کل تعداد ۱۲ ہے۔ ہر ایک لڑکے کو ۳ سیب دینے ہیں یعنے ہر ایک حصہ یا ڈھیر ۳ سیب کا بنانا ہے۔ اب ایسے حصوں کی یا ڈھیروں کی کل تعداد دریافت کرنی ہے

ابتدا میں پہلی قسم کی تقسیم کے سوالات بتلائے جائیں۔

مثال ۱۲ سیب ۳ لڑکوں میں برابر برابر تقسیم کرو۔ اور ہر ایک کا حصہ دریافت کرو۔

یہہ سوال بچوں سے بذریعہ اشیار محسوسہ حل کروایا جائے پہلی مرتبہ ہر ایک لڑکے کو ایک ایک سیب دینے سے ۳ سیب تقسیم ہونگے باقی ۱۲ - ۳ = ۹ سیب رہیں گے۔ دوسری مرتبہ ہر ایک لڑکے کو اور ایک ایک سیب دینے سے اور ۳ سیب تقسیم ہون گے باقی ۹ - ۳ = ۶ سیب رہیں گے۔ تیسری مرتبہ ہر ایک لڑکے کو اور ایک ایک سیب دینے سے اور ۳ سیب تقسیم ہون گے اور باقی ۶ - ۳ = ۳ سیب رہیں گے۔ چوتھی مرتبہ ہر ایک لڑکے کو اور ایک ایک سیب دینے سے ۳ سیب تقسیم ہون گے اور باقی ۳ - ۳ = کچھ نہیں رہے گا۔ یعنے تمام سیب تقسیم ہون گے۔ بعد میں ہر ایک بچے کے پاس کے سیب کی تعداد گننے سے یہہ معلوم ہوگا کہ ہر ایک بچے کو ۹ سیب ملے۔ یہ تو تجربہ سے بچے معلوم کر سکیں گے۔ اس کا تحریری عمل ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ لڑکوں کو ا ب ج سے نامزد کریں گے۔

	(۱)	(۲)	(۳)	(۴)
الف	o	o	o	o
ب	o	o	o	o
ج	o	o	o	o

۱۲ سیب
۳ " پہلی مرتبہ تقسیم کئے
باقی ۹ " رہے
۳ " دوسری مرتبہ تقسیم کئے
باقی ۶ " رہے
۳ " تیسری مرتبہ تقسیم کئے
باقی ۳ " رہے
۳ " چوتھے مرتبہ تقسیم کئے
باقی ۰

اس عمل و شکل سے یہہ معلوم ہوگا کہ سیب تقسیم کرتے وقت متواتر تفریق کا عمل کیا گیا ہے اور اس سے ہر ایک لڑکے کے پاس سیب کی تعداد (۴) معلوم ہوئی یعنے متواتر تفریق کے عمل کے ذریعہ ہر ایک حصہ کی مقدار معلوم ہو سکی۔

پہاڑوں کے ذریعہ بھی یہ سوال بچوں سے حل کرایا جائے۔ اور یہ جواب اخذ کرایا جائے کہ تین لڑکوں میں اگر ۱۲ سیب تقسیم کرنے ہوں تو ہر ایک لڑکے کو ۴ سیب ملیں گے۔ ۴ کا پہاڑہ ۱۲ کے آنے تک پڑھا جائے یعنے ۳ چوکے ۱۲۔

اِس قسم کے سوالات میں حصوں کی تعداد (یہاں ۴ لڑکے) دی جاتی ہے اور ہر ایک حصہ کی مقدار (یہاں ۱۲ سیب) دریافت کی جاتی ہے یعنی ہر ایک حصہ میں کس قدر یا کتنے سیب پڑینگے معلوم کرنا ہوتا ہے۔ یہہ تقسیم گویا کسری تقسیم ہی ہے۔ چونکہ جب ہم کہتے ہیں کہ ۴ لڑکوں میں ۱۲ سیب تقسیم کرو تو اس سے یہی مراد ہے کہ ہر ایک لڑکے کو ۱۲ کا ایک ثلث دو؛ اس قسم کے سوالات بچوں سے حل کروانے کے بعد دوسری قسم کی تقسیم کے سوالات بتائے جائیں۔

مثال۔ میرے پاس ۱۲ سیب ہیں ہر ایک لڑکے کو تین تین سیب کے حساب سے کتنے لڑکوں میں وہ کل سیب تقسیم ہو سکتے ہیں۔

یہ بھی سوال بذریعہ اشیاء محسوسہ بچوں سے حل کروایا جائے۔ اس سوال میں ہر ایک حصہ کی مقدار معلوم ہے لہذا ایک ایک حصہ تین تین سیب کا بنانا ہوگا۔

پہلا حصہ ٥ ٥ ٥ اس حصہ میں ۳ سیب رکھنے کے بعد ۱۲ میں سے (۱۲ - ۳) = ۹ رہیں گے۔

دوسرا حصہ ٥ ٥ ٥ " " " ۳ " " " ۹ " (۹ - ۳) = ۶ "

تیسرا حصہ ٥ ٥ ٥ " " " ۳ " " " ۶ " (۶ - ۳) = ۳ "

چوتھا حصہ ٥ ٥ ٥ " " " ۳ " " " ۳ " (۳ - ۳) = ۰ "

لہذا ہر ایک کو تین تین کے حساب سے ۱۲ سیب ۴ لڑکوں میں تقسیم ہو سکیں گے یعنے ہر ایک حصہ میں تین تین کے حساب سے ۱۲ سیب کے ۴ حصے بن سکتے ہیں لہذا جواب مجرد عدد آئے گا۔

مندرجہ بالا سوالات کے عمل میں یہہ بات بچوں کے ذہن نشین کرا دی جائے کہ جس طرح ایک ہی عدد متعدد بار جمع کرنے کا مختصر طریقہ، ضرب کہلاتا ہے اسی طرح بڑے عدد میں سے ایک ہی عدد متعدد بار (متواتر) تفریق کرنے کا مختصر طریقہ تقسیم کہلاتا ہے۔ اس قسم کے سوالات بچوں سے حل کرانے کے بعد ضرب اور تقسیم کا مقابلہ بذریعہ مثال بچوں سے کروایا جائے اور یہ بات اُن سے اخذ کرائی جائے کہ ضرب میں ہر ایک حصہ کی مقدار اور حصوں کی کل تعداد دی جاتی ہے اور کل چیزوں کی تعداد دریافت کرنی ہوتی ہے۔ مثلاً ہر ایک بچے کو تین تین سیب کے حساب سے ۴ بچوں میں کتنے سیب تقسیم ہوں گے؟ یہاں ۳ یہہ عدد ۴ بار لینا ہوتا ہے۔ اور اس کو ۳ × ۴ سے ظاہر کرتے ہیں اور ۳ ضرب ۴ کہتے ہیں۔

تقسیم میں (۱) چیزوں کی کل تعداد معلوم ہوتی ہے اور کل حصوں کی تعداد دی جاتی ہے

ہر ایک حصہ کی مقدار دریافت کرنی ہوتی ہے۔ مثلاً ۱۲ سیب ہیں وہ ۳ لڑکوں میں تقسیم کرنے ہیں ہر ایک لڑکے کو کتنے سیب ملیں گے۔

یہاں سیب کی کل تعداد ۱۲ ہے اور حصوں کی تعداد (۳) بھی معلوم ہے ہر ایک حصہ کی مقدار دریافت کرنی ہے۔ اس سوال کو ۱۲ ÷ ۳ سے ظاہر کرتے ہیں اور ۱۲ تقسیم ۳ کہتے ہیں۔ اس میں جواب (۴ سیب) مقرون آئے گا۔ یا (۲) چیزوں کی کل تعداد معلوم ہوتی ہے اور ہر ایک حصہ کی مقدار بھی لہٰذا کل حصوں کی تعداد دریافت کرنی ہوتی ہے۔ مثلاً ۱۲ سیب ہیں ہر ایک لڑکے کو تین تین سیب کے حساب سے کل سیب کتنے لڑکوں میں تقسیم ہوں گے؟ یہاں سیب کی تعداد ۱۲ ہے ہر ایک حصہ کی مقدار ۳ ہے حصوں کی تعداد (۴) دریافت کرنی ہے۔ اِس سوال کو بھی ۱۲ ÷ ۳ سے ظاہر کرتے ہیں اور ۱۲ تقسیم ۳ ہی کہتے ہیں۔ جواب مجرد عدد (۴) آئے گا۔

دونوں سوالوں کے حل میں طریقہ عمل ایک ہی ہے۔ سوال لکھنے کا طریقہ بتایا جائے کہ کل عدد درمیان میں لکھتے ہیں۔ اور جو عدد متواتر تفریق کرنا ہے وہ بائیں طرف لکھتے ہیں۔ بڑے عدد کو مقسوم کہتے ہیں اور تفریق طلب عدد کو مقسوم علیہ کہتے ہیں۔ مقسوم اور مقسوم علیہ کے بیچ میں ایک قوس اس طرح × × × (× بناتے ہیں اور جو جواب آئے گا وہ مقسوم پر آڑا خط کھینچ کر ظاہر کرتے ہیں بعض وقت مقسوم کے دائیں طرف قوس) اس طرح بنا کر اس میں بھی جواب لکھتے ہیں۔ جواب کو خارج قسمت کہتے ہیں۔

مقسوم — مقسوم علیہ

خارج قسمت ۴) ۱۲ (۳

۱۲

خارج قسمت

۴

مقسوم ۱۲ (۳ مقسوم علیہ

۱۲

سوال لکھنے کا طریقہ بتانے کے بعد اس کے حل کا بھی طریقہ بتایا جائے۔ جو عملی طور پر بچے سمجھ چکے ہیں۔ تفریق طلب عدد کا یعنے مقسوم علیہ کا پہاڑہ بڑے عدد کو پہونچنے تک یعنے مقسوم تک گنیں اور جواب مقسوم (بڑے عدد) پر خط کھینچ کر لکھدیں۔ مثلاً سوال مذکور میں ۳ چوکے ۱۲ کہہ کر ۴ کا ہندسہ اکائی کے درجہ پر لکھ کر یہ عدد ۱۲ میں سے تفریق کریں۔

روزمرہ کاروبار میں چیزوں کو لوگوں میں تقسیم کرنے کے سوالات زیادہ پائے جاتے ہیں لہٰذا بچوں کو ابتدا میں چیزوں کی تقسیم پر ہی سوالات دئے جائیں تاکہ اُن کو حل کرنے میں

دلچسپی پیدا ہو۔ مثلاً احمد کے پاس ۶ آم ہیں وہ چاہتا ہے کہ وہ آم خود بھائی اور بہن تینوں میں برابر بانٹ دے۔ تجربہ سے اس کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کو خود کو ۲ آم بھائی کو ۲ آم اور بہن کو ۲ آم ملیں گے۔ ۲ آم یہ ۶ آم کا ایک ثلث ہے یہ خیال اس کے دل میں نہیں آئے گا۔ جب کسر کی تفہیم دی جائے گی اس وقت اس نقطہ نظر سے وہ دیکھ سکے گا کہ ۲ کا عدد ۶ کا ایک ثلث ہے اور سابقہ تجربہ سے اس کی تصدیق بھی ہو سکے گی۔

۲۰ یا ۳۰ تک کے اعداد تک تقسیم کے سوالات کی کافی مشق ہونے پر حصہ یا ڈھیر کے متعلق سوالات دئے جائیں۔ مثلاً ۱۵ میں تین تین کے کتنے مجموعے ہوں گے۔ اگر احتیاط سے کام لیا جائے تو پریشانی کی نوبت مطلق نہیں آئے گی۔ بچوں سے بذریعہ اشیار محسوسہ اور تحریری عمل ایسے بھی سوالات حل کرائے جائیں جن میں حصہ یا ڈھیروں کی تعداد دریافت کرنے پر کچھ باقی بچے۔ باقی والے سوالات کو ٹالنا یا آئندہ زمانہ کے لئے محفوظ رکھنا محض غلطی ہے۔ ۱۳ ÷ ۳ کو حل کرنے میں بچے اگر اس طرح عمل کریں کہ ۱۳ ÷ ۳ = ۴، باقی ۱، تو کافی ہے۔ ابتدا میں تیلیاں، بیج کوڑیوں وغیرہ کے ذریعہ تقسیم کے سوالات حل کرائے جائیں۔

۴
۳) ۱۳
۱۲
باقی ۱

تقسیم کی پہلی مشق۔ تیلیوں کی مدد سے مندرجہ بالا طریقہ پر بطور تجربہ و عمل چند سوالات حل کرانے کے بعد بچوں کو مندرجہ ذیل قسم کے کارڈ دئے جائیں اور بذریعہ اشیار محسوسہ سوالات حل کرائے جائیں۔

مثال- ۹ جام احمد، بشیر و محمود میں برابر تقسیم کر کے ہر ایک کا حصہ دریافت کرو۔
بچوں کو ۹ گولیاں یا تیلیاں دی جائیں اور سوال مذکور حل کرنے کے لئے کہا جائے طالب علم ۹ چیزیں لے کر ان کو تین بچوں میں ہر ایک کے محاذی ایک ایک رکھ دے احمد کو ایک، بشیر کو ایک اور محمود کو ایک۔ اس طرح تمام تیلیاں یا گولیاں ختم ہونے تک کرتا رہے

احمد	بشیر	محمود
o o o	o o o	o o o
ا ا ا	ا ا ا	ا ا ا

مشقی کارڈ

احمد	بشیر	محمود
۹ جام ہر ایک کو تین تین		

جب یہہ طریقہ بچوں کی سمجھ میں اچھی طرح آجائے
تو یہی عمل عمودی طور پر تیلیاں ناموں کے
محاذی رکھ کر کرایا جائے

احمد	ا	ا	۳
بشیر	ا	ا	۳
محمود	ا	ا	۳

۱۲ قلم	ہر ایک کو	چار	چار
۸ پیسے	"	"	؟
۲۱ کاغذ "	"		؟
۲۷ گولیاں "	"		؟
۲۴ بیر "	"		؟

مندرجہ ذیل عمل زیادہ بہتر ہوگا اس عمل کی اہمیت مختصر تقسیم کرتے وقت محسوس ہوگی۔

۳ | ۱۲ ، ۳ | ۹ ، ۳ | ۱۵ ، ۳ | ۲۱
۴ ، ۳ ، ۵ ، ۷

تقسیم کا ہر ایک سوال (خواہ حصوں کی تعداد ظاہر کرنے کا ہو یا ہر ایک حصہ کی مقدار ظاہر کرنے کا) عمودی طریقہ سے ہی حل کرایا جائے اس سے بہت کچھ پریشانی رفع ہو سکتی ہے اور کام بھی صاف اور واضح طور پر بتایا جا سکتا ہے۔

مثال ۱۵ پیسے ۵ لڑکوں میں تقسیم کرو

پہلا لڑکا	٥	٥	٥	۳ پیسے
دوسرا لڑکا	٥	٥	٥	۳ پیسے
تیسرا لڑکا	٥	٥	٥	۳ پیسے
چوتھا لڑکا	٥	٥	٥	۳ پیسے
پانچواں لڑکا	٥	٥	٥	۳ پیسے

جس میں باقی بچے ایسے سوالات بھی دئے جائیں اور ایسی صورت میں پہاڑوں کا تعلق بھی بتایا جائے۔ لیکن یہہ تعلق حتی الامکان بچے ذاتی کوشش سے معلوم کرلیں۔
بچے اگر اپنی کوشش سے جواب نکال لیں تو اُن کو بہت خوشی ہوتی ہے۔ اگر مدرس

خود بتا دے تو اُن کو اس قدر خوشی نہ ہوگی اور ایسی صورت میں ان کی دماغی تربیت بھی نہیں ہو سکتی۔

مشق۔ مندرجہ ذیل اشیاء ۴ بچوں میں تقسیم کرو۔ اور ہر ایک کا حصہ دریافت کرو۔

		ہر ایک کو	باقی
۸ قلم	۸ ÷ ۴	۲ قلم	
۱۲ گولیاں	۱۲ ÷ ۴	؟	
۹ کاغذ	۹ ÷ ۴	۲ کاغذ	۱ کاغذ
۱۴ پیسے	۱۴ ÷ ۴	؟	؟
۱۷ تیلیاں	۱۷ ÷ ۴	؟	؟

حصے یا ڈھیر بنانا تیلیوں کی مدد سے بچوں کو ۲۴ تیلیاں دی جائیں اور اُن کے حصے بنانے کے لئے اُن سے کہا جائے اِس طرح کہ ہر ایک حصے میں تیلیوں کی تعداد مساوی ہو۔ حسب ذیل طور پر اُنہیں کی کوشش سے عمل کرایا جائے۔

۲۴ تیلیوں کے حصے یا ڈھیر بنانا				
		ہر ایک ڈھیر میں		ڈھیروں کی تعداد
۲۴	÷	۲	=	۱۲
۲۴	÷	۳	=	۸
۲۴	÷	۴	=	؟
۲۴	÷	۶	=	؟
۲۴	÷	۸	=	؟
۲۴	÷	۱۲	=	؟

۱۸ ÷ ۳ ہر ایک ڈھیر میں تین تین کے حساب سے ۱۸ گولیوں کے حصے بنانا					
o	o	o	o	o	o
o	o	o	o	o	o
o	o	o	o	o	o
۱	۲	۳	۴	۵	۶

یہاں گولیوں کو عمودی قطاروں میں رکھا گیا ہے تاکہ عمودی قطاروں کی گنتی سے جواب نکل آئے۔ تحریری عمل سلیٹ پر کرایا جائے

۳ | ۱۸ (حاصل ۶) یا ۳) ۱۸ (۶
۱۸
——

ضرب	تقسیم
۹ × ۲ = ؟	۱۸ ÷ ۲ = ؟
۶ × ۳ = ؟	۱۸ ÷ ۳ = ؟
۸ × ۴ = ؟	۳۲ ÷ ۴ = ؟

بچوں کو ضربی پہاڑے اور سادہ تقسیم کا تصور دلاتے ہی مندرجہ ذیل قسم کے مشقی کارڈ دے کر انہیں سے جوابات اخذ کرائے جائیں۔ یہ سوالات زبانی حل کئے جا سکتے ہیں۔ کسی عدد کے اجزاء ضربی دریافت کرنے کے لئے ضربی پہاڑوں کا تختہ بھی استعمال میں لایا جائے۔ ۶ × ۴ = ۲۴ ۲۴ ÷ ۴ = ۶ وغیرہ سوالات کا مقابلہ کرانے میں ضربی پہاڑوں کو تقسیمی پہاڑوں میں تبدیل کرنا بچوں کو دلچسپ معلوم ہوگا۔

تقسیم کی تفہیم ٹھیک طور پر دلانے کے بعد ابتدا میں ایسے سوالات دئے جائیں کہ مقسوم کے ہر درجہ کا ہندسہ مقسوم علیہ کے ہر درجہ کے ہندسہ پر پورا پورا تقسیم ہو سکے۔ مثلاً ۹۶ ÷ ۳ یہ سوال بچے پہاڑے کے ذریعہ آسانی سے حل کر سکیں گے یہاں پر کسی درجہ کے ہندسے سے عمل شروع کر سکتے ہیں (دہائی کے درجہ سے یا اکائی کے درجہ سے) ہر صورت میں جواب مساوی رہے گا۔ ۳ | ۹۶ ‎/ ۳۲ اس سوال کے حل میں ان کو مطلق دقت محسوس نہ ہوگی کیونکہ ہر درجہ کا عدد ۳ پر پورا پورا تقسیم ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے سوالات کی کافی مشق کرائی جائے۔

اس کے بعد ایسے سوالات دئے جائیں کہ مقسوم میں چند ہندسے ایسے ہوں جو مقسوم علیہ کے ہر درجہ کے ہندسہ پر پورے پورے تقسیم نہ ہو سکیں مگر کل عدد مقسوم علیہ پر پورا پورا تقسیم ہو سکے۔ مثلاً ۶۴ ÷ ۴۔

سوال مذکور کے حل میں بچوں کو کسی قدر مشکل محسوس ہوگی۔ اب تک جمع تفریق و ضرب کے قاعدوں میں اکائی کے درجہ سے عمل کرتے کرتے اعلیٰ درجہ تک پہونچتے تھے۔ لیکن مندرجہ بالا تقسیم کے سوال میں اگر ۴ اکائیوں کو پہلے ۴ پر تقسیم کیا جائے اور بعد میں ۶ دہائیوں کو ۴ پر تقسیم کیا جائے تو عمل پورا نہیں ہو سکتا۔ ۲ دہائیاں باقی بچتی ہیں۔ ان کو پھر اکائیوں میں تبدیل کرنا ہوگا۔ اور دوبارہ اکائیوں کی تقسیم کرنی ہوگی۔ لہٰذا اس مشکل کو بذریعہ اشیاء محسوسہ رفع کر سکتے ہیں۔ بچوں کو تیلیوں کے ۶ بنڈل دہائیوں کے

اور ۴ تیلیاں دی جائیں اور اُن سے کہا جائے کہ وہ تیلیاں ۴ لڑکوں میں تقسیم کریں۔

۲۴ اکائیاں ۴ دہائیاں
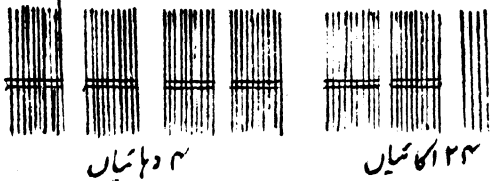
تجربہ سے ان کو یہ معلوم ہوگا کہ دہائی کے ۶ بنڈلوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک بنڈل دینے کے بعد یعنے ایک ایک دہائی تقسیم کرنے کے بعد ۴ لڑکوں میں ۴ بنڈل دے جا کر باقی دو بنڈل دہائی کے رہتے ہیں اور یہ دو بنڈل دہائی کی صورت میں ۴ لڑکوں میں تقسیم نہیں ہو سکتے لہذا بچوں سے دریافت کیا جائے کہ اب کیا تدبیر سوچی جائے کہ تقسیم کا عمل ٹھیک طور پر ہو سکے اور اُن سے بذریعہ سوال وجواب یہ بات اخذ کرائی جائے کہ ۲ دہائیوں کو اکائیوں میں تبدیل کیا جائے اور ان میں ۴ اکائیاں ملائی جائیں تو کل ۲۴ اکائیاں ہوں گی۔ اب ۲۴ تیلیاں ۴ لڑکوں میں تقسیم کرنے سے ہر ایک لڑکے کو ۶ تیلیاں ملیں گی اور باقی کچھ نہیں رہیں گی اور جواب یہ معلوم ہوگا کہ ہر ایک لڑکے کو ایک بنڈل اور ۶ اکائیاں یعنے ۱۶ تیلیاں ملیں گی۔

پہلا لڑکا	دوسرا لڑکا	تیسرا لڑکا	چوتھا لڑکا
۱۶	۱۶	۱۶	۱۶

۱۶
۴ | ۶۴
۴
۲۴
۲۴
۰۰

تیلیوں کے ذریعہ عمل کرانے کے بعد بچوں سے وہی عمل تحریری طور پر ہندسوں میں جیسا کہ اوپر بائیں طرف بتایا گیا ہے کروایا جائے یہاں پر اُن کو یہ بات بتائی جائے کہ ۲ دہائیوں کی ۲۰ اکائیاں بنانا اور ان میں ۴ اکائیاں ملانا اس قدر طول طویل عمل کرنے کے بجائے دہائی کے ہندسہ کے دائیں طرف اکائی کا ہندسہ رکھنے سے وہی نتیجہ آتا ہے۔ ۲ دہائیاں = ۲۰ اکائیاں۔ ۲۰ اکائیاں + ۴ اکائیاں = ۲۴ اکائیاں = ۲۴۔

اس طرز کے سوالات کی کافی مشق کرانے پر ایسے سوالات دیے جائیں کہ

مقسوم ۳ ہندسوں کا عدد ہو اور مقسوم علیہ ایک ہندسہ والا عدد ہو۔ مقسوم میں چند ہندسے ایسے ہوں جو مقسوم علیہ پر پورے پورے تقسیم نہ ہو سکیں۔

مثال ۳۷۲ ÷ ۳۔

اس سوال کا عمل بذریعہ شکل واضح کیا جائے۔ بچوں کی ذاتی کوشش سے اگر کام لیا جائے تو یہ سوال ان کی سمجھ میں جلد آئے گا۔ دہائی کی ڈبیاں اور سیکڑے کی پوٹلیاں بنائی جائیں تو یہ عمل زیادہ واضح ہوگا۔ سوال مذکور کو عبارت میں اس طرح کہا جائے کہ ۳۷۲ بیج ا، ب، ج ان تین لڑکوں میں برابر تقسیم کرو۔

لڑکے	اکائی	دہائی	سیکڑہ
الف	○ ○ ○ ○	[ڈبیاں]	[پوٹلی]
ب	○ ○ ○ ○	[ڈبیاں]	[پوٹلی]
ج	○ ○ ○ ○	[ڈبیاں]	[پوٹلی]

طرز عمل وہی ہوگا جو سابق کے سوال میں بیان کیا گیا ہے جواب یہ نکل آئے گا کہ ہر ایک کو ۱۲۴ بیج ملیں گے۔

تحریری عمل

	سیکڑے	دہائی	اکائی
	۱	۲	۴
۳)	۳	۷	۲
	۳	۶	
	۰	۱	
		۱	۲

جواب ۱۲۴

اس قسم کے تمام سوالات کا عمل یہ ہوگا کہ پہلے سیکڑوں کی تقسیم کی جائے جتنے سیکڑے باقی بچیں گے ان کو دہائیوں میں تبدیل کرکے اصل دہائیاں اُن میں ملائی جائیں پھر دہائیوں کی تقسیم کی جائے جو دہائیاں باقی بچیں گی ان کو اکائیوں میں تبدیل کرکے ان میں اصلی اکائیاں جوڑ دی جائیں اور بعد اکائیوں کی تقسیم کی جائے۔

حصے یا ڈھیر بنانا

مثال۔ تین تین بیجوں کا ایک ڈھیر ایسے ۲،۳۴۲ بیجوں کے کتنے ڈھیر بن سکیں گے۔ تقسیم کی صورت میں سوال مذکور ۲،۳۴۲ ÷ ۳ سے ہی ظاہر کیا جائے گا۔ اور طرز عمل بھی وہی ہوگا یعنے (۱) سیکڑے میں سے ڈھیر بنائے جائیں اور ڈھیروں کی تعداد سیکڑوں میں بتاری جاوے (۲) جو سیکڑے باقی بچیں گے اُن کی دہائیاں بناری جائیں اور اصلی دہائیاں اُن میں ملائی جائیں۔ (۳) دہائیوں میں سے جتنے ڈھیر بن سکتے ہیں بنائے جائیں اور وہ تعداد دہائی میں بتائی جائے (۴) اگر کوئی دہائیاں باقی بچیں تو اُن کو اکائیوں میں تبدیل کیا جاوے اور اصلی اکائیوں کو اُن میں جمع کیا جائے (۵) اکائیوں کے ڈھیر بنائے جائیں اور وہ تعداد اکائیوں کے خانہ میں درج کی جائے۔

یہہ طریقہ زیادہ اہم ہے کیونکہ جب تک اِس طریقے پر بچے عادی نہ ہوں اُن کو خارج قسمت کے ہندسوں کی مقامی قیمت معلوم کرنے میں مشکل ہوگی۔ اس کو سمجھانے میں بہت سا وقت صرف کرنا ہوگا۔ مگر اس کو تضیع اوقات نہ سمجھا جائے۔ اس کا پختہ تصور ہونے کے لئے کافی مشق کی ضرورت ہے۔

چھوٹی تقسیم

(۱) چھوٹی تقسیم بذریعہ آلات تعلیمی۔

مندرجہ ذیل شکلوں سے یہہ ظاہر ہوسکتا ہے کہ چھوٹی تقسیم کے سوالات اشیاء محسوسہ کے ذریعہ کس طرح حل کرتے ہیں۔ اس میں ہر ایک شئے کی مقامی قیمت بچوں کی سمجھ میں آنی چاہیئے۔ کوئی خاص تختوں کی ضرورت نہیں۔ صرف تیلیاں یا گولیاں کام دے سکتی ہیں اُنہیں کے ذریعہ عمل صاف اور واضح ہوسکتا ہے۔

مثال ۹۸۴ گولیاں ۴ لڑکوں میں تقسیم کرو۔

لڑکے	اکائیاں	دہائیاں	سیکڑے
الف	o o o o o o	o o o o	o o
ب	o o o o o o	o o o o	o o
ج	o o o o o o	o o o o	o o
د	o o o o o o	o o o o	o o
	۶	۴	۲

اول سیکڑوں کی تقسیم کرو ہر ایک کو ۲ سیکڑے ملیں گے اور ایک سیکڑہ باقی رہے گا۔ اُس کو ۱۰ دہائیوں میں تبدیل کرو اور اُن میں اصلی ۸ دہائیاں ملانے کے بعد کل ۱۸ دہائیاں ہوں گی دہائیوں کی تقسیم کرو۔ ہر ایک کو ۴ دہائیاں ملیں گی اور ۲ دہائیاں باقی رہیں گی جن کو ۲۰ اکائیوں میں تبدیل کرو۔ اُن میں ۴ اصلی اکائیاں ملانے کے بعد کل ۲۴ اکائیاں ہونگی۔ اکائیوں کو ۴ پر تقسیم کرنے سے ہر ایک کو ۶ اکائیاں ملیں گی لہٰذا ہر ایک لڑکے کو ۲۴۶ گولیاں ملیں گی۔

مثال ۹۸۴ گولیوں کے ڈھیر بناؤ اِس طرح کہ ہر ایک ڈھیر میں چار چار گولیاں ہوں۔

عمل۔ اول یہ دیکھو کہ سیکڑوں کے کتنے ڈھیر بنیں گے ہر ایک ڈھیر میں چار چار کے حساب سے ۹ سیکڑوں میں ۲ سیکڑے کے ڈھیر بن جائیں گے اور ایک سیکڑہ باقی رہے گا۔ اُس کی دہائیاں بنائی جائیں۔ ۱۰ دہائیوں میں ۸ دہائیاں ملائی جائیں جملہ ۱۸ دہائیاں ہوں گی ہر ایک ڈھیر میں چار چار کے حساب سے ۱۶ دہائیوں کے ۴ ڈھیر دہائیوں کے بن جائیں گے اور ۲ دہائیاں باقی رہیں گی جن کو ۲۰ اکائیوں میں تبدیل کر کے اُن میں اصلی ۴ اکائیاں ملائی جائیں کل ۲۴ اکائیاں ہوں گی ہر ایک ڈھیر میں چار چار کے حساب سے ۲۴ اکائیوں کے ۶ ڈھیر بنیں گے اِس طرح ۹۸۴ کے ۲۴۶ ڈھیر بن سکیں گے۔

تحریری عمل	سیکڑے	دہائیاں	اکائیاں
۲۴۶ ۴) ۹۸۴ ۸ ۱۸ ۱۶ ۲۴ ۲۴ ۰۰	○ ○ ○ ○ ○ ○ ○ ○	○ ○ ○ ○ ○ ○ ○ ○ ○ ○ ○ ○ ○ ○ ○ ○	○ ○
	۲	۴	۶

آلات کا استعمال صرف عمل بتانے کے لئے کیا جائے آلات کے ذریعہ سوالات حل کرنے پر اس کا تحریری عمل تختہ سیاہ پر بتایا جائے اور طلبہ سے اُن کی سلیٹوں پر یا کاپیوں پر بھی اُسی طرح عمل کرایا جائے۔ تمام سوالات آلات کے ذریعہ حل کرانا مناسب نہیں ہے۔

یہہ تضیع اوقات کا باعث ہوگا۔ جس طرز کا سوال سمجھایا جائے اُسی طرز کے سوالات مشق کے لئے دئیے جائیں۔ اور بچوں کی ذاتی کوشش سے حل کروائے جائیں۔

لمبی تقسیم | چھوٹی تقسیم کی تفہیم کے لئے جو آلات استعمال میں لائے گئے تھے۔ وہی آلات لمبی تقسیم میں بھی استعمال میں لائے جائیں۔ ابتدائی چار عددوں میں لمبی تقسیم کا عمل زیادہ مشکل ہے۔ لیکن یہہ بتانا ضروری ہے۔ اس قسم کی تقسیم سے تقسیم کا عمل زیادہ واضح اور صاف طور پر بچوں کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ زمانہ قدیم میں یہہ رواج تھا کہ مدرس ایک سوال نمونہ کے طور پر تختہ سیاہ پر بتائے اور بچے اُس کی اندھی تقلید کریں۔ طلبہ جو کچھ عمل کرتے تھے اُس کی وجہ نہیں بتا سکتے تھے۔ صرف اتنا ہی کہتے تھے کہ مدرس صاحب نے ہم کو ایسا ہی بتایا تھا۔

ابتدا سے بچوں کو نمونہ کا سوال بالتشریح سمجھایا جائے اور طریقہ عمل بھی اُن کو بتایا جائے۔

مثال ۹۸۴ کو ۴ پر تقسیم کرو۔

مثال مذکور کا حل دونوں طریقوں سے (لمبی اور چھوٹی تقسیم سے) ذیل میں بتایا جاتا ہے لمبی تقسیم میں آلات کا استعمال کرکے عمل کیا ہے اور چھوٹی تقسیم میں صرف دل میں عمل کرکے جواب لکھ دیا گیا ہے۔

لمبی تقسیم

(ا)

```
      ۲ ۴ ۶   جواب
۴ ) ۹ ۸ ۴
    ۸ ۰ ۰
    -----
    ۱ ۸ ۴
    ۱ ۶ ۰
    -----
      ۲ ۴
      ۲ ۴
    -----
      ۰ ۰
```

(ب)

```
      ۲ ۴ ۶   جواب
۴ ) ۹ ۸ ۴
    ۸
    ---
    ۱ ۸
    ۱ ۶
    ---
      ۲ ۴
      ۲ ۴
    -----
      ۰ ۰
```

چھوٹی تقسیم

```
۴ | ۹ ۸ ۴
  --------
    ۲ ۴ ۶   جواب
```

عمل (ا) میں صفر بھی جوڑ دئے گئے تاکہ بچوں کو خارج قسمت کے ہندسوں کی مقامی قیمت صاف طور پر معلوم ہو سکے مگر کافی مشق کے بعد رفتہ رفتہ صفر جوڑنے کا طریقہ ترک کر دیا جائے اور عمل (ب) میں جو طریقہ بتایا گیا ہے اس طریقہ پر سوالات حل کرائے جائیں

تقسیم کے جواب کی جانچ پڑتال خارج قسمت اور مقسوم علیہ کے حاصل ضرب سے کرائی جاوے۔ یا مقسوم کو خارج قسمت پر تقسیم کرنے سے کرائی جائے باقی بچنے والے تقسیم کے سوالات کی صورت میں جواب کی پڑتال حسب ذیل ہو سکتی ہے۔

(۱) (خارج قسمت × مقسوم علیہ) + باقی = مقسوم

یا (۲) (مقسوم - باقی) ÷ خارج قسمت = مقسوم علیہ

یہاں اُن کو یہہ بھی بتایا جاوے کہ تقسیم کی جانچ پڑتال جس طرح مقسوم علیہ × خارج قسمت کے حاصل ضرب سے ہو سکتی ہے اُسی طرح ضرب کے سوال کی جانچ پڑتال حاصل ضرب کو مضروب یا مضروب فیہ پر تقسیم کرنے سے ہو سکتی ہے۔

(۱) حاصل ضرب ÷ مضروب = مضروب فیہ

(۲) حاصل ضرب ÷ مضروب فیہ = مضروب

پڑتال کا نمونہ اصل سوال مقسوم ÷ مقسوم علیہ = خارج قسمت

۳۶ ÷ ۴ = ۹

پڑتال (۱) ۳۶ = ۴ × ۹

پڑتال (۲) ۳۶ ÷ ۹ (خارج قسمت) = ۴ مقسوم علیہ

اصل سوال ۳۸ ÷ ۴ = ۹ اور باقی ۲

پڑتال (۱) ۹ (خارج قسمت) × ۴ (مقسوم علیہ) + ۲ باقی = ۳۸

" (۲) (۳۸ - ۲) ÷ ۹ خارج قسمت = ۴ مقسوم علیہ

تقسیم کے سوالات کے جوابات مندرجہ بالا طریقوں سے جانچنے کی کافی مشق کرائی جائے تاکہ بچوں کو اُن کے کام کا اطمینان ہو سکے۔

اِس کے بعد ایسے سوالات تقسیم کے دئیے جائیں کہ مقسوم کا سب سے اعلیٰ درجہ کا ہندسہ مقسوم علیہ کے ہندسہ سے چھوٹا ہو۔ مثلاً ۲۳۶ ÷ ۴ اس مثال میں طلبہ کو یہ سمجھانا ہو گا کہ ۲ سیکڑے ۴ جگہ سیکڑے کی صورت میں تقسیم نہیں ہو سکتے

لہذا اُن کی دہائیاں بنانی ہوں گی باقی عمل حسب سابق مقسوم میں جتنے درجے اس سوال کے خارج قسمت میں نہیں آئیں گے بلکہ ایک درجہ کم آئے گا۔ جواب ۸ دہائیاں اور ۴ اکائیاں یعنی ۸۴ آئے گا۔

۸۴
۴) ۳۳۶
۳۲
۱۶
۱۶
۰۰

اس کے بعد ایسے سوالات دئے جائیں کہ مقسوم علیہ دو ہندسہ والا عدد ہو گر اس عدد کا پہاڑہ بچے جانتے ہوں مثلاً ۳۷۲ ÷ ۱۲
یہاں ۱۲ کے پہاڑہ کے ذریعہ خارج قسمت دریافت کیا جا سکتا ہے اس قسم کے سوالات کی کافی مشق کرائی جاوے یہاں ۳ سیکڑے کی صورت میں ۱۲ جگہ نہیں تقسیم ہو سکتے۔ لہذا ۳ سیکڑوں کو دہائیوں کی صورت میں تبدیل کرنا پڑا۔ اور خارج قسمت میں جواب دہائی کے درجہ سے لکھا گیا۔

۳۱
۱۲) ۳۷۲
۳۶
۱۲
۱۲
۰۰

اِس کے بعد ایسے سوالات دئے جائیں کہ بچوں کو مقسوم علیہ کے عدد کا پہاڑہ نہ آتا ہو۔ مثلاً ۲۹۹ ÷ ۲۳

ایسے سوالات میں خارج قسمت کے ہندسے مقسوم علیہ کے اعلیٰ درجہ کے ہندسہ کی مدد سے معلوم کئے جائیں۔ بذریعہ تجربہ بچوں کو یہہ معلوم ہوگا کہ مقسوم علیہ کے جتنے ہندسے ہوتے ہیں کم از کم اُتنے ہی ہندسے مقسوم میں سے اُتار کر تقسیم کا عمل شروع کرنا ہوتا ہے اور خارج قسمت کا اندازہ لگانا ہوتا ہے۔ خارج قسمت یا مقسوم میں صفر ہوں ایسے بھی سوالات بچوں کو دے کر مشق کرائی جائے۔

جواب ۱۳
۲۳) ۲۹۹
۲۳
۶۹
۶۹

مثال ۱۶۳۲ ÷ ۱۶

سوال مذکور بچوں سے حل کراتے وقت اُن کو یہہ بتانا ہوگا کہ ۱۶ سیکڑوں میں ۱۶ سیکڑے تفریق کرنے کے بعد کچھ بھی باقی نہیں رہتا لہذا صرف ۳ دہائیاں

اُتارنی ہوں گی جو دہائیوں کی صورت میں ۱۶ جگہ تقسیم نہیں ہوسکتیں لہٰذا خارج قسمت میں دہائی کے درجہ پر صفر (۰) لکھنا ہوگا اور ۳ دہائیوں کی اکائیاں بنانی ہوں گی۔ اور اُن میں ۲ اکائیاں ملا کر کل ۳۲ اکائیاں ہوں گی۔ اُن کو ۱۶ پر تقسیم کرنے سے ۲ اکائیاں خارج قسمت میں لکھی جائیں گی۔ اور جواب ۱۰۲ بتانا ہوگا۔

```
      ۱۰۲  جواب
۱۶ ) ۱۶۳۲
     ۱۶
      ۳۲
      ۳۲
      ۰۰
```

مشق کے لئے متعدد سوالات دئے جائیں تاکہ بچوں کو کوئی مشکل محسوس نہ ہو۔ کافی مشق سے یہ بات بچوں کے ذہن نشین کرائی جائے کہ تقسیم کے عمل میں ہر ایک تفریق کے بعد جو باقی بچے وہ مقسوم علیہ سے چھوٹا ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد ایسے سوالات دیئے جائیں کہ مقسوم علیہ دو ہندسے والا عدد ہو اور مقسوم علیہ عدد ہو جو مقسوم علیہ پر پورا پورا تقسیم ہونے والا نہ ہو یعنے قدرے مشکل سوالات دئے جائیں۔

مثال ۴۱۳۸ ÷ ۶۱

سوال مذکور کو سمجھاتے وقت بچوں کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرائی جائے کہ اگرچہ وہ ۶۱ کا پہاڑہ نہیں جانتے لیکن ۶ کا پہاڑہ تو جانتے ہیں لہٰذا ۶ کے لحاظ سے یہ دیکھا جائے کہ وہ ۴۱ میں کتنی مرتبہ تفریق ہوسکتا ہے خارج قسمت کا پہلا ہندسہ ۶ ہوگا۔ ۶ کو ۶۱ میں ضرب دینے سے جو حاصل ضرب آئے گا وہ مقسوم کے پہلے تین ہندسوں کے نیچے لکھنے سے یہ معلوم ہوگا کہ ۳۶۶ دہائیاں ہیں لہٰذا خارج قسمت میں ۶ کا ہندسہ دہائی کے درجہ پر لکھا جائے

```
        ۶۷
۶۱ ) ۴۱۳۸
     ۳۶۶
      ۴۷۸
      ۴۲۷
       ۵۱ باقی
```

۴۱۳ میں سے ۳۶۶ تفریق کرنے سے باقی ۴۷ دہائیاں رہتی ہیں، ۴۷ دہائیوں کو اکائیوں میں تبدیل کرکے اُن میں ۸ اکائیاں ملانے سے کل ۴۷۸ اکائیاں ہوتی ہیں۔ ۶ کے لحاظ سے ۴۷ میں ۶ کتنی مرتبہ تفریق ہوسکتا ہے دریافت کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خارج قسمت میں ۷ کا ہندسہ اکائی کے درجہ پر ہوگا۔ ۶۱ اور ۷ کا حاصل

we would not be far wrong in saying that twenty-five per cent. of the amount of money that is now spent on education is being wasted.

We therefore hope that the Report of the Committee for the Education of Backward Children will receive the immediate attention of the educational authorities.

Again, the reference in the Report to the good results achieved by the English and American reformatories does not add materially to the argument for establishing separate schools for Backward children. Much less does it warrant the assertion that mental backwardness is chiefly due to environment and not to heredity. Scientific investigations and experiments in Europe and America seem to point to a different conclusion. The neural structure of a child, which determines his intelligence, is congenital. It cannot be changed either by medical treatment or by a change in environment. It may or may not be the result of heredity. More often than not, it is. But, in any case, environment has very little to do with it except in so far as it can help or hinder us in turning the backward child to good account. On the other hand, moral delinquency is chiefly due either to environment or to some extraodinary emotional experience in early life, and the part played by heredity in the development of one's character is extremely insignificant and extremely doubtful.*

In short, mentally a man is what nature has made him; morally, what society has made of him. But in putting forward this view, we do not by any means imply that the Backward children should be left to themselves. That mental backwardness is innate and irremediable is no argument for neglecting to turn it to good account in the interests alike of the Backward child and the community at large.

In fact, it is our honest conviction that a civilised state owes it to itself as well as to every Backward child in it to provide him with special facilities; for, as the Report points out, not only is he not benefited by the ordinary school but is actually harmed by it, mentally and morally. So that,

---

* For a detailed discussion of this point the reader is referred to Mr. M. A. Rahman's article on Character-Formation, published in our issue of January—March, 1934, Vol. VI. No. 3.

To-day, the backward child (in Europe and America, at any rate) is receiving so much attention from psychologists and educationists that the intelligent child seems to be relegated to the background. Indeed, so great is the amount of solicitude bestowed on the former that the latter might well feel jealous and regret his good fortune.

In Hyderabad, however, we have not gone as far as that, and the Committee's Report which we publish elsewhere, is the first of its kind. We, therefore, hope that the suggestions contained in it will receive the careful consideration they deserve from all those interested in the problem of Backward Children.

The Committee seems to have made out a good case for the segregation of Backward children by establishing separate schools for them, with a curriculum suited to their needs and a staff specially qualified for handling them. But we must make it clear to our readers, since the Report fails to do so, that these separate schools are meant only for those Backward children whose backwardness is innate and hence irremediable, the object of such schools being no more than to help these unfortunate children to become decent and useful members of the community.

Those of them who are not really backward but appear to be so because of some physical disease, such as rickets, anæmia, adenoids, tonsilitis, defective eyesight, and so on, do not need any special schools. All that is required in their case is immediate medical attention.

Neither can we admit into the schools for Backward children those whose mental progress is retarded not because of a lack of native intelligence but because of a morally undesirable environment which has undermined their character. For them the proper place is a Reformatory, a well-conducted reformatory in charge of an expert psychologist with a specially qualified staff under him. We wish the Report had been quite explicit on this point.

relating to vocational training in the pre-university stage will have to be worked out differently in different provinces and states according to the economic conditions and requirements of each area. For the success of the scheme it is necessary that vocational training should be given the same dignity as usually attaches to the purely literary studies. For example, a necessary corollary of the proposal to introduce agricultural training in the higher secondary stage is that provision for such training should be made in the university stage where none exists at present.

The proposals are no doubt drastic, but the defects in our school system are such that they can only be remedied by drastic measures. It is to be hoped that for the sake of avoiding the existing wastage in our secondary schools and raising the standard of both secondary and university education, the practical difficulties that present themselves in the way of the adoption of the scheme will be faced boldly.

The Education of Backward Children.

The Committee appointed by the Teachers' Association to investigate the problem of Backward Children in Hyderabad has done good work and deserves our congratulations. The very appointment of such a Committee, quite apart from what it has accomplished, indicates that the Teachers' Association is endeavouring to keep abreast of the times. The days are gone by when teachers wittingly sent the hindmost to the devil. The Backward child is now no longer regarded as an altogether useless member of society who should be left to care for himself as best he can; and the type of headmaster (mentioned approvingly by Carlyle) who was in the habit of inquiring whenever a new student was brought to him for admission, "Are ye sure he is not a dunce?" would be set down by us of the twentieth century as an amusingly idiosyncratic person or as a relic of the benighted past

It is proposed that an examination should be held at the end of the Lower Secondary stage and one at the end of the Higher Secondary stage, the latter being intended as the qualifying examination for admission into the university. Under this scheme the course for the degree (Pass and Honours) is to extend over three years. The Committee has also recommended the formation of a Board of Higher Secondary Education to control Higher Secondary education and to conduct the examinations held at the completion of the Lower and Higher Secondary courses

The Committee has emphasised the need for every stage of instruction having a clear objective, and being as far as possible self-contained. The scheme is intended to divert a large proportion of boys from a purely literary course either to occupations or to vocational institutions. It is suggested that at the end of the primary stage pupils should be admitted to Industrial schools and at the end of the lower secondary stage to Craft schools. It is also proposed that the Higher Secondary Schools should provide specialised training for agricultural, military, clerical and commercial careers according to local needs.

While the Punjab University has not so far accepted the above-mentioned proposals, it is interesting to find that the All-India Universities Conference, which was held in New Delhi early in March, 1934, adopted a resolution recommending a reconstruction of Indian school system practically on the lines suggested by the Punjab University Enquiry Committee. The decision of such an important Conference is bound to focus the attention of educational authorities in different parts of India on the proposed scheme. There is no doubt that the defects pointed out in the quotations printed on the preceding page, will be greatly minimised, if not altogether removed, by the adoption of some such scheme as has been recommended by the Punjab University Enquiry Committee and accepted by the All-India Universities Conference. The details, especially those

Editorial

Proposed Reform of Indian School System.

"All pupils, whatever be their aim of life, should first receive general education, but it should be open to boys at some suitable stage in the subsequent course to branch off to craft schools or to vocational classes".

"We think that a large number of the pupils in high schools would benefit more by being in schools of another type".—*The Hartog Committee Report.*

"Matriculation is the goal to attain which all high schools devote their energies .." "The higher classes of the schools are congested by boys of inferior attainments, and teaching is stultified by their duality of purpose—preparing boys for college along with others who have neither desire nor competence for a college career".—*The Punjab University Enquiry Committee Report.*

"The complaint all over India has been that the secondary school system has been far too narrow in character and far too much dominated by the requirements of the University Matriculation Examination".—*Report of the Travancore Education Reforms Committee.*

"As it is not desirable or expedient to produce men in large numbers with only a literary training, the question becomes one of vital importance as to how and where the line should be drawn between those who wish to enter the University and the much larger number who would, for any reason, prefer a more practical if less learned career".—*Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur's Convocation Address at Osmania University.*

There is now general agreement among educationists in India on the need for the reform of our secondary school system. While emphasising this need, the Hartog Committee did not suggest any definite scheme, but confined itself to indicating the general lines of reconstruction. The credit for working out a clearly defined scheme is due to the Punjab University Enquiry Committee, which recommended :—

(a) A Primary course of five years.

(b) A Lower Secondary course of four years.

(c) A Higher Secondary course of three years to include the present Matriculation Class and the Intermediate Classes.

respect. For the weak are never respected, however loquaciously they may talk of their rights. A soldier's training is the best equipment for the battle of life, and he who is not so equipped must be prepared for defeat and humiliation.

Addressing the graduates, Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur said that as citizens of this State, their public duty was three-fold in its nature—duty to the Ruler, to the State and lastly to their fellow citizens. They should make "personal loyalty to the Sovereign a rule of life, and a sacred obligation to be respected in their daily life and conduct". Duty towards the State required that they should "try and create a patriotism that knows no difference of race or community" and that they should advance the interests of the State and guard jealously its honour. Finally, duty to their fellow citizens implied the rendering of service to others and ministration to the wants of those who might need their help. Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur exhorted the graduates to cultivate a habit of unselfishness and sacrifice and told them that if they only took their duty to their fellow citizens seriously, they could alleviate much suffering, dispel much ignorance and bring much happiness to the poor and the ignorant among their neighbours in town and country.

Review.

The Combined Boys' Attendance and Fees Realisation Book.

Published by Rajlakshmi Printing Stores, Calcutta.

The New Register is quite good, inasmuch as it economises space and saves the labour of writing down the names of the pupils each month. The substitution of roll numbers for the names of the pupils largely minimises the work of the class teacher both at the end of the month and at the time of roll-call each day. Moreover, the fee account is more thorough here than in the Registers commonly in use. It provides columns for various items, though all of them are not quite necessary every month.

A. S. S.

be strictly observed. He advocated a bifurcation of studies in the secondary stage, so that those who so desired could proceed to the university, while the others, a much larger number, could have a vocational training given to them—agriculture in rural areas and skilled arts and handicrafts in urban centres. "The University would thus be fed by a comparatively small number of high schools which would be all the more efficient for being few, while the vocational training given to the masses might perhaps help further in the solution of the problem of unemployment".

Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur proceeded to remark that the aim of university education, or indeed of all education, was "the bringing out of what is best in us so that our duty in life may be performed in the best way possible". This definition, he pointed out, "embraces everything that prepares us for life". In preparing for life, we must endeavour to perfect ourselves as men. This process of humanisation was only possible "through knowledge which comes of truth, and it connotes action and not mere passive assimilation". "We must seek the truth therefore in all things and act upon it, and not subject our actions to any other considerations". In order to make life effective, one must also possess energy and momentum, the vigour and energy necessary to make one lead a strenuous life, one of usefulness and achievement. Without such energy one's search after knowledge would only be a sort of arm-chair philosophy. "We were born to *do* things in this world and not simply to *know* them".

Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur next dwelt on the importance of physical education. In this connection, he deplored the neglect of the University Corps. He said, "Among virile nations like the English, the French and the Germans, every able-bodied man is an actual or a potential soldier. The same spirit should inspire you here. Without being able to defend oneself no one can command

In her concluding remarks, Mrs. Naidu pointed out that Dr. Tagore's educational scheme was based on the principle of the indivisible unity of mankind. His message of self-realisation and self-expression was age-old in Asia, and yet ever new when a prophet or a poet spoke it. Goethe had said, "Through the good and the beautiful you must find the meaning of life". Thus Goethe and Tagore explained and completed each other. The basic principle of Dr. Tagore's scheme of education followed in Visva Bharathi and Santiniketan was, "A teacher does not teach, he merely points out the direction".

Mr. Syed Ali Akbar proposed a vote of thanks to Dr. Tagore and Mrs. Naidu.

Nawab Mahadi Yar Jung Bahadur's Convocation Address.

Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur M. A. (Oxon), Political Member, H. E. H. the Nizam's Government, delivered a very thoughtful and inspiring address at the recent Convocation of the Osmania University. He expressed his profound faith in the basic principle of the university. The use of an Indian language as the medium of instruction, he said, had given an impetus to original thought, besides inspiring the younger generation with a new patriotism and a new pride in a language that was their own. The language used by the Osmania University was identical with Western Hindi, which was spoken by the largest number of persons in India and which was capable of being written either in Persian or in the Devanagari characters. The large proportion of Persian and Arabic words contained in Western Hindi had become an inseparable part of the language. Hindustani, comprising Urdu and Hindi (Western and Eastern), was the one language which was capable of becoming the language of the whole of India.

Referring to the school system, Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur said that the principle that Primary education must be imparted in the mother-tongue of the pupils should

so reckless that he had kept a mind sensitive to the touch of life. Once upon a time India was famous for her storage of wisdom and we possessed such a thing as our own mind. But the present system of education in India had deprived the mind of its natural food of truth and freedom of growth and developed an unnatural craving for success in examinations. Even those who had received university education simply displayed borrowed feathers; they had no intellectual self-respect, no initiative and no courage of conviction. We in India overlooked the fact that the end of education is to make the mind creative and to develop self-expression and self-sacrifice.

Dr. Tagore proceeded to advise teachers to be always learning. Unless they did so, he said, they could never be successful teachers. A teacher should not merely inform and instruct but he should inspire his students.

The poet next emphasised the importance of developing Indian vernaculars. He disagreed with the view that the multiplicity of vernaculars in India is an obstacle in the way of intellectual unity. Like Europe, India could also have a common civilisation and an intellectual unity without a common language. The different vernaculars should be developed so that through each of them the people who speak it might be able to express their genius.

European culture, especially European philosophy and modern science, had proved valuable to India. But European culture alone was not sufficient for us. What was wanted was a combination of the Western and Indian cultures. Our own culture must be strengthened not to resist but to assimilate foreign influences.

Dr. Tagore deplored the neglect of art in Indian schools. Finally, he stressed the need for establishing a closer relationship between education and the economic life of the country.

Under the joint auspices of the Hyderabad Teachers' Association and the City College Union, Dr. Rabindranath Tagore delivered an address to a crowded audience at the City College on the 21st December, 1933. Mrs. Sarojini Naidu presided. In welcoming the poet, Mr. Syed Mohamed Azam, M. A. (Cantab), Principal, City College, said that Dr. Tagore was essentially a teacher, a born teacher who inspired the young and old with ideals as no other teacher could. Dr. Tagore's message was that India, in spite of her spirituality, could learn much that was good in the West and that the West, in spite of its materialism, had something to teach to the East. Mr. Azam then eulogized the work which Dr. Tagore had done in raising the prestige of India. Speaking of Mrs. Naidu, Mr. Azam said that it would be improper to praise her too much as she was a born Hyderabadi, but there was no doubt that few Indians had done more to promote Hindu-Muslim Unity than she had done.

Dr. Rabindranath Tagore's Lecture at theCity College. *

Mrs. Naidu said that she had been a bad student and she would make a poor teacher in the technical sense, but she had one qualification, though a vicarious qualification, to preside over the meeting, and that was that it was her father who more than half-a-century ago had founded English education in Hyderabad. As a Hyderabadi, she was proud of the fact that Hyderabad was the centre of reconciliation. Referring to Mr. Azam's remarks, she said that no praise was due to her, but all praise was due to Hyderabad with its traditions of Hindu-Moslem unity, which she hoped would continue for ever.

Dr. Tagore began his address by recalling his school days. The education which he had received in his early life was uninspiring, and he ran away from his classes. He remarked that it was probably because his youth was

* A full report of the proceedings of this meeting appeared in *The Hyderabad Bulletin* on the 23rd December, 1933.

of intelligent direction on the part of the teachers. After all, it was a new innovation and the boys might have received more adequate guidance.

In future, we would suggest the regular maintenance of a record, which would show the weekly work done by the pupils and which would be useful in comparative work in gardening.

We must emphasise here our pleasure in seeing the admirable use to which the space at their disposal had been put. This was especially noticeable in the Urdu Sharif School. In this school also the thoughtful co-operation of the teachers was valuable.

Only in two schools did we find that the seeds dealt with had any real educational value.

Notes and News

The Hyderabad Teachers' Association.

Mr. Sajjad Mirza, M. A. (Cantab), Principal, Osmania Teachers' Training College, represented the Association at the All-India Teachers' Conference held at Karachi last December.

The Association has appointed the following Committee to prepare a report on Examinations and place it before the next annual conference.

Rev. G. Sundaram, B. A., *Chairman.*

Mr. Abdus Sattar Sobhani, B. A., B. T.

,, S. M. H. Nakavi, B. A., Dip. Ed. (Leeds).

,, G. B. Garden, B. A.

,, G. A. Chandavarkar, M. A.

,, S. Noorul Hasan, B. A., B. T., Dip. Ed. (Edin), *Secretary.*

(c) He must know child psychology and must have that insight which comes through knowing his pupils.

A teacher, therefore, who knows his subject well, who knows his pupils well and also knows how to bring these two factors into proper relation is a teacher with a 'pleasing personality', irrespective of his dress or the general build of his body. He is a true friend of his pupils. In the the words of Dr. Ballard, 'he maintains friendly relations with his pupils searching for the virtues with a magnifying glass and vices with a diminishing glass'. Let us seek personality in a teacher not so much on the exterior but the interior. All cannot be gold that glitters. Personality, we repeat, is as personality does.

Report on School Gardens Competition*

BY

The Judges—Miss A. POPE, M, A., D. Litt. & Miss ALLEN.

On Monday, the 28th September 1932, we inspected the students' gardens of the following schools: The Model Primary Sshool, Nampalli High School, Urdu Sharif Middle School, Darus Shifa High School and the Chaderghat Primary School.

The idea of a garden competition proved to be an excellent one and we were both surprised and pleased to see the stimulus which had been given and the results which had been achieved under, in many cases, unfavourable conditions.

On the whole, the neatness was commendable. With the exception of one school, there was not much evidence

* This competition was organised by The Hyderabad Teachers' Association and was held along with the Annual Educational Exhibition in September 1934.—ED.

Essentials of Personality.—When a teacher has to face a big class consisting of a large number of students with varied aptitudes, he has perforce to possess some unifying and propelling force to make them imbibe and assimilate what he is imparting to them. But if such personality is forced upon them, either by means of a heavy rod or bitter sarcasm, it would end in disaster. For one thing, it would stunt their intellectual growth and secondly, it would put great obstacles in the path of freedom. Such a masterful personality might do honour to a Napolean, a Bismark or even to a Caesar, but in a teacher, it is decidedly harmful. If pupils are to be considered some thing more than machines, a teacher need not try to possess a masterful personality which is the outcome of force. Instead of a masterful personality, a more sympathetic personality is needed.

A teacher who is a friend of the pupils tries to bring out what is best in them. A successful Head Master will always endeavour to make his first assistant fit to be a head master one day. On the same principle, a teacher should try his utmost to develop personality in his students by qualifying them to fight the battle of life successfully.

Such a thing is possible only if his personality is dependent on the following conditions :—

(*a*) A teacher must first know his subject well. A master of his subject unknowingly creates in the minds of his students an eager desire to follow him attentively.

(*b*) A teacher must know the technique of teaching. He must know how to make the subject interesting.

Some Aspects of Personality.—Personality is that quality in a teacher which enables him to create a favourable impression on the minds of his pupils and thereby to make them assimilate the knowledge imparted as easily as possible. The question still remains as to how that 'impression-producing' quality is to be acquired and what it stands for.

If it be possible to guage the depth of personality at first sight, the judge, unless he chances to be a thought-reader, must have formed his impressions only by the exterior form and build of the teacher more than by his other qualities of the head and heart. In more cases than one, therefore, people estimate 'good personality' either by the nice dress or the general build of the body, taking into consideration a charming face, captivating looks and similar external features. But it needs no great stretch of imagination to realise that the exterior, however charming it may be, is no criterion for judging the fitness of an individual to be a successful teacher. It is, like our present-day examinations, a wrong measure of efficiency. If dress be the criterion, a clever tailor can lay claim to be the Principal of a Teachers' Training College to manufacture a large number of good teachers. If the general build of the body be the standard, an athlete can surely succeed in becoming a good teacher. If gestures and gesticulations go to make up a teacher, then certainly a clever stage-manager should have better chances of becoming a good school-master. If it is argued that personality is born and not made, how many such "born" teachers can we count upon to mould the destinies of the younger generations? All can not be geniusses. Geniuses are rare; they can not be had for the mere asking. If they can not be made, can we not argue that the money and time spent on Teachers' Colleges are all a huge waste? After all, it is not impossible to cite the examples of teachers who are good teachers, in spite of their simple dress and ordinary build. "Handsome is as handsome does." So also personality is as personality does.

The Personality of a Teacher

BY

G. A. CHANDAVARKAR, M. A.

Of the different qualities of the head and heart that go to make a teacher successful, there is none that is considered so essential as his personality. Educational reformers, members of Selection Boards and Inspecting officers attach great importance to it, so much so that a candidate or a teacher without 'a good personality' loses all chances of success. Members belonging to other learned professions, such as Law or Medicine, also need this personality, if they are to achieve real success. A preacher in the pulpit and an orator on the platform should possess personality to a high degree if he is to influence the minds of men. But what constitutes personality, what exactly it connotes and denotes, and whether it is born or made are difficult questions. The word is so often used that it seems to be in danger of losing its real meaning. This is particularly true of the profession of a teacher. Once it happened that out of a large number of candidates who had applied for the post of a lecturer in a college, only five were called in for an interview by the members of the Selection Board. When out of these five one candidate was lucky in being selected, it was declared by an influential member of the Board that the selected candidate had a pleasing personality, which other candidates with equal qualifications lamentably lacked. Among the rejected candidates there were M. A's. and L. T's. It is evident, then, that a pleasing personality is not in the gift of either the University or the Teachers' Training College. Where and how to acquire it is the question of questions.

nous, we deem it sufficient for the time being to mention the names of a few standard works on this question. Later on, we shall consider the question of a special Curriculum in connection with our recommendation for forming special committees.

1. "Vocabulary for the Primary Grades"—Gate.
2. "Teacher's Word Book"—Thorndike.
3. "How to teach Silent Reading to Beginners"—
Miss Walkins.
4. "The Teaching of Dull and Retarded Children"—Inskeep.
5. "The Education of the Handicapped Children"—
Prof. J. E. Wallace Wallin.
6. "Dalton Plan"—Lynch.

The practical work carried out by us had to be finished within a very short period. Such an important work, however, really demands a more extended period of time. Hence, we beg to recommend the formation of a Special Committee by the Department consisting of at least 10 members, who are not only experts in this line, but are also willing to undertake this work, and who have a profound concern for the education and uplift of backward children. They should submit, after thorough deliberation, a comprehensive Report on this subject, throwing ample light on it and giving useful suggestions to the Department.

As far as possible, open-air classes should be held and the children should be taken on excursions to different places of interest. They should be taken, for instance, to bazars and factories to see and observe things manufactured and sold.

The backward child is bound to follow and adopt some manual occupation where intelligence is not of so much importance; hence there must be a manual and vocational bias in the training and education of such a child.

Teaching Staff.—Trained teachers are indispensable for the education of backward children. Therefore, the Committee strongly recommends that special provision should be made to train teachers to observe the tendencies of backward children and to handle them properly. The teachers selected for this work should have natural aptitude and genuine sympathy with such children. The curriculum for these teachers should comprise practical psychology, and every opportunity should be given to them to give practical lessons to such selected backward children from different schools.

In almost all the civilized countries of the world, clinics have been established to find out the natural aptitude and tendencies of the children. Therefore, the Committee recommends that a clinic should be established in connection with the Osmania Teachers' Training College. The appointment of a distinguished psychologist, a doctor for consultation, and a few nurses with all the necessary equipment, is indispensable. If a boy is found markedly dull and retarded, he should be at once sent to this clinic, and whatever suggestions are offered should be intimated to the parents.

The Curriculm for the Backward Child.—There remains now the problem of the curriculum of the backward child. But as the Report has already become very volumi-

not be able to pay individual attention which is necessary. As their senses are not well developed, it is of paramount importance that sense training should be the basis of education, because the development of intellect depends primarily upon the proper development and co-ordination of the various senses. The principle of self-activity should always be kept in view.

Handwork leaves a lasting impression upon the minds of children. While teaching history, the teacher should ask the children to make various articles that interest them and in the teaching of other subjects also, the same principle should be followed. Their syllabus must be light, avoiding unnecessary details, because a detailed and heavy curriculum is likely to kill interest.

If it is not possible to open special schools for backward children, it is advisable to extend in their case the middle school course to 4 years, instead of the existing 3 years' course. In this special class, the same subjects with certain necessary modifications, may be taught. Handwork, individual attention and the principle of self-activity, should be the determining factors in the education of these children. This class should be divided into two groups, one for the younger and the other for the older pupils. The teacher must be sympathetic, kind-hearted and must be well-acquainted with the mental, moral and emotional tendencies of each child. Up to the stage of the fourth Standard, the teacher has enough time and opportunities to discover the backward child, that is why we have suggested the introduction of a special class after the fourth standard.

A concurrent time-table should run in all the classes at the same time to enable a child who is weak in a particular subject to make up his deficiency in that subject. If a child is weak in Arithmetic and well up in all other subjects, he can very easily be sent to a lower class in the same period to study the same subject.

(*b*) *Social Life.* Man being a social and gregarious animal, is bound by social laws. It is the duty of the school to prepare a child to move freely in society. Health without social intercourse is of no worth. It is next to impossible to become popular in one's society without truthfulness, straight-forwardness, self-sacrifice and self-reliance. To promote these qualities, the teacher should co-ordinate all the different subjects of the curriculum in such a way as to infuse a new spirit in the child, enabling him to sympathise with those who suffer and to take a real delight in the success and prosperity of others.

(*c*) *Self-help.* Self-help is the secret of individual and national prosperity. Perseverance and self-help are two qualities by which even the most backward child can attain success to a certain extent.

(*d*) *Useful Employment of leisure hours*—An eminent philosopher has observed that the character of a man is judged by the way in which he makes use of his leisure hours. Backward children may have a tendency to become criminals if they do not know the proper use of their leisure.

Methods adopted in th West for the Improvement of Backward children.—Special schools have been established for backward children in several parts of Germany where every kind of facility is provided for them, and manual training occupies an important place in their instruction. In some other European countries and America, there are many institutions where backward children are not only taught by the scientific ways most suitable to them, but are also given every opportunity to mix with the average student at work and play.

Recommendations of the Committee.—Funds permitting, special schools may be opened with the necessary equipment to meet the needs of backward children. There should not be more than 15 to 20 boys in a class, otherwise the teacher will

seventh year, which is in fact the most impressionable period of a child's life. The Committee strongly recommends that through educational journals like *The Hyderabad Teacher* and *The Al Muallim* and other local papers the parents should be given guidance in this matter.

Social Influences.—In big towns children sometimes frequent tea-shops in the day time and attend cinemas and theatres in the night, with the result that they find little time to study books and enjoy sound sleep. The Committee strongly recommends that the Head-Masters should draw the attention of the parents to the need for stopping children from visiting tea-shops and seeing unhealthy pictures and dramas.

Aims of Education in the case of Backward Children.—As teachers, it is our duty to know the needs of backward children and to consider what sort of education would meet their requirements. It should always be kept in mind that self-respect, self-reliance, self-confidence and self-effort are the secrets of success. If we succeed in inculcating these virtues, even the most hopeless child can be turned into a useful one. The school work must be regulated and adjusted to the mental capacity of the backward child. The work assigned should be light, so that he may be able to do it with ease and pleasure. The aim of the education imparted to him should be to make him useful in later life.

Means of attaining this Ideal.—*(a) Physical Upbringing.* Special attention should be paid to the health of backward children, for while the intelligent man earns his living mainly with his brain, the backward child has to depend for his living chiefly on physical labour. Great importance should therefore be given to physical exercises and health should also receive consideration in the teaching of other school subjects.

External Causes.—Physical weakness is a frequent cause of backwardness. It is well-known that every year an appalling number of children in India succumbs in infancy to various diseases on account of unscientific and insufficient food, clothing and housing, and lack of supervision. Those that escape death continue to suffer from diseases and their constitution gets hopelessly undermined. This physical weakness tells upon their growing minds and thus they become dull and backward. The Committee, therefore, recommends that on admission to school every child should be medically examined. If he is suffering in any way, his parents should be informed. The backward children, in particular, should be examined every year. In the West, great stress is laid on medical inspection with the result that many defects are removed, thus enabling the children it continue their education with profit. In Germany some backward children were found to be suffering from adenoids, and when operated upon, they made remarkable progress.

Defects like those of vision, hearing and speech are often the causes of backwardness in children. The child who cannot very well see the board, hear the teacher or has defective speech organs, does not derive much benefit from ordinary education. His defect grows from bad to worse and ultimately leads to his becoming a backward child. It is advisable that such children should be given the front seats and should be especially encourged in order that they may shake off their timidity.

Some children are sent to school very late owing to carelessness and lack of interest on the part of their guardians. Even after joining school, they absent themselves for days together. Such continued absence leads to backwardness, and gradually the children lose all interest in studies. If the state, teachers and parents join hands, these drawbacks can be easily removed.

An important factor in the backwardness of children is the total neglect of the education of children up to the

talented. On the other hand, another family of the same number of individuals produced only 4 such persons. Thus he has proved, through his psychological experiments, that there is greater probability of expecting promising material in a mentally gifted family.

Pearson and Prof. Startch applied these tests on a vast scale and concluded that there happens to be a closer mental co-ordination between members of the same family, and especially between real brothers and sisters. Thorndike and Galton go a step further and point out that twins possess this co-ordination more prominently.

The Influence of Heredity on Social and Moral Tendencies.—Mr. Dugdale has shown through facts and figures that the notorious Jukes family of America consisting of 1200 members was of loose character and degenerate habits. On the other hand, the great forefather of the Edwards family being a person of admirable qualities, his descendants numbering 1400 were almost all fashioned after him. We come across many such examples in the East also.

The best way of combating these influences is not to accept them as being due to inheritance, but mainly as the result of environment. Hence we should aim at creating suitable and wholesome environment and not brush aside the question because of the hereditary factor.

The Influence of Environment upon the Child.—The results of practical work carried out by us prove our contention that environmental influences play an important part in the make-up of the children's mind. For example, we found that many of the boys obtaining high marks belonged to High and Middle schools, and many securing low marks came from Primary schools. Heredity does not really play such an important part in fashioning the life of the child as environment. In holding this view, we are convincingly supported by the experience of English and American Reformatory schools.

they do so, they seek the company of the younger children. They come to the school at an advanced age, try to abscond from the school, and do more cramming work. They are usually shy and possess little power of observation.

It should not be concluded from the above statement that all these peculiarities are found collectively in one child. The fact is that some are noticeable in one child and some in another.

Causes and Remedies of Backwardness.—The reputation of a doctor rests chiefly upon his ability to arrive at proper diagnosis. Any complaint, which is properly diagnosed, can generally be successfully cured. And as a complaint may be due to no one particular cause but may be the result of many causes, similar is the case with backwardness in children.

Hereditary Causes.—Inherent defects are generally responsible for the mental deficiency of the child. The Tests help us, to a certain extent, in determining whether the defects are inherent or environmental.

The Proof of Physical and Mental Heredity.—We not only inherit from our parents and forefathers marked susceptibilities of the nervous system, but also fixed tendencies and peculiar mental capacities. For instance, the offspring of tall statured persons is generally tall. Similarly, it is quite likely that the issue of the deaf may be born devoid of the sense of hearing.

Examples of Hereditary Tendencies.—The German Bach family of talented musicians and composers and the remarkable powers of memory possessed by the members of the Macaulay family are significant examples of hereditary mental influences. Sir Francis Galton has also thrown sufficient light on this topic. As a result of investigations conducted by him 35 years ago, he found that in the generation of a family of 977 persons, 535 were able and

ages. Owing to our having very little time at our disposal, we had to be content with only two groups of 9 to 11 and 12 to 14. Fifty children were selected for each group in each school, but in some Primary schools only about 25 were available for the higher age group. In all 700 children were tested, which number may be considered sufficient for a preliminary survey like this. In most of the schools the Tests were carried out during the morning sessions to eliminate the element of fatigue. Moreover, to ensure reliable results, special supervision was resorted to. The nature of the work expected of the children was fully explained and care was taken to see that the work commenced and finished at the prescribed time The Headmasters of the schools concerned were requested to provide us with information regarding the community, religion, parental occupation and locality of the children tested, so that we may be in a position to trace their inherent and environmental influences. Unfortunately the requested information was very late in coming and hence we could not utilize such material as was received.

The Application of Mental Tests.—Mental capacities are measured with these Tests, which are not concerned with the scholastic instruction, but are utilized for the transference of children from one class to another, the enlistment of civil and military officers and employment of labour in factories. These Tests were found to be of immense value during the Great War in the enlisting and promoting of officers.

Peculiarities of Backward Children.—backward children, as a rule, possess weak constitutions and senses, and are mentally deficient and learn to speak very late and then too they speak with much hesitation. They are, generally, lethargic, peevish, morose, careless and less sensitive, and, having a limited range of information at their disposal, are not in a position to concentrate their attention for long. They do not take part in games with boys of their own age, but if

On behalf of the Government of Madras, Prof. Woodward conducted such Tests and has presented a comprehensive Report ("Psychological Tests of Mental Capacity") to Government. In Bombay too, persons interested in this problem have framed Tests in the main vernaculars with assistance from the Provincial Government.

Practical Work on Mental Tests carried out by the Sub-Committee :—The importance of practical work in any undertaking cannot be gainsaid. Therefore to make the investigations effective, it was decided that the mental capacities of children of certain local schools be tested. With the permission of the Divisional Inspector of Schools, Tests were carried out in the following schools :—

1. Government High School, Nampalli. 2. Government High School, Darul Uloom. 3. Government Middle School, Urdu Sharif. 4. Government Middle School, Gosha Mahal. 5. Government Primary School, Chaderghat. 6. Government Primary School, Narayanguda. 7. Islamia High School, Secunderabad 8. Primary School, Ghasmundi, Secunderabad,

The idea of selecting different types of schools was to determine the influence of the environment on "Mental Capacities".

The majority of those who obtained high marks were in the High and the Middle schools. From this it must not be inferred that the intelligent children go to these schools, while the backward children attend Primary schools. As a matter of fact, this difference is due to the environmental influences, which will be dealt with later.

In order to find out the inherent capacities, it was essential to frame mental Tests. As no work of this nature had been undertaken in Hyderabad before, we had perforce to have recourse to the Tests prevalent in Western countries. As far as possible, we modified these Tests to suit our local conditions. Five Tests were prepared for boys of 9 to 11, and 6 tests for those from 12 to 14. In both these sets of Tests, questions were graded in difficulty to suit the variation in

every year the intelligence of a child develops at a certain rate.

In spite of the great progress achieved hitherto, the science of Tests is still in its infancy. Therefore, it is the duty of educationists and psychologists to see that it attains perfection, and thereby becomes instrumental in advancing the cause of education and uplifting thousands of helpless children.

It will not be out of place here to describe these Tests briefly, as they are of considerable help in finding out the backward children and in moulding our methods of teaching according to the needs of such children. For children between the ages of 3 and 10, there are 6 problems for each year, for ages 11 and 12, there are 8 problems, and for ages 13 and 14, there are 6 problems. Besides, Tests are prepared for adults and superior adults. These Tests were tried on thousands of children and were based on their average capacity. If a child solves satisfactorily the problems prescribed for his age, he is given those of the higher age. Each problem solved counts two months towards his mental age. Adding all these gives his real age. For example, if an 8-year old child solves the Test for his age, he is given the 9 year Test. And if he correctly solves 3 questions of this Test, his mental age is considered to be 8½ years and if he succeeds in all the 9 year test questions and does 4 out of the 10 year Test, then his mental age is admitted to be 9 years and 8 months. Similarly we can find out how far the mental age of the backward child differs from his chronological age. To distinguish between the chronological and mental ages, Terman suggested the use of the Intelligence Quotient. This is obtained by dividing the mental age by the real age, and multiplying it by 100. Thus, the I. Q. of the average child will be 100.

Use of Mental Tests in India.—The Mogha Mission, Punjab, devised such Tests and tried them on thousands of students. Similar work has been carried out in Bengal.

ard and meritorious work. As a sequel to this work, nearly 30 institutions were established in Paris for the education of backward children.

In the year 1835, an enthusiastic and far-sighted Dutch pedagogue started a school in Amsterdam to meet the needs of backward children. This inspired Dr. Guggenluhl to start a similar institution at Interlaken (Switzerland). His untiring efforts led to the establishment of similar schools in Germany, France and England, and the public at large began to evince keen interest in respect of backward children. Gradually, special classes were opened, firstly at Halle (Germany) in 1863 and afterwards at Coire (Switzerland) in 1881. Switzerland was the pioneer country in this field as is evident from the orders which were issued requiring teachers to pay special attention to backward children.

A Short History of the Development of Mental Tests.—In 1904 the Minister for Education in France formed a Committee consisting of famous psychologists, including Binet and Simon, to investigate whether the backwardness of a child is due to environmental influences or inherent defects. These two outstanding psychologists devised special Tests to measure the mental capacities of the child. These Tests had nothing to do with scholastic information but were meant to find out the knowledge gained at home, at the play-ground, and in the company of friends. The Tests were framed for various ages. In 1905, 30 and in 1908, 65 Tests were issued which were meant for children between 3 and 13 years of age. In 1911 more Tests were issued with necessary modifications. Mr. Terman, an American psychologist, advantageously applied these Tests to 2000 school children and deduced useful results. Burt modified these Tests to suit English conditions. Through the scientific application of these Tests, Binet has convincingly proved that mental capacities can be measured as correctly as the dimensions of a room. He has also shown that

Who are the Backward Children.—Modern psychologists have graded mental capacity as Supernormal, Normal and Subnormal. The last group is further divided into the backward, the feeble-minded, the imbecile and the idiot.

The idiot is incapable of protecting himself against dangers. The imbecile can protect himself, but, owing to his inborn defect, is unable to earn his livelihood. The feeble-minded is capable of earning his living after special training.

Dr. Ley defines the backward child as one who cannot understand language like the normal child, nor adapt himself to his environment. Dr. Goddard says that the backward child is one who, because of some inborn physical or mental defects or because of some acquired defects, cannot compete with the normal child of his own age, nor can feel himself at home in the environment as the normal child does.

Binet and Simon are of opinion that a child who can speak and write and can express himself through speech and writing and also can understand others well, but whose mental age lags behind that of the normal child by two years, and who after the 9th year lags behind by 3 years, can be called Backward, because his mental make-up is greatly limited.

According to Dr. Cyril Burt, the backward child is one who has no special mental defect, yet, due to some reason or other, can neither pull on with his class nor is able to cover the Primary course with ease. The Report of the Mental Deficiency Committee of 1920 considers that the child whose mental age falls short by 15% of his chronological age may be termed as backward.

A Short History of the Education of Backward Children.—In the 19th century a famous French doctor named Itard tried to determine the mental capacities of backward children. On this topic he has produced a stand-

There is a saying: 'What is meat for one is poison for another'. It is necessary that the remedy prescribed should suit individual needs. The same is the case with the mind. If proper education is imparted, mental powers are developed, otherwise they are impaired. Hence, our contention that the students are not being fully benefited is based upon sound argument. The kind of education which is good for those whose capacities are normal is not suitable for backward children. The teacher, as a rule, chiefly takes into consideration the average student as a standard, but the fact is that a class comprises students of varying abilities, e. g., some intelligent students, a large number of normals and a good many backward students. Some investigators are of the opinion that a class of 35 students has 15 to 20 backward students, which means that the percentage of backward children is 50 or more.[1]

It is an open secret that the methods of teaching suitable for the average student will deprive the remaining 50% of the advantages thereof. The intelligent students need less explanation from the teacher than others. If the teacher tries to satisfy the backward children, then the intelligent and average boys having already grasped the portion done and having no further interest left in it, become restless and upset the discipline of the class. Therefore the teacher, having at heart the question of discipline and caring only for the progressive students, proceeds further and thus neglects the backward element in the class. Being alive to the dangers arising from the above-mentioned procedure of teaching, educationists have devised methods of teaching which lay special stress on the individual abilities of the students, e. g. Kindergarten, Project Method, Montessori System, Dalton Plan, Garey System, etc. In short, our method of teaching is only meant for the average student, and that is the reason why the backward child is not in a position to avail himself fully of the methods in vogue.

1 *Vide* The Problem of Backward Students in School—'The Punjab Educational Journal', February, 1933.

are neglected, an irreparable harm is likely to be done to society.

Recent investigations carried out in England reveal the fact that there are nearly 3 lakhs of backward and retarded children in that country. Every effort is being made to improve their mental capacities, so that the nation may not ultimately suffer on their account. Experienced teachers are well aware of the fact that an average class has no less than 10% backward children. The Children's Department of the Institute of Medical Psychology of England has quite recently, after testing 200 children from 5 to 16, arrived at the conclusion that 50 out of these were technically backward.

The general attitude at present adopted in our schools towards backward children is to deprive them of annual promotions. This has a bad effect both on the teacher and the taught. The teacher becomes doubtful of the efficacy of his own methods of teaching and thinks that the retarded condition of the children is mainly due to his faulty methods. Seeing the bad results of the older element in the class, the younger ones also become doubtful of their success and thus lose confidence in themselves. Obviously such a state of affairs proves discouraging and hinders their progress. Besides, the mixing of the older pupils with the younger ones is inadvisable on various grounds. Nor do the backward ones profit by such amalgamation, because they lose their interest by the repetition of the same course in the same class for years together. Lack of interest is detrimental to acquisition of learning. Thus they lose their self-respect and develop a kind of inferiority complex. Besides, they are discouraged on observing that the younger children are praised while they are neglected. Interest and expectation of success are the two main elements which enable the students to surmount all sorts of difficulties cheerfully, and in the absence of these two even the hardest toil proves fruitless.

Report on The Education of "Backward" Children.

[The Hyderabad Teachers' Association has for several years been strenuously endeavouring to advance the cause of education in the State and has done much in infusing a new spirit. Last year the Association appointed a Committee to enquire into the causes of backwardness and suggest remedies therefor. This Committee was composed of the following members:—

1. Mr. Salim Bin Sayeed, B. A., B. T., Head Master, Govt. High School, Darus Shifa. Chairman.
2. ,, Noorul Hasan, B. A., B. T., Dip. Ed. (Glasgow), First Assistant, Nampalli High School.
3. ,, Fakrul Hasan, B. A., B. T., Chanchalaguda High School.
4. ,, Faiz Mohamed, B. A., Dip. Ed. (Osmania), Assistant, Nampalli High School.
5. ,, Gulam Dastagir, B. A., Dip. Ed. (Osmania), Assistant, Darus Shifa High School, Secretary,

Owing to unavoidable circumstances, Mr. Fakhrul Hasan was not able to help the Committee with his experience. Consequently, help, which proved very valuable, was obtained from Mr. Abdur Razak, M. Ed. (Leeds), Principal, Islamiah High School and Dr. D. D. Shendarkar, Ph. D. (London), Lecturer, Osmania Training College. Early in September, 1933, the Chairman left for England and I was nominated to the Chair. Several meetings were held at which the members of the Committee, who had studied the problem in their training courses, presented their ideas and suggestions. The credit of the major portion of the suggestions contained in the report goes to Mr. Nurul Hasan.—*Mujtaba Husain Nakvi.*]

Introduction.—Society can rightly be compared to the functioning of the physiological organs of the human body. The body can only develop when all its component parts are functioning harmoniously. But if the slightest defect occurs in any one of its parts, then its satisfactory development is greatly impaired. The same analogy holds good in the case of society. Now society comprises various kinds of individuals, e. g, the normal, the backward, the feeble-minded, the imbecile and the idiot. The last two groups constitute such a minority that they can be overlooked without much harm to society. On the other hand, those who are backward form a large part of society, and if these

sely populated regions of western Jutland, the teachers look after the cleansing of schools and are paid for it.

Teachers' Gardens.—Danish people, as a rule, are very fond of gardening and every house possesses a small well-kept house garden.

The Danish educational authorities make sure that a garden is attached to each teacher's home to make his living complete and happy, and to give him more income. Under the law the headmaster is entitled to at least ⅓ acre and assistant teachers to ¼ acre of land for a garden. The garden is much more than a vegetable garden ; it is more or less a permanent plantation. Teachers are expected to fence it properly and to plant fruit trees and flowers. The community bears the expenses of planing and planting. These gardens are used for class purposes also and children work side by side with the teachers, learning lessons from plant, leaf and flowers, and it is from this kind of work that the children acquire their first love of nature.

Every Danish school possesses a play-ground and a gymnasium. A detailed description of these will be given in the Chapter on Physical Education.

(To be Continued).

these schools, provided the teachers' salaries correspond to those of State schools. In Copenhagen the cost of education in high schools is nearly 660 kroners per head.

School Buildings.

In Denmark even in the smallest villages the schools possess their own buildings, and hardly any school is found in a rented building. No school is entitled to any State aid unless it proves that it possesses a school building according to the regulations in force. As a result of all this, schools possess adequate and suitable buildings. The building question being an important one is not left with the local school boards, but all building construction must conform to the ministerial regulations. The fearful spread of tuberculosis some years back led the Ministry to take strong action for the provision of sanitary school buildings. According to the Circular of 1900 from the Ministry of Education, the building site must be "large, sightly and sanitary". Each class-room must be large, well-lighted and well-ventilated. The height of the ceiling must be not less than 10 ft. Class-rooms in elementry schools must contain a minimum air space from 4 to 5 thousand cubic feet, which is based on a maximum of 35 pupils to the room. Many class rooms are supplied with racks and lockers with at least 3 sq. ft. of floor space for each child. The Danish rural and urban school buildings are substantially built and many of them are very attractive from the architectural point of view. All the new buildings are well supplied with modern and sanitary conveniences. The building material commonly used consists of bricks and reinforced concrete, tile and slate roof being common.

Sanitary condition of school building.—The schools are kept very clean and tidy. Even in the smallest country school teachers have nothing to do with the actual cleaning work. Janitors are employed for this purpose who are often women. In a few district schools, especially in the spar-

need. One half of the amount of the old age pensions within the amt is defrayed from permanent fund, and the pay of certain provision teachers is also paid and aid is given to schools for household economics and evening schools

Local Taxation—This is the chief source of school maintenance. The commune with its several school districts is the basis and is responsible for the general maintenance of the local schools, erecting the necessary buildings and keeping them in repair, furnishing all necessary school furniture and paying the original salaries of permanent teachers and regular assistant teachers.

Except in a few urban municipalities, elementary education is free. In most of the schools even text-books, exercise-books, pens, and pencils, etc. are provided free. The cost of elementary education in Copenhagen comes to 260 kroners per head.

Secondary schools in Denmark are Middle, Real and High Schools. Middle schools are either municipal or private. Municipal and Middle schools are maintained on the same principles as laid down under elementary schools. Private middle schools are run by fees and they get state aid on certain conditions. Real schools are also municipal and private and are maintained in the same way as middle schools. The cost of education in Secondary schools in Copenhagen comes to about 525 kroners per head.

High schools which are of 3 types *i. e.*, State, Municipal and Private are maintained entirely by State Funds. No proper fee is charged in these schools and the children of the poor are given free tuition, while the other parents pay a low progressive school tax. The municipal high schools are maintained by local or municipal tax and are subsidized by the State on the same lines as laid down for elementary schools. Private schools are run by fees which are generally high. State aid is also granted to

dual in the Kingdom. As education is both a national and local concern, both the nation and the local community must share the cost.

The maintenance of the rural schools may be discussed under three heads :

a. State Aid.
b. Permanent Funds.
c. Local Taxation.

a. State Aid.—Under the Ordinance of 1908, the State gives aid annually to the districts which have undertaken the construction of new buildings (including gymnasia) or teachers' homes or which have rebuilt an old building in compliance with law. The largest State aid is for teachers' salaries. The Government undertakes to pay all the fees in teachers' salaries above the initial salary paid by the communes. One half of the entire amount paid for the old age pension comes from the permanent amt funds. Large sums are also spent for the maintenance of school and teachers' libraries. The evening schools, of which hundreds are found in rural communities, are also maintained through Government aid. "Finally, the State extends direct aid to needy communes and even refunds one half of the total amount which the permanent amt fund may annually use for the needy communes within the amt".

Permanent Funds.—As early as 1814, a permanent fund was organised, the chief aim of which was to extend the aid to needy teachers. This fund was collected in three ways :—

a. By direct taxes ; b. by subscriptions from teachers ; c. by sale of certain old school buildings and school plants.

In 1856 the teachers' aid was abolished. Now the chief source of the fund is the sale of certain school lots and direct appropriation by the Amt Council, and the general object of the fund is to give equal opportunities within the amt by giving help to several communes according to

Ministry also employs a national *Konsulent* who gives advice on legal matters that come up for discussion and proposes improvements and alterations in the school system. There are educational specialists attached to the Ministry for Music, Gymnastics, Sloyd, Drawing, etc., who give expert advice and work as general Inspectors.

The powers and duties of the Ministry are the following :—

a. To interpret and enforce all educational courses passed by the national Rigsdag.

b. To prescribe rules and regulations for all schools.

c. To decide questions of difference which may arise in lower administrative circles.

d. To recommend the necessary school legislation.

Elementary Schools.—The municipal elementry schools are primarily under the local school bodies, which are three-local boards of education, town councils and district boards. The town council votes the necessary funds, the local board of education looks after the daily administration and the district board of education appoints teachers. The Ministry of Education has the chief supervision which is carried out with the aid of an educational adviser appointed for the purpose.

Middle and Real Schools.—The supervision of these schools is carried on by the Education Department with the help of an educational inspector, who is the adviser of the Department and who, together with a number of assistants, inspects the schools in person.

High Schools.—These are also under the Education Department. An Inspector, who is the adviser of the Department, inspects the schools with the help of several assistants.

Educational Finance.—The Danish system of taxation for school purposes is based on the principle that the whole population is responsible for the education of every indivi-

kroners have to pay a fee in proportion to their income, the maximum fee being 16 kroners per month.

While in the school, I watched a lesson being given in English in one of the middle school classes. The teacher in charge of the school was Mr. Bruun, a young man with whom I made acquaintance later on, and to whom I am indebted for supplying me with the necessary information about the school. The lesson was made highly interesting by conversation. One boy read a paragraph from the book which dealt with the times of different meals such as breakfast, lunch and dinner. After the paragraph was read the teacher led a conversation as to the different meals which English people take and the things they eat at different meals. These were then compared with the Danish meals. The boys carried on the conversation very well and spoke in complete sentences. Whenever an answer was a simple 'yes' or 'no', the teacher insisted on having a full sentence. The pupils read and spoke English with an accuracy often absent in Indian schools and their articulation and pronunciation were as perfect as could be desired. From this one lesson that I watched I concluded that the teaching of other subjects also must be of an efficient nature and a high order, the teachers knowing their job well. It might be mentioned that the text books used in English were not of any English firm but were written and printed in Denmark.

Administration and Maintenance of Schools.

The administration is rather complicated. Since 1845 the administration of public education has been vested in the Ministry of Education. The Ministry has two departments—one for elementary schools and the other for secondary schools, the University and the vocational colleges. The officials of the departments are partly Jurists who undertake especially the legal and economical administration of the schools, and partly professional educators, representing the pedagogical side of school administration. The

and non-alcoholic beer can be had from the school porter on payment of a very moderate price. The staff consists of, besides Mr. Henrik Madsen, the School Director (Head-Master), 11 permanent teachers and a few extra teachers for Drawing and Gymnastics. Most of the teachers are University graduates highly trained and efficient in their work.

The school possesses a building of its own which was finished a year ago at a cost of 560,000 kroners and possesses the following accommodation :—

(1) 11 Class rooms; (2) 2 Physical laboratories; (3) Chemical laboratory; (4) Geography room; (5) Natural History room; (6) Library room; (7) Festival hall; (8) Gymnasium; (9) Principal's room; (10) Vice-Principal's rooms; (11) Staff room; (12) Bath room and dressing room for pupils.

The class rooms are large, with perfect arrangements for light and air, and can easily accommodate 30 pupils each. They are furnished with all the up-to-date necessary furniture. Physical and chemical laboratories, which are meant both for middle and high school sections, are fitted with work-tables for the pupils, who do practical work and perform experiments themselves. Geography and Natural History rooms are equipped elaborately with maps, charts, specimens and stuffed birds, etc. The magic lantern forms an important part of the equipment and is often used by teachers in illustrating their lessons. The library has a reading room attached to it, and is often used for giving lessons in history and literature. The gymnasium is large and thoroughly up-to-date; a large bath room, shower-baths and a dressing room adjoin it. All the pupils are compelled to take a bath after gymnastics.

The yearly expenditure of the school comes to about 150,000 kroners, of which nearly 100,000 kroners are spent on teachers' salaries. Any pupil whose guardian has an annual income of less than 5,000 kroners is admitted free. All those pupils whose guardians earn more than 5,000

and Survey and a Technical Institute for Dentistry and Chemistry.

(c) To join the Army, Navy and Civil Services.

Nearly a thousand boys and girls graduate every year from different high schools at the early age of 18. Most of them take up employment the percentage of those who continue their studies further being small.

There are both public and private high schools controlled by the Education Department. In the State High Schools there are no fixed fees. Poor students are admitted free, while for others there is a progressive scale of fees. For example, students whose parents have an income of 4,000 kroners per year pay 16 kroners per month. A number of scholarships are also given every year. Private schools are more expensive, though even in these the fees are controlled by Government.

The writer visited a few high schools during his stay in Denmark. The following description of St. Jorgen's Gymnasium (St. George's High School) will give the readers an idea of Danish High Schools :—

This is a State school for boys only and consists of a middle section, a *Real Klasse* and three high school classes. It prepares pupils for language and mathematical courses, there being no arrangement for the history course. The total strength of the school is about 225. There are altogether 8 classes in the school, of which 4 are in the middle section, one is the Real Class and 3 high school classes. The working hours are from 9 a. m. to 3 p. m. Each period is of 50 minutes, at the end of which there is a break of 10 minutes. At 11 a. m. the pupils get an interval of 25 minutes—15 minutes for lunch and 10 minutes for play or rest. Boys carry with them light refreshments, such as sandwiches, bread and butter, fruits etc. wrapped up in clean paper. Coffee, mineral waters

This course is generally taken by those who wish to take up classical languages at the University. Very few pupils choose this course.

B. Modern Languages Course—(1) Danish (same as for classical course) ; (2) English and German ; (3) French ; (4) Latin ; (5) History ; (6) Natural Science ; (7) Mathematics ; (8) Singing ; (9) Gymnastics.

This course is chosen by those who wish to take the degree in modern languages in the University.

C. Scientific Course—(1) Mathematics (Algebra, Trigonometry and Stereometry) ; (2) Physics and Chemistry.

Other subjects are the same as for classical and modern languages courses.

It might be mentioned that the syllabuses of the different subjects are heavy and the standard of the examination is high. The High School Leaving Certificate Examination of the Danish schools can easily be put down as equivalent to our B. A. Degree. The University training in Denmark is something like post-graduate study of Indian Universities.

The School Leaving Examination.

Candidates for all the 3 courses have to satisfy the examiner in Danish Composition. Students of the Classical course have to offer a written examination in Latin, those of the modern language course take a written examination in English and German, while the pupils of the mathematics course have to answer a paper in mathematics. In other subjects an oral examination takes place. All examination papers are valued by examiners appointed by the Inspector General of Schools, who also appoints external examiners for oral examinations. Examinations are severe tests of one's ability and those who pass are considered qualified for the following :

(a) To join the University.

(b) To join the State Colleges of Engineering, Veterinary College, Training Institutes for Forestry

The Danish Educational System

BY

SYED MOHAMED HUSAIN JAFERI, B. A. (Oxon),

Deputy Director of Public Instruction, Hyderabad-Deccan.

(Continued from the July—September issue, Vol. viii, *No. 1)*

III

GYMNASIUM (HIGH SCHOOLS).

The Gymnasium, which is something like our high school, has a three years' course. To this only those pupils are admitted who have passed the Middle School Examination with credit and are considered fit for further studies. The Danish school authorities are very strict in this matter. They take care that incapable pupils do not get into higher institutions and thus waste their time and energy by failing year after year. They advise such pupils to enter other lines for which they are found fit. Pupils generally enter the high school at the age of 15 and remain there for 3 years, *i. e.*, till 18.

Usually, in a high school there are middle school classes also, as in our high schools. There are private as well as municipal and state high schools. There are 33 state high schools, 13 municipal schools and 10 private high schools. Of these 12 are boys' schools, 10 girls' schools and 33 mixed schools, which both boys and girls attend.

The following three kinds of courses are offered in a high school:—

A. Classical Course—(1) Latin and Greek; (2) Danish (with Norwegian, Sweedish and Old Norse, and History of Danish language); (3) French; (4) English or German; (5) History with Sociology; (6) Classical Art and Literature; (7) Natural Science, (Zoology, Physiology and Astronomy); (8) Mathematics; (9) Religion (10) Music; (11) Gymnastics.

here and there, adopt bodily their system of technical education. In this, as in other matters, we have to experiment a great deal before we can discover that which suits the peculiar conditions of our country best.

No realm of human activity needs frequent modifications more than that of education which deals with living and constantly changing factors, and in our country that is the one sphere of life that has undergone the least change in the last fifty years.

The time has now come when we should make a minute survey of our educational needs, and find out what changes we have to make in our present system so as to ensure a really great future for our land. Had I the means at my disposal, I would immediately institute this enquiry, for I know that real freedom must be based on a sound system of education and not on intricate constitutions which are the result of laboured ingenuity. The enquiry should be conducted by our own countrymen, for no one who is not of our land can understand those subtle differences of culture and sentiment which, though invisible, yet play an important part in the evolution of a people. They have to be treated with sympathy if we are to give to our country a system of education which deals with the realities of life, and not with conditions that have no existence.

Ladies and Gentlemen, I have now indicated for your consideration as briefly as I could what seem to me to be the main problems of education that demand our most immediate attention. They have to be solved if our motherland is to acquire in this world that position of honour which we all so ardently desire as being worthy of her great and glorious past.

In the new India that is now slowly coming into being all this must be changed. The Universities must be brought into close contact with the harsh realities of life. and their present seclusion ended once for all. Unless this is done we shall not be able to organise our intellectual life on a rational basis, and the chaos which exists today will continue to the detriment of all that we consider of value in the different cultures that have been evolved in our country.

Lest I be misunderstood, I should like to make it clear that I do not deny that in some universities first class work is being done, but what I do maintain is that the work they are doing is so removed from the actualities of life in our country that it does nothing to enrich our heritage. With their continued use of a foreign language as the medium of instruction and of work, our professors are unable to pass on to a large section of their fellow countrymen the benefit of their researches, with the result that the rays of learning that occasionally emanate from our universities illumine distant lands but leave their own surroundings in utter darkness.

Another important problem that should engage the earnest attention of our educationists is that of evolving a properly co-ordinated system of vocational training for such of our young men as are not likely to derive any real benefit from university education as it exists at present.

The provision that we have for such taining is most inadequate. In my opinion it ought to be made possible for a boy, after he has passed out of the primary school, to continue his education right up to the university stage in institutions where he can receive instruction in technical and industrial subjects.

I do not think that in this we can do better than follow the example of Japan, for we can, with slight modification

to remain ignorant of that which the other half are doing. Moreover, the sacred realm of education should remain free from that hierarchical view which, besides being out of date, has already done considerable harm to our country. Let those engaged in the noble work of education set an example for the rest by forming themselves into a fraternity that ignores all differences of caste or creed.

In this connection I would suggest the creation of a fund from which every year help should be given to teachers that desire to visit foreign countries with the object of improving their knowledge of educational methods. This fund should be controlled by a small committee oi experts with power to select the most suitable candidate from amongst the applicants. If the sum of Rs. 6,000/- could be collected every year one teacher could easily spend twelve months outside India. Such funds exist in many countries, and have been of great help not only in improving the quality of the work of the teachers but also in raising their prestige in society.

If now we turn to our universities, we find in them the same air of unreality as in our schools. They represent nothing and reflect nothing—not even the culture of the localities in which they are situated. With the exception of three, all of them are what I call paper-made universities. They embody no ideals and therefore leave no impress on the lives of their pupils. They have remained impervious to the pulsating life that surrounds them, and have for that reason contributed nothing of value towards the solution of the many intricate problems with which our people are today faced. They remain hollow copies of a foreign model, and are themselves shyly conscious of this fact. Our young men regard them as so many windows from where tickets are issued in the form of degrees which they imagine will enable them to start on their bread-earning journey.

shall probably have to evolve a system which, whilst representing a compromise between the two views, would itself possess great elasticity and be capable of easy modification to suit the varying needs of the different groups.

As the right type of education spreads amongst our women, the tone and discipline of our schools too will automatically improve. Teachers will not then have to deal with children ignorant of even the rudiments of discipline; and mothers in their homes will be able to supplement the work done in the school better than they can today. Another happy result of this will be that even the comparatively short time spent by pupils in the Primary schools will leave a more lasting impression on their lives than it does at present when most of them unfortunately again lapse into almost complete illiteracy.

While speaking of school teachers, let me draw your attention to their present status in our society. It is both un-Indian and un-Oriental, and offers a sad commentary on that almost complete destruction of social values which has resulted from our trying to adopt as our own a culture that will always remain for us exotic. My meaning will become clear if you compare their status today with that of the Pandits or Moulvis in, let us say, the eighteenth century. The honour of the teaching profession demands that the present unsatisfactory position should be improved; and though personal character has ultimately a great deal to do with it, yet much can be achieved by bringing about a closer unity amongst the different branches of the teaching profession—from the elementary school right up to the University. I know of no organisation that is better fitted to undertake this work than the Federation under the auspices of which this Conference is being held today.

Educational work is in its essence incapable of being divided into water-tight compartments, and ceases to produce adequate results if one half of the workers are allowed

Ladies and Gentlemen, to me women are the custodians of the culture of their race, and if through a faulty system of education they begin to feel that what they have inherited from their race has no merit, then nothing can ever regain for that race that self-respect without which in my opinion it can find no moral basis for its life. Denationalisation in the young men of a country is bad enough, but if it spreads to its young women it becomes a fatal disease.

Let us not forget that women as the first educators of children have a greater influence on the culture of a race than the men have, and all questions that affect their education affect radically the culture of the whole race. We who are anxious to see our country make more rapid progress can no longer afford to leave the question of their education in its present state of ambiguity We have to decide whether in our new scheme of education, so far as it affects them, we should follow the example of Europe or of Japan. In the latter country, as you know, a difference has been made in the type of education that is imparted to men and that which is imparted to women. The change takes place after the Middle School stage is finished and continues right through what we would call the Collegiate stage. The Japanese have decided that their women should be taught all that is necessary for creating healthy homes and embellishing national culture, but should not compete with men in such spheres of activity as politics and administrative work. According to them, any activity that makes a woman less efficient as a mother weakens the nation, and as such should be discouraged in the interest of the nation as a whole. Modern Turkey, on the other hand, has decided to follow Europe, and does not believe in making the education of women necessarily different from that which has been planned for men.

The economic conditions in our country, however, are so different from those of Europe and Japan, and the cultural differences amongst its inhabitants so great, that we

Moreover, the mere use of a foreign language as medium of instruction amounts to a negation of that self-confidence which in my opinion must form the basis of all sound systems of education. It is bad also morally, for subconsciously it creates an inferiority complex not only in the taught but also in the teacher. More evils than most people suspect in our social life to-day can be traced to this very inferiority complex so unwittingly created by those that unfortunately for us planned our present system of education for narrowly utilitarian purposes. Nor can India ever be a free country in the real sense of the term so long as she allows the full power of expression inherent in her own languages to be cramped by the weight of a language that she can never treat as her own.

I hold the belief that each great culture of India as represented by a language has its own contribution to make towards raising her moral and intellectual prestige, and that it ought to be treated with that toleration which should form the basic characteristic of the educational system of a country which has for its inhabitants large groups of people speaking different languages and belonging to different races, castes, and creeds.

I now come to another matter which, though closely connected with that with which I have just dealt, forms nevertheless a problem of its own. I mean the question of the education of our women. Here too we continue to grope in the dark, in spite of the fact that its vital importance has long been known to us. We are making the same mistake in the education of our girls which we are now trying so hard to remedy in the case of our boys. Let us avoid this wastage of energy, and after careful consideration lay down a scheme of education for them which, whilst strengthening the social and economic life of our people, would also prove more soul-satisfying than that which we have hitherto followed so placidly.

the English language that it will be a great waste in more senses than one if we were to give it up. Nor should we forget the fact that for a large number of our countrymen who are engaged in political work and commercial undertakings, the English language has acquired the utility of a *lingua franca* and has thereby become an important factor in creating, at least partially, that sense of unity which is so necessary for the existence of our country as a political entity in the world.

There is no period in my life on which I look back with greater pleasure than that when I was working as a teacher in a school. But in spite of the fact that I was happy in that life I could never get rid of the idea that all that I was doing in the class room was nothing more than perhaps a fairly efficient piece of play-acting. I am sure that many of you also must have had the same feeling. The reason for this was that each time I tried to explain to my pupils anything that I considered of importance I had to do it in a language which was neither their mother-tongue nor mine. Later on when I became a professor in a college the same feeling continued to make me uncomfortable. I could never make myself believe that there was any reality behind the duties that I felt I was only mechanically performing.

The absence of this sense of reality is due to our present system of education which necessitates the use of a foreign language as the medium of instruction. It is also responsible for the poor results we have hitherto produced. They are pathetically insignificant if we take into consideration the enormous energy spent on them both by the students and the teachers. I ask you, can anything be more farcical than the sight of a man trying to teach the history of his own country to the boys of his own country in a language that is foreign both to him and to the boys whom he is teaching?

into the dim and almost invisible past that lies behind each culture. In everyday life this difference manifests itself most clearly in language and religion, and as according to my views India will always be in this respect a land of variety, and as in variety there can be no uniformity, I would in our educational system aim at unity which need not be inconsistent with variety.

The ancient cultures and languages of our great country can never be destroyed, but they can all be made to enrich human life and to serve, in their own way and in accordance with the inherent qualities which each possesses, the same main purpose, namely, the removal of ignorance which brings in its wake toleration and sympathy so essential for the happiness of mankind.

Perhaps the solution of the problem I have just stated lies in evolving for our country a system of education which, though international in appearance, will nevertheless be national in the broadest sense of the word. Here I come to the question: What is national education? This question I have answered only partly by defining it as the education of the people of a country, by the people of that country, in the language of that country; and this in its turn brings me to the vexed problem of the medium of instruction

On this point too my views are definite, namely, that if it is the main object of education to dispel ignorance by bringing correct knowledge within easy reach of the inhabitants of a country, then that can be done best by conveying that knowledge in the language which the inhabitants understand most easily. In other words, I am strongly in favour of using the main varnaculars of India as the media of instruction, provided that at the same time we make the study of the English language compulsory.

For several generations now we Indians have spent so much time and energy on understanding the illogicalities of

geously and definitely answerd, we shall grope in the dark as aimlessly in the future as we have been doing during the last thirty years.

No one is more opposed to the production of a standardised type than I am where education is concerned, but I also know that no educational efforts can ever give successful results if at least the main objectives aimed at are not carefully defined. Political activities have given rise to such conflicting movements that the time seems now ripe for our educationists to speak out in an unambiguous manner and thereby give a lead to the politicians.

It is my firm belief that the ultimate future of our land is to be shaped not by politicians but by those humble and silent men who work as teachers in the schools and colleges of our country. But as our educationists have acquired the habit of almost invariably condemning the present system of education without telling us what in their opinion should take its place, I venture to suggest that your Conference should appoint a Committee to draft for discussion next year a programme of national education as they conceive it. We have not yet made up our mind as to whether life in our country is to be national in character or international. In other words, is the culture of the India of the future to have only one colour or is it to consist of different colours forming, when taken together, one variegated but harmonious pattern ? It will be obvious to you that this is a very fundamental question, and that on its proper answer will depend the nature of the system of education that we have to evolve.

My own views on the subject are definite. I do not think that a time will ever come when India will be as homogenous a country as France or Japan. This is certainly an inconvenient fact, but it is one that has to be faced boldly and squarely. The size of our country is against it, as are also the hoary traditions that stretch far

The Ninth Session of the
All-India Educational Conference.
PRESIDENTIAL ADDRESS

BY

SIR ROSS MASOOD (NAWAB MASOOD JUNG BAHADUR),
Kt., L. L. D., BAR-AT-LAW,

(Vice-Chancellor, Aligarh Muslim University).

LADIES AND GENTLEMEN,

To one connected in any way with educational work no honour can be greater than that which you have conferred upon me today by inviting me to preside at this annual session of the All-India Educational Conference. For this honour I offer you my sincerest thanks.

The responsibility that you have placed on my shoulders is a heavy one, for, with the increasing complexities of human life and a more minute study of human psychology, the problems connected with education also are becoming more and more complex; and nowhere do they appear as inextricably tangled as they do in our country which is passing through a period of rapid transition leading perhaps to a radical transformation.

Education is in itself such a vast subject that, with all humility but with deep sincerity, I shall today place before you for your consideration only a few of those problems which seem to me to require the immediate attention of our educationists.

The first of these problems is that which is connected with the end we should have in view. We have not yet definitely answered the question: What is the type of human being that we wish our educational system to produce? It seems to me that until this question is coura-

THE HYDERABAD TEACHER

CONTENTS

PAGES.

PRESIDENTIAL ADDRESS BY SIR ROSS MASOOD (NAWAB MASOOD JUNG BDR.) KT. LL. D., Bar-at-Law 109

THE DANISH EDUCATIONAL SYSTEM BY SYED MOHAMED HUSAIN JAFERI, B. A., (Oxon), Deputy Director of Public Instruction, Hyderabad, Dn. 111

REPORT ON THE EDUCATION OF "BACKWARD" CHILDREN 121

THE PERSONALITY OF A TEACHER ... 137

REPORT ON SCHOOL GARDENS COMPETITION 140

NOTES & NEWS 141

REVIEW 146

EDITORIAL

PROPOSED REFORM OF INDIAN SCHOOL SYSTEM ... 147

THE EDUCATION OF BACKWARD CHILDREN ... 149

VOL. VIII. REGISTERED ASAFIA NO. 47. NO. 3.

THE

HYDERABAD TEACHER

JANUARY–MARCH, 1934.

Quarterly Magazine of the Teachers' Association,
Hyderabad-Deccan

Under the Patronage of
Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M. A.,
Director of Public Instruction.

Editorial Staff

S. ALI AKBAR M. A. (Cantab.), *Chief Editor.*
F. C. PHILIP, M. A.
M. ATAUR RAHMAN, B. A.

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD
1934.

Annual Subscription Rs. 3.

Vol. VIII. No. 3.

THE

HYDERABAD TEACHER

JANUARY—MARCH, 1934.

Editorial Staff

S. ALI AKBAR M. A. (Cantab.), *Chief Editor.*
F. C. PHILIP, M. A.
M. ATAUR RAHMAN, B. A.

SECUNDERABAD—DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD
1934.

جلد (۸) شمارہ (۴)

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خاں صاحب ایم اے ریگلر ناظم تعلیمات ممالک محروسۂ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مقاصد

(۱) طبقہ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔

(۲) طبقہ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔

(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔

(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)
صرف اردو حصہ (۱؎) سالانہ۔ قیمت فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲/) صرف اردو (۸/)

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب ضرورت تغیر بھی ہوسکے گا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔

(ہ) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔

(ہی) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ذیل رہے گا۔

نرخ اشتہار حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـہ	۸/ عہ	ے/
نصف صفحہ	صہ	۸/ عہ	۸/ عہ
ربع صفحہ	۸/ عہ	۶/ عہ	۱۵/
فی سطر	۱۰/	۸/	۶/

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوکر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتمم تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

جلد (۸) شمارہ (۴)

فہرست مضامین

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ خورداد لغایت امرداد ۱۳۴۳ف

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	ڈالٹن طریق تعلیم اور سائنس	عبدالحکیم صاحب ایم۔ ایس سی۔ ایل۔ ٹی مددگار دارالعلوم بلدہ	۲
۲	پروجکٹ میتھڈ	سید اللہ بخش صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی۔ مددگار دارالعلوم بلدہ	۱۹
۳	جان لاک	حبیب احمد فاروقی صاحب بی۔ اے۔ ڈپ ایڈ۔ مددگار عثمانیہ سنٹرل ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ بلدہ	۱۰
۴	کارگذاری انجمن اساتذہ بلدہ بابت ششماہی دوم ۱۳۴۳ف	میرزا ضیاءالدین بیگ صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ناظر تعلیمات مستقر بلدہ۔	۴۳
۵	تنقید و تبصرہ		۲۵
۶	طریقۂ تعلیم حساب	ڈی۔ سی۔ بھوگلے صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی۔	۲۷ تا ۸۱، ۱۰۱ تا ۱۱۲

ڈالٹن طریق تعلیم اور سائنس

(از مولوی عبدالحکیم صاحب ایم۔ ایس سی۔ ال۔ ٹی۔ مددگار فوقانیہ دارالعلوم حیدرآباد)

ڈالٹن طریق تعلیم کا آغاز اور اُس کی شہرت

ڈالٹن طریق تعلیم کی ابتدا امریکہ کے ایک ڈالٹن نامی ہائی اسکول میں ہوئی اور اس نئی طرز تعلیم کا نام بھی اس اسکول کے نام پر ڈالٹن پڑا۔ اس کی موجد مس ہیلن پارک ہرسٹ صاحبہ تھیں (Miss Helen Parkhurst) ہیں۔ جولائی ۱۹۲۲ء میں طریقہ تعلیم ڈالٹن پر ایک انگریزی کتاب (Education on Delton Plan) جس میں مس پارک ہرسٹ کے اصول تھے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی ڈالٹن طریق تعلیم پر دور اور نزدیک کے ممالک میں تجربات کئے جانے لگے۔ جاپان، جرمنی اور انگلستان نے اس طریقہ تعلیم کے متعلق خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور ٹوکیو کی شاہی یونیورسٹی نے مس پارک ہرسٹ کو اپنے یہاں مدعو کیا جہاں مس صاحبہ نے اس موضوع پر متعدد لکچر دیئے۔ انگلستان میں اس طریقہ نے بڑی سرعت سے مقبولیت حاصل کی اور متعدد کمیٹیاں اس طرز تعلیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قایم ہوئیں۔ خود ڈالٹن ہائی اسکول میں طلبہ اور اُن کے ورثا نے اس نئے طریقہ کے متعلق نہایت مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا۔ مس پارک ہرسٹ نے اس نئے طریقہ کے جاری ہونے کے چھ ماہ بعد اپنے اسٹاف کی ایک میٹنگ طلب کی۔ تاکہ وہ بحث مباحثہ کے بعد یہ معلوم کر سکے کہ جماعت واری پرانا طریقہ زیادہ بہتر تھا یا یہ نیا۔ اس میٹنگ سے طلبہ میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ وہ یہ سمجھے کہ اُن کو پھر قدیم جماعت واری طریقہ کے درس پر واپس لایا جارہا ہے۔ ان طلبہ نے بہ عجلت اپنی ایک علحدہ میٹنگ ترتیب دی اور اپنا ایک نمایندہ مس پارک ہرسٹ کی خدمت میں بھیجا۔ جس وقت یہ طالب علم مس پارک ہرسٹ کے پاس پہونچا اس وقت مس پارک ہرسٹ چند لوگوں کے ساتھ اپنے کمرے میں چاء پی رہی تھیں۔

مس پارک ہرسٹ اور ایک طالب علم کی گفتگو۔

طالب علم: میں معافی چاہتا ہوں۔ کیا آپ مہربانی کر کے مجھے اجازت دیجئے گا کہ میں آپ سے چند باتیں کر لوں۔

مس پارکہرسٹ ۔ یقینی کیا بات ہے ؟

طالب علم ۔ یہ ایک پرائیوٹ بات ہے ۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو متصل کے کمرے میں تشریف لے چلئے ۔

مس پارکہرسٹ فوراً دوسرے کمرے میں اس طالب علم کے ساتھ چلی گئیں ۔

طالب علم ۔ مس پارکہرسٹ میں نہیں چاہتا ہوں کہ میں آپ کے معاملات میں دخل دوں لیکن اسکول کے تمام طلبہ یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ موجودہ طرز تعلیم کو پسند نہیں کرتیں ۔ وہ اس کو بہت پسند کرتے ہیں اور انہوں نے مجھے آپ کے پاس اس غرض سے بھیجا ہے کہ میں آپ سے دریافت کرسکوں کہ آپ اس طریقہ کو کیوں نہیں پسند کرتیں ۔ کیا آپ اس نئے طریقے کی موافقت نہ کرینگی ۔ (زہر اس کے ساتھ) ؟

مس پارکہرسٹ ۔ میں نے اس لڑکے کو یقین دلایا کہ مجھے اس طریقہ سے نہایت دلچسپی ہے اور میں ہر امکانی طریقہ سے اس طریقہ کی موافقت کروں گی ۔

مندرجہ بالا گفتگو سے صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ ڈالٹن ہائی اسکول کے لڑکوں میں چھ ماہ کے اندر اس نئے طریقہ سے کتنی دلچسپی ہو گئی تھی ۔ اب میں اختصار کے ساتھ اس طریقہ تعلیم کے اصولوں کو بیان کرکے یہ بات واضح کروں گا کہ سائنس کی تعلیم میں اس طریقہ کا اطلاق عملی طور پر کیسے اور کس حد تک مفید ثابت ہو سکتا ہے ۔

ڈالٹن طریقہ تعلیم کے قواعد ۔ اس طرز تعلیم کے تحت سال کے مقررہ کام کو مہینوں اور ہفتوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے ۔ اور جماعت داری طلبہ کو ہر مہینہ کے شروع میں تمام ماہ کا کام ہفتہ واری تمسک کی صورت میں لکھ کر دیا جاتا ہے ۔ اس ہفتہ واری کام کو بھی چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر حصہ کا نام اکائی رہتا ہے ۔ اس تمسک میں لکھ دیا جاتا ہے کہ ہر طالب علم کو اس ماہ میں کسی خاص مضمون کے متعلق کیا پڑھنا ہے اور اس کو کیسے پڑھنا چاہئے ۔ اس کو پڑھنے کے لئے کن کن کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوگا ۔ ان کتابوں کے صفحات اور ابواب بالتفصیل درج رہتے ہیں ۔ تمسک میں یہ بھی لکھ دیا جاتا ہے کہ طالب علم کو تحریری اور یاد دہی کا کتنا کام کرنا اور کن تاریخوں میں ان کو ضروری ہدایت سننے کے واسطے ایک جگہ یکجا ہونا پڑے گا ۔ طالب علم کو ایک گراف دے دیا جاتا ہے اور وہ روزانہ ختم شدہ کام کو اکائیوں کی صورت میں مضمون واری درج کرتا جاتا ہے ۔ ایک ایسا ہی گراف اس مضمون کے کمرے میں استاد کے سامنے دیوار سے لٹکا رہتا ہے اور ہر طالب علم اپنے نام کے محاذی اپنے ختم شدہ کام کو جتنا کہ وہ اپنے گراف میں درج کرتا ہے ۔ اس گراف میں بھی اندراج

کر دیتا ہے۔ اس طرح پر گویا کہ لکچر کے کمرے مضمون کے کمروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہر مضمون کے لئے علیحدہ علیحدہ کمرے ہوتے ہیں اور ان کمروں میں اس مضمون کے متعلق ایک لائبریری ہوتی ہے اور اس کا ایک استاد رہتا ہے۔

اُستاد کی حیثیت جس کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ طلبہ کے واسطے تمسک تیار کرے۔ دوران مطالعہ میں آنے والی مشکلات کو حل کرے۔ ان کے تحریری کام کو دیکھے۔ ختم شدہ کام کا اپنے سامنے گراف میں اندراج کرائے اور اگر ضرورت سمجھے تو ختم شدہ کام پر اس طالب علم سے ایک یا دو سوال بھی کرے تاکہ اس امر کا یقین ہو جائے کہ طالب علم نے حقیقتاً اس کام کو انجام دیا یا نہیں لیکن یہ طریقہ صرف شاذ و نادر موقعوں پر عمل میں لایا جائے ورنہ طلبہ میں خودداری کا احساس باقی نہیں رہے گا۔ اور وہ کام کو اپنا فرض سمجھ کر انجام نہ دینگے بلکہ استاد کے خوف اور ڈر سے۔ اگر کوئی طالب علم کام کرتے کرتے تھک جائے تو وہ کسی دوسرے مضمون کے کمرے میں جا سکتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم صرف ایک یا دو مضامین مقررہ میعاد سے قبل ختم کر لے تو اس وقت تک اس کو نیا تمسک نہیں دیا جاتا جب تک وہ تفویض شدہ تمسک کے تمام مضامین کو ختم نہ کر لے۔ ہاں اگر وہ اس ماہ کے تمام مضامین مقررہ میعاد سے قبل ختم کر لے تو ایسی صورت میں اس کو دوسرے ماہ کا تمسک دے دیا جاتا ہے۔ اگر وہ سال کے مقررہ کام کو سال سے دو چار ماہ قبل ختم کر لے تو اس کو اوپر کی جماعت کے پہلے مہینے کا کام دیا جائے گا۔ بشرطیکہ ختم شدہ کام میں استاد کو پورا اطمینان دلا دے۔ اس طرح پر گویا اس کو اوپر کی جماعت میں ترقی دے دی جاتی ہے۔

ڈالٹن طریق تعلیم کا مدعا اس طرز تعلیم کا مدعا یہ ہے کہ لڑکے کو خود آزادی کے ساتھ اپنی ذمہ داری پر کام کرنے کا موقع ملے۔ ذاتی سعی اور کام ہی بڑا معلم ہے۔ لڑکے کو آزادی یہ رہتی ہے کہ وہ اپنی دماغی قابلیت کے لحاظ سے کسی بات کو سمجھنے اور انجام دینے کے واسطے جو رفتار اپنے واسطے مناسب سمجھتا ہے، اختیار کرتا ہے۔ لیکن جماعت واری طریقہ میں کلاس کے ہر طالب علم کو ایک رفتار پر چلنا پڑتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جماعت کے تمام لڑکے دماغی اور جسمانی حیثیت سے یکساں نہیں ہوتے کچھ لڑکے ایسے ذہین ہوتے ہیں کہ وہ استاد کی بات کو فوراً سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے لڑکے بھی ہوتے ہیں کہ اُستاد ایک بات کو متعدد مرتبہ سمجھاتا ہے اور وہ تب بھی نہیں سمجھتے۔ ایسی صورتوں میں ذہین طلبہ کو غبی طلبہ کے خاطر مجبوراً انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اور ایک ہی بات کو بار بار سنتے سنتے اُن کی دل چسپی بھی زائل ہو جاتی

ہے جس کا اثر اکثر کلاس کے ضبط پر بُرا پڑتا ہے۔ کمزور طالب علم کو بھی بار بار جماعت کے سامنے اس امر کا اظہار کرتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے کہ وہ استاد کی بات کو سمجھ نہیں رہا ہے۔ وہ خاموش بیٹھا رہتا اور اپنی کمزوری کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کو جماعت کے ساتھ بیٹھنے میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ اور اکثر وہ پڑھائی کو خدا حافظ کہہ کر اسکول سے بھاگ نکلتا ہے۔ ڈالٹن پلان کے تحت طالب علم کتاب کو اپنا معلم قرار دیتا ہے۔ اگر کسی بات کو پہلی مرتبہ سمجھ نہیں سکتا ہے تو دوبارہ سہ بارہ خاموشی سے اس کو پڑھتا اور سمجھ لیتا ہے۔ اگر اس کوشش کے بعد بھی ناکامیاب رہتا ہے تو یا تو اپنے ہم سبق لڑکوں سے اس بات کو سمجھ لیتا ہے یا استاد متعلقہ سے۔ اس طرح تیز لڑکوں کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنے کمزور ساتھی کی مدد کریں۔ اور اُستاد بھی کمزور طلبہ کو بغیر ذہین اور تیز طلبہ کا ہرج کئے زیادہ وقت دے سکتا ہے۔

ایک سائنس ٹیچر کے خیالات

ایک سائنس ٹیچر ڈالٹن پلان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:-

ڈالٹن طریق تعلیم کے تحت کام کرنے میں استاد کو ایک ایسی فضا سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو بالکل نئی اور مسرت افزا ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ طلبا کی ایک بڑی تعداد شوق اور ذوق کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہے۔ اس طریقہ کے تحت استاد کی حیثیت مثل ایک حقیقی مددگار اور مخلص دوست کی سی ہو جاتی ہے۔

طلبہ اپنے اپنے سوالات استاد کے سامنے بلا تکلف لاتے ہیں اور فرداً فرداً یا دو دو چار چار کے گروہ اپنی مشکلات حل کراتے رہتے ہیں۔ طلبہ اب استاد کی نکتہ چینیوں سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے مقررہ کام کو پورا کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ ہر طالب علم اپنے کام کو استاد کے سامنے ایک نئی صورت میں لاتا ہے۔ اس سے استاد کا کام بھی زیادہ دلچسپ بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس جماعت واری طریقہ میں اُستاد کثافت اضافی۔ حرارت دماغی اور سائنس کے دوسرے اسباق کو سالہا سال ایک بندھے ہوئے طریقہ پر مقررہ اصطلاحوں میں پڑھاتے پڑھاتے کچھ بے حس سا ہو جاتا ہے۔ اور اس کو اپنے کام سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ علاوہ اس کے جو طلبہ ڈالٹن پلان کے تحت کام کرتے ہیں اُن کو اپنے ہی وسائل پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے اور اپنے کام کو کامیاب بنانے میں انہیں اپنے دماغوں پر زور دینا پڑتا ہے۔ ماہواری تمسک اُن کے زاویہ نگاہ کو وسیع کر دیتا ہے اُن کی نظروں میں اس عمارت

کا پورا نقشہ رہتا ہے۔ جسے وہ تعمیر کرنے جا رہے ہیں۔"

سائنس اور ڈالٹن پلان

اس میں شک نہیں کہ اگر کسی کو حقیقی معنی میں سائنس کی تعلیم حاصل کرنا ہے تو اس کو عملی تجربات اور کتب بینی میں تساہلی نہ کرنا چاہئے۔ نیوٹن، گیلیلیو، ڈارون، مارکونی یا اور دوسرے علما سائنس پر نظر ڈالئے۔ ہر ایک کو کتب بینی اور عملی تجربات کا (جو صرف تجسس اور تحقیق کی خاطر کئے جاتے تھے) شوقین پائے گا۔ سائنس کے دقیق اور دل چسپ اصولوں کو سمجھنے کے لئے اس امر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے کہ خیالات میں یکسوئی ہو اور جلد بازی سے کام نہ کیا جائے۔ یہ بات صرف اسی وقت ممکن ہوتی ہے جب کتاب ہماری معلم ہو اور ہم خاموش اور دل لگا کر اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اکثر ماہرین فن کا خیال ہے کہ مسٹر آرم اسٹرانگ کا ایجاد کردہ ہیورسٹک (Heuristic) طریقہ تعلیم سائنس کے واسطے بہترین طریقہ ہے لیکن ایک بڑا اعتراض اس طریق تعلیم کے متعلق یہ ہے کہ لڑکا ان تمام معلومات اور انکشافات سے محروم کر دیا جاتا ہے جو دنیا میں ابتک معلوم کئے جا چکے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ڈالٹن طریق تعلیم میں وہ تمام حقیقتیں اور خوبیاں موجود ہیں جو ہیورسٹک (Heuristic) میں ہیں۔

ہیورسٹک طریقہ اور ڈالٹن طریق تعلیم

کیونکہ اس طرز تعلیم کے تحت سائنس کے مسائل حل کرنے میں جتنی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ طالب علم خود جمع کرتا ہے۔ ان کی تنظیم کرتا اور مشاہدہ اور استدلال کے ذریعہ نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ طالب علم کام کو تکمیل کرنے کے لئے اپنا طریق کار خود سوچتا ہے اور استاد کا بنایا ہوا اسائنمنٹ اس کی رہبری کرتا ہے۔ اس طرح سے بچہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا خود سیکھتا ہے۔ ہر ایک محقق اور موجد نے اپنے ہمعصر اور زمانہ ماضیہ کے علماء کے معلومات سے استفادہ کیا۔ تجسس اور تحقیق کے لئے گہرے معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ دوران کام میں جو پیچیدہ سوالات پیدا ہوں ان کو حل کیا جا سکے۔ زیادہ تر ایجادات اور تحقیقات صرف ایک دماغ کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ وہ مختلف زمانوں کے علمائے سائنس کی سعی اور کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اس طرح پر ڈالٹن طریق تعلیم ہیورسٹک طریقہ سے زیادہ قابل عمل ہے۔ اور اس نظریہ کی بھی تکمیل کر دیتا ہے جو ہیورسٹک کے مدنظر ہے۔

سائنس کا ایک نامکمل نوٹ

اکثر مدارس میں یہ دیکھا گیا اور مضمون سائنس میں یہ خصوصیت پائی گئی کہ اساتذہ صاحبان طلبہ کو چند نامکمل نوٹس لکھا دیتے ہیں اور طلبہ انہیں نوٹس پر اکتفا کر کے سائنس کی ایک کتاب بھی پڑھنا تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ ذیل میں

بطور نمونہ ایک نوٹ کی نقل دی جاتی ہے۔

قوت ــــ قوت وہ ہے جو کسی جسم کی حالتِ حرکت کو حالتِ سکون میں یا حالتِ سکون کو حالت حرکت میں بدل دے یا بدل دینے کے متقاضی ہو۔ کائنات میں چار قوتیں عمل کرتی ہیں وہ یہ ہیں (۱) قوت اتصال جو مادی چیزوں کے ذرات کو آپس میں ملاتی ہے۔ (۲) چپک ایک ایسی کشش ہے جو مادہ کے غیر مشابہ ذرّوں پر عمل کرتی ہے جیسے کاغذ گوند سے لکڑی پر چپک جاتا ہے۔ (۳) کیمیائی عمل اور اس کی لفظی تعریف۔ (۴) کشش ثقل جس کی وجہ سے زمین ہر مادی چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے رٹ لینے والے نوٹس سے طلبہ میں کسی قسم کی تربیت کی کیا اُمید کی جاسکتی ہے۔ اُن کی سائنس چند ورقوں کی نوٹ بک پر ختم ہو جاتی ہے۔ اب ذیل میں ڈالٹن پلان کا ایک تمسک بطور نمونہ دیا جاتا ہے۔

ہفتہ واری تمسک کے نمونے (طبیعات)

تمسک (۱)

گریڈ ہشتم — سائنس — پانچواں تمسک

پہلا ہفتہ

حرکت اور قوت ــــ کیا موٹر کار پٹرول بغیر چل سکتا ہے؟ ایک لوہے کا اسکرو یا پیچ لکڑی کے اندر کیسے جاتا ہے؟ ہم اپنی بائیسکل میں تیل کیوں ڈالتے ہیں؟ ہم چرخیاں بھاری اوزان اٹھانے میں کیوں استعمال کرتے ہیں؟ کیا تم نے کبھی ان باتوں پر خیال دوڑایا۔ روزآنہ ہم ایسے بہتیرے واقعات سے دوچار ہوتے ہیں لیکن شاذونادر ہم ان پر غور کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔

اس ماہ میں ہم کچھ روزمرہ آنے والے واقعات کے متعلق معلومات حاصل کریں گے اور دیکھیں گے کہ وہ کن اصولوں کے تحت عمل میں آتے ہیں۔ اول اول ہم چند معمولی مشینوں کا مشاہدہ کرینگے کہ وہ کس طرح کام کرتی ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم مشین کے متعلق واضح معلومات حاصل کریں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم حرکت اور قوت کے متعلق کچھ معلومات بہم پہونچائیں لہذا اس ماہ میں کام کی ابتدا حرکت اور قوت سے ہوگی۔

نیوٹن کے حرکت کے متعلق تین کلیات اور اُن کا اثر۔

تمہارے واسطے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ تم پہلے ان تین کلیات کے متعلق پڑھ لو اور پھر مندرجہ ذیل تجربات کا کام انجام دو (حوالہ نمبر (۱) جو آگے لکھا ہوا ہے دیکھو)

تجربہ نمبر (۱)۔ کسی جسم کا تغیر حرکت اس سمت میں ہوتا ہے جس سمت میں قوت اس پر

عمل کرتی ہے اور یہہ قوت اور وقت کے مناسب ہوتا ہے۔ وقت کا تعین اس عرصہ سے کیا جاتا ہے جتنے عرصہ کے لئے قوت اس پر عمل کرتی ہے۔

ہدایت۔ ایک چھوٹا گولہ ڈوری کے ذریعہ باندھ کر لٹکا دو۔ گولے کو دونوں ہاتھوں کی ایک ایک انگلی سے اس طرح دھکا دو کہ دونوں انگلیاں ایک دوسرے سے زاویہ قائمہ بناتی ہوئی اس گولے کو مس کریں۔ مشاہدہ کرو کہ گولہ کس سمت میں حرکت کرتا ہے۔

قبل اس کے مندرجہ ذیل تجربات کو جو کلیات نیوٹن سے متعلق ہیں تم انجام دو اس امر کی ضرورت ہے کہ تم تھوڑی واقفیت ان کے اثرات کے متعلق حاصل کر لو (حوالہ نمبر (۲) کو دیکھو اور مندرجہ ذیل تجربات سے اپنے مشاہدات کی تصدیق کرو)

(INERTIA)

تجربہ نمبر ۱ (Inertia) اپنی انگلی کے سرے پر ایک ملاقاتی کارڈ تعادل کی حالت میں رکھو اور کارڈ کے اوپر انگلی کے سرے پر کوئی سکہ رکھو۔ پھر دوسرے ہاتھ سے کارڈ کو تیزی سے ایک طرف کھینچ لو۔ سکہ کارڈ کے ساتھ اسی سمت میں حرکت کیوں نہیں کرتا۔

تجربہ (۲) (Momentum) ایک گولے کو لے کر کسی چکنی سطح پر دو مرتبہ لڑھکاؤ۔ ایک مرتبہ آہستہ سے دوسری مرتبہ تیزی سے۔ اس فاصلہ کا مشاہدہ کرو جو وہ دونوں صورتوں میں علٰحدہ علٰحدہ طے کرتا ہے۔

اب تم دو گولے لو۔ ایک دوسرے سے زیادہ بھاری ہو دونوں کو ایک ہی سطح پر ایک ہی رفتار سے لڑھکاؤ۔ طے شدہ فاصلوں کا مشاہدہ کرو۔

تجربہ نمبر (۴) مرکز جاذبہ۔

ایک پیمانہ کو اپنی انگلی کے سرے پر حالت تعادل میں رکھو۔ اور اس مرکز کے دونوں جانب پیمانہ میں جتنی کمیت ہے اس کا مقابلہ کرو۔ اب دو مختلف وزن کے پیمانہ دونوں جانب لٹکاؤ اور انگلی کے سرے پر مختلف حالتوں میں رکھ کر مرکز جاذبہ معلوم کرو۔ دونوں صورتوں میں جن جگہوں پر مرکز جاذبہ کا تعین کیا گیا ان کا مقابلہ کرو پھر صرف پیمانہ کو میز کے کنارے پر رکھ کر آہستہ آہستہ باہر کی طرف کھینچو اور ٹھیک گرنے کے وقت مرکز جاذبہ پر نشان کرلو۔

تحریری کام

سوالات :۔(حوالہ نمبر (۱ و ۲) کو دیکھو)

(۱) نیوٹن کے تینوں کلیات حرکت کو بیان کرو۔ اور جو کچھ تم نیوٹن کے متعلق جانتے ہو لکھو

(۲) تم کوئی ایسے جسم کی مثال دو جو متحرک معلوم ہوتا ہو اور بتاؤ کہ وہ کس قوت کے تحت حرکت کر رہا ہے۔ ہم سطح زمین پر اس قسم کا لگاتار متحرک جسم کیوں نہیں پاتے۔ ہم کو جسم کو حرکت دینے کے واسطے ہر مرتبہ قوت کی ضرورت کیوں پڑتی ہے۔

(۳) اگر دو برابر کی قوتیں ایک جسم پر مخالف سمتوں سے عمل کریں تو نتیجہ کیا ہوگا۔ اگر قوتیں ساوی نہ ہوں تو کیا نتیجہ ہوگا۔

(۴) ردّ عمل (Reaction) سے کیا مطلب ہے۔ کیا بغیر عمل کے ردّ عمل ممکن ہے۔ کیا کوئی عمل ایسا بھی ظہور میں آسکتا ہے جس کے ساتھ ردّ عمل نہ ہو۔

(۵) کچھ مثالیں ردّ عمل (Reaction) کی دو۔ اس کے چند استعمال بیان کرو۔ بتاؤ کہ ایک کشتی پتوار کے ذریعہ کیسے پانی میں چلتی ہے۔

(۶) اگر تم ایک دیوار پر گھونسہ مارو تو درد محسوس کرو گے۔ لیکن اگر اتنی ہی یا اس سے زیادہ قوت سے ایک روئی کے تکیہ پر گھونسہ مارو تو کوئی درد نہ ہوگا کیوں؟

(حوالہ جات)

(۱) ہگن (Higgins) سائنس کی پہلی کتاب۔ باب تیسرا۔ حصہ اول۔

(۲) ہگن (Higgins) سائنس کی پہلی کتاب۔ صفحات (۵۰ تا ۵۴)۔

(۳) نیوٹن کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے کتاب American Eduoation یا کوئی انسائیکلوپیڈیا دیکھو۔

اکائیوں کا تعین۔

تجربات کا شمار (۲) اکائیوں پر ہوگا۔ تحریری کام ایک اکائی۔ حوالہ جات۔ (۲) اکائیوں کے مادی ہیں۔

کیمیا کا تمسک | اس طرح سے دوسرے تیسرے اور چوتھے ہفتہ کا تمسک تیار کیا جاتا ہے۔ ذیل میں

کیمیا کے متعلق ماہ اپریل کا تسک دیا جاتا ہے۔

ہفتہ اول۔ ہم اس سے قبل کاربن ڈائی اکسائڈ کے متعلق کافی معلومات حاصل کر چکے ہیں۔ (کاربن ڈائی اکسائڈ کیسے تیار کی جاتی ہے) اب ہم اس کو بڑے پیمانہ پر تیار کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے خواص بالتفصیل جانچ سکیں۔ ہم اس کو کیسے انجام دینگے تجربہ نمبر (۱ و ۳) کی ہدایت دیکھو۔

تجربہ نمبر (۱ و ۳)۔ کاربونیٹس (Carbonates) پر۔

(۱) گرمی کا اثر (۲) ترشہ کا عمل دیکھو (حوالہ جات نمبر (۱ و ۲) دیکھو۔ تحریری کام سوالات۔ کاربن ڈائی اکسائڈ (Carbon-dioxide) بڑے پیمانہ پر کس چیز سے تیار کی جاتی ہے اور کیسے۔ دار التجربہ میں اس گیس کی تیاری کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ (۳) کاربن ڈائی اکسائڈ کو اگر صاف چونے کے پانی سے گزارتے ہیں تو پہلی سے چونے کا پانی دودھیا ہو جاتا ہے۔ اور اس عمل کو زیادہ عرصہ تک جاری رکھیں تو پھر دودھیا رنگ غائب ہو جاتا ہے۔ اپنے جوابات کے دلائل لکھو (۴) کاربن ڈائی اکسائڈ کا حیوانات اور نباتات کے درمیان کیا خاص تعلق ہے۔

حوالہ جات

کیمیا مصنفہ اولڈم (Old ham) صفحات (۵۸ تا ۶۷) تک پڑھو اور تجربات نمبر (۴۱ اور ۴۲) کو پڑھو۔ کیمیا مصنفہ (Adlam) اڈلم کا صفحہ (۹۵) مطالعہ کرو۔ جس میں کاربن ڈائی اکسائڈ کی تیاری چونے کے پتھر کے ذریعہ تجارتی پیمانہ پر دکھائی گئی۔

اکائیوں کا تعین

کاربن ڈائی اکسائیڈ کی تیاری اور خواص مساوی (۲) اکائیوں کے۔

تحریری کام ــــ ۲ اکائیوں کے

حوالہ جات ــــ ۲ اکائیاں جملہ (۶) اکائیاں۔

اس طرح سے دوسرے۔ تیسرے اور چوتھے ہفتہ کا کام تسک کی طور پر لکھ دیا جاتا ہے۔ اس طریق تعلیم کے خلاف ایک بڑا اعتراض یہ کہ کاہل طلبہ کو اچھا موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کو بات چیت میں گزار دیں۔ نیز یہ کہ اکثر طلبہ خاص خاص مضامین کے شوقین ہوتے ہیں۔ ڈالٹن پلان کے تحت وہ اپنے پسندیدہ مضمون کو زیادہ پڑھیں گے اور جن مضامین سے اُن کو رغبت اور دلچسپی نہیں ہے ان سے وہ حتی الامکان کنارہ کشی اختیار کریں گے۔ لیکن اس طریق تعلیم کی موجد نے گراف کے ذریعہ اس خرابی کا قریب قریب پورا استیصال کر دیا۔

یہ گراف تین قسم کے ہوتے ہیں۔

نمبر (۱) ہر طالب علم کا مضمون واری گراف جس میں طالب علم روزانہ ہر مضمون کی جملہ اکائیاں جوں جوں وہ ختم کرتا جاتا ہے لکھتا جاتا ہے۔

ڈالٹن اور گراف

نمبر (۲) استاد کے کمرے میں ایک خاص مضمون کا گراف ہر طالب علم کے واسطے رکھا جاتا ہے۔ جس میں ہر طالب علم روزآنہ اتنی اکائیاں کا اندراج کرتا جاتا ہے جتنی کے وہ اپنے مضمون واری گراف میں کر چکا ہے۔ یہ اندراج طالب علم اُستاد کے سامنے کرتا ہے اور استاد حسب ضرورت طالب علم سے اس امر کے معلوم کرنے کے لئے کہ طالب علم مذکور جو کچھ اندراج کر دیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط چند سوالات بھی کر لیتا ہے۔

نمبر (۳)۔ ہر طالب علم کے جملہ کام کا گراف۔ یہ گراف ہال میں رہتا ہے اور ہر طالب علم ہر مضمون کی جملہ اکائیاں ہفتہ واری اس میں درج کرتا جاتا ہے۔

ذیل میں تینوں قسم کے فرضی گراف کا خاکہ دیا جاتا ہے۔ جو تھوڑا سا غور کرنے کے بعد آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔

گراف نمبر (۱)

طالب علم محمود خان کا ماہواری کام — اسکول کا نام — نام - محمود خان — تاریخ آغاز ۵ اکتوبر — [illegible]

پتہ - ۴-۷ پرانا پل حیدر آباد دکن — عمر ۱۳ سال — ہشتم — جملہ مضامین — تاریخ اختتام یکم نومبر

اکائیاں

ہفتہ	اکائیاں	ریاضی	تاریخ	جغرافیہ	انگریزی	سائنس	فارسی
چوتھا ہفتہ	۲۰	۱۹	۲۰	۲۰	۲۰	۲۰	۲۰
	۱۹						
	۱۸		۱۹				۱۷
	۱۷				۱۹	۱۶	
	۱۶						
تیسرا ہفتہ	۱۵	۱۸		۱۷			
	۱۴		۱۸				
	۱۳				۱۵		۱۱
	۱۲						
	۱۱						
دوسرا ہفتہ	۱۰	۱۵	۱۰	۱۲		۷	
	۹				۶		
	۸						۱۰
	۷	۱۴	۹				
	۶					۳	۹
پہلا ہفتہ	۵	۱۳	۸	۵			۸
	۴		۳				
	۳		۱	۴	۱		
	۲						
	۱						۴
مضامین		ریاضی	تاریخ	جغرافیہ	انگریزی	سائنس	فارسی
آزمائشی امتحان کے نمبرات		ا	ا	ب	س	ا	ب

توضیح گراف نمبر(۱) یہ گراف محمود خاں طالب علم کے ماہواری ختم کئے ہوئے کام کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً ریاضی کے خانہ میں (۵) اکائیوں کے محاذی نمبر(۱۳) درج ہے۔ جس سے مفہوم یہ ہے کہ محمود خاں نے تیرھویں دن ریاضی کی پانچ اکائیاں ختم کیں اور چودھویں دن (۷) اکائیاں اور اس طرح (۱۹) دن میں (۲۰) اکائیاں یا ریاضی کا پورا کام ختم کر لیا۔ اسی طرح مضمون سائنس میں دوسرے دن محمود خاں نے (۶) اکائیاں ختم کیں۔ ساتویں دن ۱۰۔ اکائیاں اور بیسویں دن کام ختم کر لیا۔

گراف سائنس کلاس نمبر۲

مضمون سائنس						جماعت ہشتم					تمک سائنس					ایس۔ خاں					سائنس ٹیچر
	نام طالب علم	ہفتہ اول					ہفتہ دوم					ہفتہ سوم					ہفتہ چہارم				
		۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸	۱۹	۲۰
۱	محمود خاں																				
۲	خواجہ احمد																				
۳	وینکٹ راؤ																				
۴	عبدالعزیز																				
۵	عبدالباری																				
۶	سالم ابن سعید وغیرہ																				

توضیح گراف نمبر(۲)۔ اس گراف میں صرف مضمون سائنس کا ہفتہ واری کام درج ہے۔ مثلاً محمود خاں نے پہلے ہفتہ میں سائنس کی ۶۔ اکائیاں ختم کیں لیکن خواجہ احمد نے صرف ۳۔ اکائیاں۔ وینکٹ راؤ نے ۵۔ اکائیاں پوری کیں گویا کہ اس نے اس ہفتہ کا پورا کام کر ڈالا لیکن محمود خاں نے ہفتہ کے معینہ کام سے

ایک اکائی زیادہ کی۔

گراف نمبر (۳)

	کلاس ششتم	تمسک ماہ اکتوبر															ہفتہ اول									
		جملہ اکائیاں تمام مضامین																								
	نام طالب علم	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴	۲۵
۱	محمود خاں																			→						
۲	خواجہ احمد																	→								
۳	وینکٹ راؤ																				→					
۴	عبدالعزیز																			→						
۵	عبدالباری										→															
۶	سالم ابن سعید																								→	
وغیرہ	وغیرہ وغیرہ																									

توضیح گراف نمبر (۳) — اس گراف میں ہر طالب علم کی جملہ اکائیاں جو اس نے پہلے ہفتہ ہر مضمون میں ختم کیں درج ہیں۔ مثلاً محمود خاں کے متعلق گراف نمبر (۱) ملاحظہ فرمائیے۔

ہفتہ اول — تاریخ	۴ اکائیاں	(تیسرے دن)
انگریزی	۳ ″	(پہلے دن)
سائنس	۶ ″	(دوسرے دن)
جغرافیہ	۵ ″	(پانچویں دن)
فارسی	۱ ″	(چوتھے دن)
جملہ	۱۹ اکائیاں	

اسی طرح خواجہ خاں کی جملہ اکائیاں (۱۷) ہیں وینکٹ راؤ کی (۲۰) اور اسی طرح دوسرے طلبہ کی اکائیوں کا اندراج کیا گیا ہے۔

گراف کے فوائد اس قسم کی ترسیمات سے استاد پہلی نظر میں یہ بتا سکتا ہے کہ کس طالب علم نے کس خاص مضمون میں کس قدر ترقی کی ہے۔ دوسرے مضامین کے گراف دیکھنے کے بعد استاد کسی طالب علم کے تمام مضامین کے متعلق صحیح رائے قائم کرسکتا ہے۔ جماعت واری طریقہ میں

ریاضی کے اُستاد کو بالکل پتہ نہیں چلتا کہ اس کے طلبہ کی حالت دوسرے مضامین میں کیسی ہے۔ ان ترسیمات سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا طالب علم کس مضمون کا زیادہ شایق ہے اور کن کن مضامین میں اس کو دلچسپی نہیں ہے۔ استاد کو اس امر میں بھی کافی مدد ملتی ہے کہ وہ طلبہ کو مناسب موقع پر مدد دے۔ مثلاً جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اکثر طلبہ کسی خاص مضمون کے کسی خاص موضوع تک پہنچ چکے ہیں تو وہ ان کو ضروری ہدایات کے لئے کسی ایک کلاس میں بلا لیتا ہے اس طرح پر کلاس کے چند طلبہ یا تمام کلاس ضروری ہدایات اور مشورے کے لئے ایک خاص موقع پر جمع کر لئے جاتے ہیں اور اس موضوع پر گزشتہ یا آیندہ کے متعلق بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے اور اس طرح پر اگر کوئی بات غیر واضح ہوتی ہے تو وہ صاف ہو جاتی ہے۔

یہ ترسیمات طلبہ کے واسطے اتنے ہی مفید ہوتے ہیں جتنے کہ استاد کے واسطے اُس کو اس امر کا پورا پورا پتہ رہتا ہے کہ وہ اپنا کتنا کام انجام دے چکا ہے اور کتنا باقی ہے۔ وہ اپنی تعلیمی حالت کا اپنے ہم جماعت دوستوں کی حالت سے مقابلہ کرتا ہے اور اس طرح سے اس کی طبیعت میں ایک قسم کا اُبھار پیدا ہوتا ہے جو اس کو اس امر پر آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی سے بھی کم نہ ہونے دے۔ اس میں شک نہیں کہ کم تیز اور ہوشیار لڑکوں کی ترقی اکثر مضامین میں کمزور اور غبی طلبہ سے زیادہ رہیگی۔ لیکن ایسی صورت میں پھسڈی طلبہ میں اتنی کم ہمتی نہ پیدا ہوگی جتنی کہ وہ جماعت واری طریقہ تعلیم میں محسوس کرتے ہیں۔ اس کے دو سبب ہیں اول تو اس کو اپنے کمزور مضامین کے درست کرنے کا زیادہ وقت ملتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ کسی چار یا پانچ مضامین دوسرے طلبہ سے پیچھے ہے تو بھی ممکن ہے کہ وہ کسی دو ایک مضامین میں دوسروں سے آگے بھی ہو۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی لڑکا ریاضی میں کمزور ہے تو انگریزی میں اس کی حالت اچھی ہے یا تاریخ جغرافیہ میں کمزور ہے۔ لیکن ریاضی اچھی ہے۔ یہ خیال کہ اگر وہ چند مضامین میں دوسروں سے گرا ہوا ہے تو چند مضامین میں دوسروں سے آگے ہے یا کم از کم ان کے برابر ہے اس کو پست ہمت نہیں ہونے دیتے۔

دار التجربہ اور ڈالٹن پلین

دار التجربہ میں عملی سائنس کی تعلیم ڈالٹن طرز پر بہ نسبت جماعت واری طریقہ کے زیادہ کامیابی کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔ جماعت واری طریقہ میں یہ مشکل آ کر پڑتی ہے کہ ایک ہی وقت میں تمام جماعت ایک تجربہ کرنے کو آ جاتی ہے۔ اگر جماعت میں (۳۰) طلبہ ہیں تو وقت واحد میں ایک ہی قسم کے کم از کم (۱۵) آلات سائنس کی

ضرورت پڑتی ہے۔ طبیعات کے اکثر آلات قیمتی ہوتے ہیں۔ اب ایسی حالت میں دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں یا تو ایک کثیر رقم ان کی خریداری میں صرف کی جائے یا صرف ایک یا دو آلات سے تمام جماعت کا کام چلایا جائے۔ ظاہر ہے کہ دوسری صورت میں جماعت کے ہر طالب علم کو خاطر خواہ موقع اس آلہ کے استعمال کا نہیں مل سکتا۔ عام طور سے طریقہ تو یہ ہے کہ اس قسم کے آلات شیشے کی الماریوں میں مقفل رہتے ہیں۔ سال میں ایک دو مرتبہ طلبہ کو دور سے ان کی زیارت نصیب ہو جاتی ہے۔ ڈالٹن طریق تعلیم میں چونکہ یہ آزادی رہتی ہے کہ طالب علم اپنے ایک ماہ کے تفویض کردہ مختلف مضامین میں کسی ایک کو پہلے ختم کرلے اور پھر دوسرے میں ہاتھ لگائے۔ یا مطالعہ سے تعلق رکھنے والے کام کو پہلے ختم کرلے اور پھر عملی حصہ کی طرف قدم رکھے۔ ایسی حالت میں اس قسم کا انتظام آسانی سے کیا جاسکتا ہے کہ وقت واحد میں ان آلات سے تجربہ کرنے کے لئے جن کی تعداد کم ہے تمام جماعت سے چند طلبہ آویں اور باقی دوسرے کام کرتے رہیں۔ اس طرح پر باری باری سے تمام جماعت کے طلبہ اُن آلات سے پورا استفادہ کرلیں۔ ایسی صورت میں کثیر التعداد ایک ہی قسم کے آلات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور اس طرح پر جو رقم پس انداز ہو اس سے دوسرے قسم کے آلات خریدے جاسکتے ہیں۔ ڈالٹن پلین کے تحت ایک خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تجربہ خانہ میں طلبہ کو کامل آزادی ملنے سے اس امر کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے کہ طلبہ اپنی ناواقفیت کے باعث اہم حادثات اور نقصانات کا سبب نہ ثابت ہوں اکثر آلات (برقی آلات خصوصیت سے) قیمتی اور نازک ہوتے ہیں اور ذرا سی بے ترتیبی سے خراب ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض بعض دھماکے (کیمیائی مرکبات کا باہمی تعمل) بھی نہایت خطرناک ہوتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک طالب علم دار التجربہ میں پوشیدہ طور پر ایسے دو اشتعال پذیر مرکبات آپس میں ملا دیتا ہے جو خود صرف اسی کے واسطے باعث تکلیف یا ہلاکت نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ پورا دار التجربہ خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ اس قسم کے نقصانات سے محفوظ رہنے کے واسطے ضرورت اس امر کی ہے کہ استاد خطرناک کیمیائی مرکبات کو علحدہ کسی الماری میں مقفل رکھے۔ اور حسب ضرورت ان تجربات کو اپنی نگرانی میں کرائے۔ برقی آلات کے متعلق طلبہ کو ہدایت دے دی جائے کہ قبل اس کے وہ برقی رو گزاریں۔ وہ استاد کو اپنے تاروں کے سلسلوں کی ترتیب دکھادیں۔

اعتراضات ۔ دنیا کی عام حالت تو یہ ہے کہ ہر نفع کے ساتھ نقصان، ہر خوشی کے ساتھ

رنج اور ہر آرام کے ساتھ تکلیف شامل رہتی ہے۔ اب یہ اُمید کرنا کہ ڈالٹن طریق تعلیم میں خوبیاں ہی خوبیاں ہیں اور کوئی بھی خرابی نہیں بالکل بے اصول امر ہے۔ یا یہ کہ جماعت واری طریقہ تعلیم عیوب سے پر ہے اور اس میں کوئی خوبی نہیں ہے غلط ہے۔ اب ہم مضمون کے بقیہ حصہ میں اس بات کو دکھائینگے کہ معترضین کو ڈالٹن طریق تعلیم کے خلاف کیا اعتراضات ہیں۔

اعتراض نمبر (۱) گروپ اسپرٹ

اس طریق تعلیم کے تحت طلبہ میں (Group Spirit) یا اتحاد باہمی کی اعلیٰ صفت پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ گروپ اسپرٹ صرف اسکول کی فضا اور اساتذہ کے خیالات پر منحصر ہے۔ اگر اسکول کے اسٹاف کو طلبہ میں گروپ اسپرٹ پیدا کرنے کا خیال ہے تو وہ مناسب موقع پر طلبہ میں یہ صفت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اگر اساتذہ کو اس کا خیال نہیں ہے۔ اور مدرسہ میں نااتفاقی کی فضا ہے تو طلبہ جماعت واری طریقہ تعلیم میں بھی اس صفت سے اتنا ہی محروم رہیں گے جتنا کہ ڈالٹن طریق تعلیم میں۔ ڈالٹن طریق تعلیم میں طلبہ صرف اپنی ہی مدد کرنا نہیں سیکھتے بلکہ اُن کو اپنے ہم جماعت طلبہ کو بھی مدد دینے کا کافی موقع ملتا ہے۔ اور روزانہ ترسیمات کے اندراج کرتے وقت ان میں مقابلہ کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔

کاہلوں کو آسائش کا موقع

(۲) کاہلوں کو اس نئے طریق تعلیم میں آسائش کی زندگی گزارنے کا اچھا موقع مل جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں ڈالٹن طریقہ تعلیم میں اُستاد ہمیشہ اس خطرہ کو مدنظر رکھے لیکن یہ خطرہ بہت کچھ ترسیمات کی مدد سے وقت پر دبایا جاسکتا ہے۔ ایک طریقہ اس خطرہ سے مقابلہ کرنے کا اور ہے وہ یہ کہ تمسک طلبہ کے سامنے دل چسپ پیرایہ میں پیش کئے جائیں۔ اس طرح سے اگر طلبہ میں اپنے مضامین سے ابتداءً دلچسپی پیدا ہو جائے گی تو جتنا لطف ان کو اپنے کام کی تکمیل میں آئیگا اُن کو اور دوسرے کام میں حاصل نہ ہوگا اور اس طرح سے کاہلوں کی تعداد خود بہ خود کم ہو جائے گی۔ لیکن ان تمام حالات کے باوجود بھی اگر کوئی طالب علم اپنی کاہلی اور بے فکری سے باز نہیں آتا ہے تو ایسی صورت میں اس کی وہ آزادی جو ڈالٹن طریق تعلیم کے تحت میسر ہے ایک خاص مدت کے واسطے چھین لی جاتی ہے۔ اور اس کو نظام الاوقات کی تحت استاد کی نگرانی میں کام کرنا ہوتا ہے۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ یہ سزا طالب علم کے واسطے نہایت موزوں ہے۔ اس کا یہ زمانہ مثل ایک قیدی کے گزرتا ہے اور جب اس کو اپنی سزا کی مدت ختم کرنے کے بعد پھر آزادی

ملتی ہے تو پھر وہ کبھی ایسی غلطی نہیں کرتا۔

پسندیدہ مضامین پر زیادہ توجہ۔

(۳) تیسرا اعتراض اس طریقہ کے خلاف یہ ہے کہ طالب علم اپنے پسندیدہ مضمون پر زیادہ توجہ دیگا بہ مقابلہ ان مضامین کے جن میں اُسے دلچسپی نہیں ہے اور اس کے علاوہ یہ ایک بالکل قدرتی امر ہے کہ طلبہ ان اساتذہ کے کمروں میں زیادہ تعداد میں پہنچنے کی کوشش کریں گے جو اُن کا محبت اور ہمدردی کے ساتھ خیر مقدم کریں گے اور ان کو دوستانہ طریقہ پر مدد دیں گے۔ بہ مقابلہ ان اساتذہ کے جو سخت طبیعت کے ہوتے ہیں۔ اور جن سے طلبہ ڈرتے ہیں۔ یا اُن اساتذہ کے کمروں میں جانے سے بھی پس وپیش کریں گے جن کو اپنے مضامین پر عبور حاصل نہیں ہے۔ لیکن چونکہ طلبہ کو ہر مضمون میں ایک مقررہ کام کرنا ہوتا ہے اور ترسیمات سے برابر اس امر کا پتہ چلتا رہتا ہے کہ ہر طالب علم کا مضمون واری کتنا کام ختم ہو چکا ہے اور کتنا باقی ہے۔ ایسی صورت میں طالب علم کے واسطے اس کا موقع تو نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی کے موافق ایک مضمون میں تو مقررہ کام سے دوچند اور سہ چند کر ڈالے اور دوسرے مضمون میں ہاتھ نہ لگائے۔ جن مدارس میں یہ طریقہ مروج ہے وہاں دیکھا گیا ہے کہ جب طلبہ کسی مضمون میں دلچسپی لینے لگتے ہیں تو وہ اس کی پروا نہیں کرتے کہ کون استاد سخت ہے اور کون نرم کیونکہ وہ کتاب کو اپنا مُعلّم بناتے ہیں اور اسی میں منہمک ہو جاتے ہیں۔

زیادہ وقت صرف ہونا

(۴) چوتھا اعتراض یہ ہے کہ اسباق کا کتابوں سے جمع کرنے میں زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ بہ مقابلہ اس کے کہ استاد اُن کو بتادے اور بعض لڑکوں میں اپنے خیالات کو مجتمع کرنے کی عادت نہیں ہوتی اور اُن کو کتابوں سے واقعات نکالنے میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ اور بعض میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ضروری باتیں کتاب سے اخذ کرلیں اور غیر ضروری باتوں کو چھوڑ دیں۔ لیکن ان مشکلات کا حل ممکن ہے۔ اس میں طلبہ کو یہ صاف صاف بتادیا جاتا ہے کہ ان کو کیا پڑھنا ہے اور کیا چھوڑ دینا ہے۔ دوسرے یہ کہ وقتاً فوقتاً اُستاد ان کو ایک جگہ جمع کرکے ضروری ہدایات بھی دیا کرتے ہیں۔ پھر دوران مطالعہ میں ہر وقت ان کی مدد کے واسطے ان کے پاس موجود رہتا ہے۔

(۵)۔ ایک معترض کا اعتراض ہے کہ ہم اس جدید طریقہ کے تحت طلبہ میں یہ عادت

پیدا کرتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی کے موافق جو طریق کار چاہیں اختیار کریں۔ اُن کو آزادی رہتی ہے کہ کسی کام کو جب تک اُن کی طبیعت چاہے کریں اور جب گھبرا جائیں تو چھوڑ کر دوسرا کام کریں۔ لیکن آیندہ عملی زندگی میں ان کو اس کے برعکس کرنا پڑے گا یعنی ان کو اپنے فرائض کے انجام دہی میں ایسا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا اور اتنا وقت دینا پڑے گا جتنا کہ اس موقع اور محل کے لحاظ سے اس کام کے واسطے ضروری ہو گا۔ ان کی یہ آزادی کہ جو مرضی میں آئے کریں اور جتنا وقت چاہیں صرف کریں ختم ہو جائے گی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نظام الاوقات کی پابندیوں کے تحت جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں یہ خوبی موجود ہے کہ وہ ہمارے بچوں میں صلاحیت پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنی آیندہ آنے والی دشواریوں کا کامیابی سے مقابلہ کر سکیں۔ اگر ایسا ہے تو ہم کو اپنے موجودہ طریق تعلیم میں کسی قسم کی ترمیم کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن کم از کم نصف صدی کا تجربہ تو یہ بتا رہا ہے کہ ہمارے طلبہ کو عملی زندگی میں اسکول کی دی ہوئی تربیت سے بہت کم فائدہ ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے لڑکوں کو اس قابل بنانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کامیابی سے بسر کر سکیں تو ہم کو ابتدا سے ان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھائیں۔ ان کو اس بات کا عادی بنائیں کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود نکال سکیں اور اُن کا نصاب تعلیم ایسا مقرر کریں جس کی فی زمانہ قوم اور ملک کو ضرورت ہو۔ اس میں سے اکثر باتیں ڈالٹن طریق تعلیم کے تحت نہایت خوبی سے تکمیل پا جاتی ہیں۔

پروجکٹ میتھڈ یعنی منصوباتی طریقہ تعلیم

(از سید اللہ بخش صاحب بی۔اے بی ٹی مددگار فوقانیہ دار العلوم)

تعلیم کا اصل مقصد یہی ہے کہ ایک تو بچے کے اندرونی قوائے اور جبلتوں کی نشو ونما ہو اور دوسرا اس میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے ماحول سے اچھی طرح مطابقت پیدا کرلے اسی مقصد کی تکمیل کے لئے موجودہ دور کے ماہرین تعلیم نے متعدد طریقے ایجاد کئے اور نہایت شد ومد کے ساتھ اس امر پر زور دیا کہ اصولی و عملی تعلیم ساتھ ساتھ دی جائے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھ کر فی زمانہ یورپ اور امریکہ میں اسی قسم کے عملی طریقے رائج ہیں جن میں پروجکٹ میتھڈ یعنی منصوباتی طریقہ تعلیم بھی ہے جو نہایت موثر اور کامیاب ثابت ہوا ہے۔

پروجکٹ کے لغوی معنی منصوبے یا تجویز کے ہیں۔ جس کے ضمن میں ایسی ایسی معلومات بہم پہونچتی ہیں کہ لڑکوں کے لئے تعلیم کا کافی مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ حساب، تاریخ، جغرافیہ، ساحت، ادب غرض کہ ہر ایک فن کی تعلیم اسی کے ذریعہ سے دی جا سکتی ہے۔ مثلاً تعمیر مکان کے پروجکٹ کو لیجئے اس کے لئے کن کن چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سب سے پہلے محل وقوع دیکھا جاتا ہے جس کے ضمن میں آب وہوا اور اصول حفظ صحت کی بہت سی باتیں ذہن نشین کرائی جا سکتی ہیں پھر دوسری چیزیں قطعہ زمین کی پیمائش اور مکان کی نقشہ کشی ہے جس میں علم حساب، ساحت، ہندسہ ونقشہ کشی کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ تیسری چیز بر آورد مصارف کی تیاری ہے جس کے ذریعہ سے علم حساب کی عملی اور مفید تعلیم دی جا سکتی ہے۔ چوتھی چیز سامان اور اشیاء کی فراہمی ہے جس میں مطالعۂ فطرت، معلومات عامہ اور نیز جغرافیہ کی تعلیم کے لئے کافی مواد بہم پہونچ سکتا ہے۔ پانچویں چیز یہ ہے کہ معماروں اور مزدوروں کی اجرت کے حساب کتاب اور مکان میں پتھر اور دری کا فرش کروانے کے ضمن میں رقبہ اور پیمائش کے متعدد سوالات حل کرائے جا سکتے ہیں۔ چھٹی چیز مکان کی چمن بندی ہے جس کے ضمن میں باغبانی اور نباتات کی تعلیم کا کافی مواد مل سکتا ہے۔ روشن دانوں اور دریچوں کی اہمیت کا اظہار کرتے وقت حفظ صحت کے متعدد اصول طلبہ کے ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔ پھر سب سے آخری

چیز جوڑ ی جاتی ہے مکان کی آرائش ہے جس میں نہ صرف بچوں کی خوش مذاقی، سلیقہ مندی، حسن تربیت، طبیعت کی جدّت و لطافت کا پورا پورا اظہار ہو سکتا ہے۔ بلکہ اسی کے ضمن میں اُن کو مختلف فنون مثلاً معاشرت، سیاست مدن، تاریخ، جغرافیہ، مبادیات سائنس، مطالعۂ فطرت وغیرہ کی تعلیم بخوبی دی جا سکتی ہے۔ اب رہ گئی ادبی تعلیم وہ اس طرح دی جا سکتی ہے کہ طلبہ سے مختلف ممالک کے باشندوں کے طرز ماند و بود کے متعلق ادبی مضامین منتخب کر کے پڑھوائے جائیں اور پھر سوالات کے ذریعہ ان کی کُل معلومات کو ایک مربوط سلسلے میں مرتب کروانے کے بعد ان کو ہدایت کی جائے کہ وہ صاف و سلیس زبان میں مضامین لکھیں اور انہیں مضامین کی اصلاح کے ضمن میں زبان اور قواعد کے بہت سارے نکات بتلائے جا سکتے ہیں اس کے علاوہ تعمیر شدہ مکان پر بھی ہر ایک طالب علم سے مضمون لکھوایا جائے اور اُن کی اصلاح ہر ایک طالب علم کے مواجہ میں کی جائے۔ غرض کہ ایک مکان کی تعمیر کے دوران میں جو کم سے کم ڈیڑھ ماہ تک جاری رہ سکتی ہے۔ طالب علم کو علوم مروّجہ کی نہ صرف تعلیم دی جا سکتی ہے بلکہ اس میں اس بات کی بھی صلاحیت پیدا کرائی جا سکتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں عمدگی کے ساتھ کام کر سکے اور اپنے ماحول سے بالکلیہ مطابقت پیدا کرلے۔

ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ ہر زمانے میں بہترین دماغ جن کو تعلیمی معاملات سے خاص لگاؤ رہا ہے بچوں کو ایسے کاموں کی جانب اکساتے تھے جن کا مقصد معین ہو اور تعلیمی مباحث کو دلچسپ بنانے اور اُن کو بخوبی ذہن نشین کروانے کی غرض سے عملی مشاغل کے ضمن میں علمی مسائل کی تفہیم کروایا کرتے تھے مگر از منۂ ماضیہ میں ایسی صورتیں عام نہیں ہوتی تھیں بلکہ جن اساتذہ کو قسام ازل نے درس تدریس کا فطری ملکہ ودیعت کیا تھا۔ وہی ان طریقوں سے کام لیا کرتے تھے۔ مگر فی زمانہ ان عملی طریقوں کی باقاعدہ تدوین و تنظیم ہو چکی ہے اور عام طور پر یہ رواج پا چکے ہیں خصوصاً منصوباتی طریقہ تعلیم اپنی دلچسپیوں اور تنوع کے لحاظ سے ہر جگہ ایک مرغوب طریقہ ثابت ہوا ہے اور تعلیم کے ہر ایک شعبہ میں اس سے کام لیا جا رہا ہے۔

سب سے بڑی خوبی اس طریقۂ تعلیم کی یہ ہے کہ اُس میں بچوں کو اس امر کی آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مذاق اور دلچسپی کے مطابق کوئی منصوبہ منتخب کرلیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو نہایت ہی انہماک اور دلچسپی کے ساتھ انجام دیتے ہیں جو طلبہ غبی اور کند ذہن سمجھے جاتے ہیں وہ بھی اس طریقۂ تعلیم کے ذریعہ سے ذہین اور چالاک بن سکتے ہیں۔ جن مدارس میں یہ طریقہ رائج ہے وہاں کا طرز عمل یہ ہے کہ ہفتے میں ایک پروجکٹ پورا کروایا جاتا ہے استاد بچوں سے کہتا ہے کہ وہ ایسے منصوبے منتخب کریں جو ایک ہفتے میں ختم ہو سکیں لڑکے اپنی اپنی

سمجھ اور مذاق اور قوت فیصلہ کے مطابق منصوبے منتخب کرسکتے ہیں لیکن یہ طرزِ عمل صرف اُنھیں مدارس میں رائج ہے جہاں لڑکے اُس طریقۂ تعلیم سے واقف ہو چکے ہیں اور منصوبہ منتخب کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں مگر اُن مدارس میں جہاں منصوباتی تعلیم پہلے پہل شروع کی جائے مذکورۂ بالا طرزِ عمل مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ خود اساتذہ لڑکوں کے مذاق اور طبیعت کے رجحان کو دیکھ کر منصوبے منتخب کیا کریں تو بہتر ہے۔ بعض مدارس میں جہاں طلبہ کو اُستادوں سے سوالات کرنے اور اپنی اپنی پسند کے مطابق منصوبے منتخب کرنے کی آزادی حاصل ہے وہاں ایسے ایسے مختلف و متضاد منصوبے پیش کئے جاتے ہیں کہ مدرس کا دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک لڑکا ڈرامہ میں حصہ لینا چاہتا ہے تو دوسرا کسی کھیل کی تجویز پیش کرتا ہے اور بعض لڑکے سیر و تفریح کا منصوبہ پیش کرتے ہیں یا کوئی نئے قسم کی دستکاری شروع کرنا چاہتے ہیں جب صورت حالات ایسی ہو تو مدرس کو کرنا یہ چاہیئے کہ ان منصوبوں میں سے جو اس کے خیال میں اچھا معلوم ہو اُسی کے انتخاب میں لڑکوں کی مدد اور رہنمائی کرے۔

وہی مدرس نہایت قابل، کارداں اور تجربہ کار سمجھا جائے گا جو نہایت دل دہی کے ساتھ کاروبار میں بچوں کی رہنمائی کرے۔ شروع شروع میں استاد کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ ضرورت کم ہوتی جاتی ہے پھر بھی اس بات کا ضرور لحاظ رکھا جائے کہ لڑکے بالکلیہ آزادانہ چھوڑ دئیے جائیں اور ان کی مصروفیت ایسی ہو کہ جو وقت اور کوشش صرف ہو بیکار نہ جائے چنانچہ مدرس کا یہی فرض ہے کہ وہ ایسے ہی مفید انتخابات میں لڑکوں کی رہنمائی کرے اور جہاں ضرورت لاحق ہو اپنی صوابدید سے منصوبوں کا انتخاب کرے۔ مدرس کا یہ بھی فرض ہے کہ جہاں اس کو یہ محسوس ہو کہ بچے کام سے جی ہارنے لگے ہیں یا اُن کی دلچسپی کم ہو چلی ہے تو اُن کی مدد کرے اور جب کام ختم ہو جائے تو اس کے نقائص و محاسن کے جانچنے اور سمجھنے میں اُن کی رہنمائی کرے۔

منصوبوں کے اقسام

یوں تو منصوبے کئی شقوں پر منقسم ہو سکتے ہیں لیکن عام طور پر اس کی دو شقیں قرار دی جاسکتی ہیں یعنی چھوٹے اور بڑے۔ بڑے منصوبے سے وہ منصوبہ مراد ہے جس کی انجام دہی میں جماعت ختم میقات یا سال بھر مشغول رہ سکے دکان کا منصوبہ جس کا ذکر بطور تمثیل اوپر کیا گیا ہے اسی قبیل کا ہے۔ بڑا منصوبہ کئی چھوٹے چھوٹے منصوبوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ بڑے منصوبوں میں کثیر مصارف ہوتے ہیں۔ اس لئے بجز اُن اساتذہ کے جو منصوباتی تعلیم کا اچھا خاصہ تجربہ رکھتے ہیں اور خاص طور پر اس صنف میں تربیت

حاصل کرچکے ہیں کوئی دوسرا مدرس ہرگز اس سے کام نہ لے۔

چھوٹے منصوبوں سے وہ منصوبے مراد ہیں جن کی مدت ایک دن سے لیکر ایک مہینے تک ہوسکتی ہے۔ البتہ وہ مدرسین جو زیادہ تجربہ کار نہ ہوں اس قسم کے چھوٹے منصوبوں کا تجربہ کرنے کی جرات کریں تو کوئی ہرج کی بات نہیں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ وہ تمام نصاب تعلیم جو سال بھر کے لئے مقرر کیا گیا ہے ایک بڑے منصوبے کے تحت لایا جاسکتا ہے۔ اس کا یہی جواب ہوگا کہ بالفرض یہ بات ممکن بھی ہو تو اس پر عمل کرنا کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ سال بھر کے نصاب کو منصوبے کے ذریعہ سے ختم کروانے میں ایک تو بہت کچھ تکلیف اور آورد سے کام لینا ہوگا دوسرا جو چیز کم وقت میں آسانی کے ساتھ حاصل ہوسکتی ہے وہ زیادہ دیر میں اور بہت کچھ ہیر پھیر کے بعد حاصل ہوگی۔ جن مضامین میں اس قسم کی صلاحیت موجود ہو کہ بلا تکلیف منصوباتی تعلیم کے سانچے میں ڈھل سکیں ڈھال لئے جائیں لیکن ہرگز اس امر کی کوشش نہ کی جائے کہ نصاب مقررہ کا ہر ایک مضمون منصوباتی طریقے کے ذریعہ پڑھایا جائے۔

منصوباتی طریقہ تعلیم میں مصارف کا سوال بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اکثر اصحاب محض اس خیال سے کہ منصوباتی طریقہ میں مصارف زیادہ ہوتے ہیں اس سے گریز کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت منصوباتی تعلیم بہت کم مصارف میں انجام پاسکتی ہے۔ مثلاً اگر کسی دیہاتی مدرسہ میں غیر ملکی کھلونوں، رنگوں اور آلات و اوزار سے کام لیا جاتا ہے تو یہ بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن کو دیہاتی ماحول سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو وہی مثل ہے کہ رہیں جھونپڑیوں میں اور خواب دیکھیں محلوں کا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ مدرسہ بچوں کو دیہاتی زندگی کی ضروریات کے مطابق تعلیم نہیں دیتا بلکہ اُن کو اس سے بالکل الگ تھلگ رکھتا ہے۔ ایک دیہاتی مدرسہ میں جو منصوباتی طریقہ پر چلایا جارہا ہو صرف انہیں اشیا سے کام لیا جائے جو کہ اسی ماحول میں قدرتاً فراہم ہوسکتی ہیں چکنی مٹی، پتھر، روئی، سن، بیج، گھونگے، کنکر، جھاڑو کی کاڑیاں وغیرہ نقاشی کے کام میں معمولی رنگوں یا کوئلے یا گھر کی بنی ہوئی سیاہی سے کام لیا جاسکتا ہے اور نقاشی کے نمونوں کے طور پر وہی پھول پتے استعمال کئے جائیں جو آس پاس پیدا ہوتے ہیں۔ شہری مدارس میں بھی علیٰ ہذا مندرجۂ ذیل اشیا استعمال کی جائیں جن کو لوگ بے کار سمجھ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں مثلاً مکھن کے خالی شدہ ڈبے، دھاگے کی خالی شدہ چرخیاں،

ردّی کاغذ اور مقوّے کھپتی جو کتابوں پر چڑھائی جاتی ہے اس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں جو ردّی کے ٹوکرے کی نظر کر دی جاتی ہیں اس مقصد کے لئے کام میں لائی جاسکتی ہیں۔

کسی درس گاہ میں منصوباتی طریقہ کے رائج کرنے سے قبل اس امر کا بھی ضرور خیال رکھا جائے کہ وہاں ایسے مدرسین موجود ہوں جو اس خصوص میں تربیت حاصل کر چکے ہیں یا کافی طور پر اس کی معلومات رکھتے ہیں محض ایک یا دو سال کسی تربیتی درس گاہ میں تعلیم پانے سے کوئی مدرس جدید طریقوں کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا اہل نہیں بن سکتا بلکہ اس کے لئے فن تعلیم سے فطری مناسبت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ محض نقالی کام نہیں دے سکتی بلکہ اجتہادی صلاحیت کا ہونا بھی لازمی امر ہے۔ انہیں وجوہ کی بنا پر مدرسین کے کام کی نگرانی ضروری و لابدی چیز ہے صدر مدرس کا فرض ہے کہ اس خصوص میں وقت بہ وقت مدرسین کے کام کا نہ صرف معائنہ کیا کرے بلکہ اُن کو مدد اور مشورہ بھی دیا کرے۔ بعض اُن اساتذہ سے جو منصوباتی تعلیم میں خاص طور پر مہارت رکھتے ہیں درخواست کی جائے کہ وہ بھی مدرسین کے کام کا معائنہ کریں اور مفید مشورے دیں۔ جو مدرسین تربیت یافتہ ہیں وہ اپنا تعلق تربیتی درس گاہ سے بالکلیہ منقطع نہ کریں بلکہ وقت بوقت وہاں سے تازہ معلومات حاصل کرتے رہیں الغرض جب تک کامل نگرانی اور مدد نہ کی جائے معمولی مدرسین کا کام اصلاح نہیں پاسکتا۔

اس مختصر تمہید کے بعد ہم تمثیل کے طور پر گودھرا انسٹیٹیوشن کے کچھ حالات قارئین کرام کے روبرو پیش کرتے ہیں جہاں منصوباتی طریقہ پر تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔

گودھرا انسٹیٹیوشن تین مدارس پر منقسم ہے، پہلا مدرسۂ تحتانیہ ہے جہاں جماعت چہارم تک تعلیم ہوتی ہے، دوسرا مدرسہ نسوان ہے، جہاں لڑکیوں کو ورنا کیولر فائنل (مڈل) تک تعلیم دی جاتی ہے۔ تیسری تربیتی درس گاہ ہے جس میں مدارس تحتانیہ و وسطانیہ میں تعلیم دینے والے مدرسین فن تعلیم کی تربیت حاصل کرتے ہیں ان تینوں مدارس میں سرکاری مروجہ نصاب تعلیم اور قواعد ضوابط کی پابندی کی جاتی ہے۔ مدرسہ کا معائنہ بھی سرکار کی جانب سے ہوتا ہے اور امتحانات کا انتظام بھی سرکار ہی کرتی ہے۔ اسی انسٹیٹیوشن میں بہت سے چھوٹے چھوٹے منصوبوں یا بہ الفاظ دیگر مشاغل (Activities) کے تجربات کروائے گئے ہیں۔ اسی خاطر بعض منصوبے خاص خاص مباحث کے سلسلہ میں

اور بعض بالکل علیحدہ طور پر انجام دیئے گئے ہیں لیکن ان تمام منصوبوں میں جو خیال مرکوز ہے۔ وہ یہی ہے کہ بچوں کے ذاتی تجربہ میں اضافہ ہو قابل ستائش بات تو یہ ہے کہ سرکاری کوڈ (Code)، کے اکثر مضامین کی تعلیم انہیں منصوبوں کی وساطت سے تکمیل کو پہونچی ہے چنانچہ منصوبہ باغ بانی جو ہر ایک جماعت کے لئے مقرر ہے سال بھر تک جاری رہتا ہے اور سرکاری مروجہ نصاب تعلیم کے ہر مضمون کے کچھ نہ کچھ حصہ کی تعلیم اسی کی وساطت سے دی جاتی ہے باغ بانی کے سوا دوسرے منصوبے محدود پیمانہ پر رکھے گئے ہیں جن کی مدت چند یوم یا چند ہفتوں سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ ہم ذیل میں اسی درس گاہ کے رائج شدہ چند منصوبے مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جن کو پڑھ کر مدرسین بہت کچھ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

(۱) طوطے کا منصوبہ

جماعت اول کے بچے اپنے طوطے کی نگہداشت نہایت ہی شوق سے کرتے ہیں یہ طوطا ان کے لئے نہ صرف ایک جی بہلانے کا ذریعہ ہے بلکہ مطالعہ فطرت کے سرکاری نصاب کا ایک بڑا جز بھی اسی کی وساطت سے انجام کو پہونچتا ہے۔ بچے طوطے کے متعلق اپنی ذات سے کہانیاں بناتے اور اس کی غذا، عادات اور شکل وصورت کو اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر بیان کرتے ہیں۔ زبانی مضمون میں یہ طوطا ان کی بڑی مدد کرتا ہے کیونکہ اسی کو پیش نظر رکھ کر بچے زبانی مضمون کے سبق نہایت دلچسپی اور انہماک سے سنتے ہیں، چکنی مٹی سے طوطے کا نمونہ بناتے اور اس پر رنگ چڑھاتے ہیں اور اس گیت کو جو مدرس نے طوطے کی نسبت بنا دیا ہے شوق سے گایا کرتے ہیں۔ ہفتے کے ہر آخری دن اس کو اپنے اقامت خانے کے باغ میں لے جا کر خوب ہنستے، کھیلتے، گاتے ہیں اور باغ سے پھل توڑ توڑ کر کھاتے اور اسے بھی کھلاتے ہیں غرض کہ یہ طوطا ان کے لئے گوناگوں مسرتوں کا باعث ثابت ہوتا ہے۔

(۲) توراۃ کا منصوبہ

بچے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا پورا مرقع اپنے سینڈ ٹیبل (ریگ دار میز) پر بناتے ہیں۔ شیشے کے ٹکڑوں کو نیلے کاغذ پر جما کر ندی بتلائی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں پر کاغذ کے پتے چپکا کر درخت بتلائے جاتے ہیں۔ ردی مقوے کو کاٹ چھانٹ کر ملکہ کی شبیہہ بنائی جاتی ہے۔ جس کا تاج اس روپہلی کاغذ سے جگمگ جگمگ کرتا نظر آتا ہے، جو کار بالک صابون، پر لپیٹا جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام

کے عالم شیر خوارگی کا نمونہ چکنی مٹی سے بنایا جاتا ہے اور جس ٹوکرے میں یہ شیر خوار چھپایا گیا تھا۔ اس کو بچے خود گھانس سے بُن کر تیار کرتے ہیں۔ اس طریقے سے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا قصہ بچوں کے ذہن نشین ہو جاتا ہے اور محض اس مرقع کے مشاہدے کی بنا ر پر وہ پوری کی پوری کہانی نہایت روانی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔

(۳) گڑیا کا منصوبہ پہلی جماعت میں سب سے زیادہ مقبول و مرغوب گڑیا کا منصوبہ ہے۔ ہر لڑکی کو مدرسہ میں شریک ہوتے ہی ایک ایک گڑیا دیدی جاتی ہے جس کو وہ جماعت سوم کے آخر تک یعنی تین سال اپنے پاس رکھتی اور اُس کی وساطت سے بڑی بڑی دل چسپ باتیں سیکھتی ہیں۔ جب کوئی طویل تعطیل ہوتی ہے تو لڑکیاں اپنی گڑیا کو بھی گھر لے جاتی ہیں اور رنگ برنگ کے کپڑوں کے ٹکڑوں سے جو کتربیوت کے بعد بیکار سمجھ کر پھینک دئے جاتے ہیں ان کے لئے لباس تیار کر کے لاتی ہیں۔ پہلی جماعت میں ایک بڑی گڑیا بھی ہوتی ہے جس کے صدریہ اور دامن اور ساڑی کی توڑ کی سلائی کا کام مروجہ نصاب کے مطابق لڑکیوں ہی سے پورا کروایا جاتا ہے لڑکیاں اپنی گڑیوں کے لئے ٹوٹی ہوئی سلیٹوں کے چوکھٹوں سے اچھے اچھے پلنگ بھی بناتی ہیں، جن کے پایوں میں دھاگے کی چرخیاں لگائی جاتی ہیں۔ اگر چوکھٹے نہ مل سکیں تو لکڑی کے ٹکڑوں کو کیلوں سے جوڑ کر پلنگ بنا لیتی ہیں ان کی رنگائی کے لئے معمولی بازار کا رنگ استعمال کیا جاتا ہے اور نوار کے بدلے سُتلی کام میں لائی جاتی ہے۔ جب پلنگ تیار ہو چکتا ہے تو بسترا چادریں اور تکیے بھی تیار کئے جاتے ہیں۔ غرض کہ لڑکیوں کو امور خانہ داری کی خوب تربیت ہوتی ہے گڑیاں ان کی مدرسے کی زندگی کا اصلی جزو ہوتی ہیں اور ان کی تمام مصروفیتوں یعنے کھیلوں، گیتوں میں دخیل نظر آتی ہیں۔ حفظ صحت کے سبق کے ضمن میں لڑکیوں نے گڑیوں سے جو ڈرامہ کروایا وہ دل چسپی سے خالی نہیں مثلاً ننھی گڑیا یک بیک بیمار ہو جاتی اور دوا پینے سے انکار کرتی ہے۔ یہاں تک کہ بخار بہت تیز ہو جاتا ہے جو اُس کے گالوں کی تمتاہٹ سے ظاہر ہونے لگتا ہے۔ لہٰذا لڑکیوں سے ایک لڑکی ڈاکٹر بنتی اور بیمار بچے کی صحت کی نگہداشت کے متعلق عمدہ عمدہ ہدائتیں دیتی ہے۔ غرض کہ گڑیا کے منصوبے کے تحت نصاب مقررہ کی بہت سی چیزوں کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔

بھیل گھر کا منصوبہ گودرا کے اطراف و اکناف میں بھیلوں کے مکان ہیں ایک روز مقامی جغرافیہ کی تعلیم کے ضمن میں قدیم اور اصلی باشندوں کے مشاہدے کی غرض سے جماعت دوم کے لڑکوں اور لڑکیوں کو بھیلوں کے مکان دکھائے گئے۔ یہ منصوبہ دو حصوں پر منقسم تھا پہلا حصہ یہ تھا کہ سیا نڈ ٹیبل (ریگ دار میز) پر بھیل کے مکان کا نمونہ بنایا جائے اور دوسرا حصہ یہ تھا کہ بچے اس معلومات کو جو بھیلوں کے متعلق وہ فراہم کریں اپنی جماعتی بیاض میں قلم بند کرتے جائیں اور حسب موقع و ضرورت نقشے اور تصاویر بھی بنائیں۔ ریگ دار میز کا سارا کام زیادہ تر ردّی سامان سے کروایا گیا تھا اور اساتذہ اور طلبہ دونوں نے اس کو نہایت نفاست اور ہنرمندی سے انجام دیا تھا۔ مکان کی تعمیر میں مٹی اور بانس سے کام لیا گیا تھا اور چھت چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں اور پھوس سے بنائی گئی تھی۔ پکانے اور کھانے پینے کے برتن چکنی مٹی سے بنائے گئے تھے اور اناج رکھنے کی ٹوکریاں گھانس سے بُنی گئی تھیں۔ چکنی مٹی کے بیل گھانس، غلے یا لکڑی سے لدی ہوئی گاڑیوں کو جو لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور تیلیوں سے بنائی گئی تھیں اور جن کے پہیے دھاگے کی خالی شدہ چرخیوں سے بنائے گئے تھے کھینچے لئے جا رہے تھے۔ گھر کے صحن میں سُقوے یا چکنی مٹی سے بنے ہوئے مویشی کھونٹیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ نیز ادھر اودھر پڑے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں کو چُن کر ہل بنائے گئے تھے اور دیگر آلات و اوزار کے بنانے میں وہ ٹین استعمال کیا گیا تھا جو بسکٹ کے ڈبوں پر لپٹیا جاتا ہے۔

اس بھیل گھر کے منصوبے سے جو مفید اور نتیجہ خیز باتیں بچوں کو حاصل ہوئیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) ریگ دار میز اور بیاضی معلومات کی تیاری میں بچوں کا اتحاد عمل سے کام کرنا۔

(۲) معلومات فراہم کرنا اور پھر آپس میں ایک دوسرے کی معلومات سے استفادہ کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرنا۔

(۳) بھیلوں کے عادات و اطوار اور رسوم کے متعلق معتد بہ معلومات حاصل کرنا اور پھر اپنے عادات و رسوم کا اُن سے مقابلہ کر کے مماثلت اور فرق معلوم کرنا۔

(۴) بھیلوں کے باہمی دوستانہ اور ہمدردانہ سلوک اور نیز کاروبار زندگی میں اُن کے صبر و تحمل اور جفاکشی کو دیکھ کر بہت سی سبق آموز باتوں کا حاصل کرنا۔

(۵) بھیلوں کی طرز معاشرت سے اس امر کی واقفیت حاصل کرنا کہ ابتدائی زمانہ کے لوگ کس طرح مکانات بناتے اور اپنی مویشیوں کی رکھوالی اور خبر گیری کیا کرتے تھے اور بڑھیوں، معماروں اور دیگر کاریگروں کی مدد کے بغیر اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ نیز اس بات کا معلوم کرنا کہ بھیلوں کے مکانات اُن کے معاشرتی اور اقتصادی حالت سے کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔

(۶) آخر میں اس مقام کے تاریخی حالات سے واقفیت حاصل کرنا جہاں یہ قبیلہ قدیم زمانہ میں بود و باش رکھتا تھا۔

(باقی دارد)

جان لاک

(مولوی حبیب احمد صاحب فاروقی بی۔ اے۔ ڈپ، ایڈ مددگار عثمانیہ سنٹرل ٹکنکل انسٹیٹوٹ)

یوں تو انگلستان نے کئی تعلیمی مصلح پیدا کئے مگر لاک کی طرح سارے یورپ میں شہرت و مقبولیت کسی نے حاصل نہیں کی۔ فن تعلیم پر بر اعظم میں کوئی کتاب مکمل تصور نہیں کی جاتی۔ جب تک اس میں مشہور انگریز تعلیمی مصلح جان لاک کا ذکر نہ ہو۔ ایک جرمنی ماہر تعلیم نے جان لاک کی اہمیت اس طرح ظاہر کی ہے کہ دنیا کی تاریخ تعلیم میں لاک کو ہمیشہ ایسا وقیع مرتبہ حاصل رہے گا جیسا کہ تاریخ عالم میں یورپی اقوام کو حاصل ہے۔ یہ بلند پایہ مصلح تعلیم ۱۶۳۲ء میں سومرسٹ کے قریب ایک قصبے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک خوش حال شریف انگریز تھا۔ اس کا خاندان اپنی خوش حالی اور وجاہت کی وجہ سے وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور وہ تمام روایات و رواجات کا حامل تھا جن کو انگریز متوسطین اب بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ لاک کی ابتدائی تعلیم ایک پیورٹن پادری کے

تفویض رہی۔ اس کے بعد وہ "ویسٹ منسٹر" میں داخل ہوا جو انگلستان کا ایک مشہور و معروف مدرسہ ہے۔ مدرسے کی تعلیم سے فارغ ہوا تو کرائسٹ چرچ کالج میں شریک ہوا۔ اس نے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد ایم۔ بی کی وقیع ڈگری بھی لی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد جامعہ اکسفورڈ ہی کے ایک کلیے کا ٹیوٹر مقرر ہوا اور پھر جامعی پروفیسر بنایا گیا۔ اس کے بعد لاک سرکاری ملازمت میں داخل ہوا، چنانچہ ۱۶۹۵ء سے ۱۷۰۴ء تک وہ کمشنر تجارت و نوآبادیات رہا۔ ۱۶۸۹ء ہی سے وہ کمشنر اپیلز تھا۔ اس طرح آخری زمانے میں اس نے دو ممتاز عہدوں کو انجام دیا۔

۱۶۹۳ء سے ۱۶۹۷ء تک کا زمانہ ہماری نقطہ نظر سے، لاک کی زندگی کا اہم زمانہ ہے۔ کیوں کہ اسی زمانہ میں لاک کے تین مشہور و معروف تصانیف لکھے گئے تھے۔ اس کی پہلی تصنیف (Some thoughts Concerning Education) ہے۔ جس میں اس نے اپنے تعلیمی خیالات ظاہر کئے ہیں۔ شافٹسبری کے پہلے نواب نے لاک کو اپنے پوتے کے لئے بحیثیت اتالیق کے مقرر کیا تھا۔ اس دور میں جو تجربے حاصل ہوئے اُن کا بھی اس تصنیف پر اثر پایا جاتا ہے۔ مگر صرف اس تصنف سے لاک کے تمام خیالات کا پورا اور صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ لاک نے یہ کتاب اپنے ایک دوست کے لڑکے کی تعلیم میں مدد دینے کے لئے لکھی تھی۔ وہ بیان کرتا ہے کہ بچوں کے لئے مدرسے کی تعلیم مفید نہیں ہوتی، اتالیق کے ذریعے تعلیم ہونی چاہئے۔ پھر وہ اتالیق کے متعلق تفصیل سے بحث کرتا ہے اور رائے ظاہر کرتا ہے کہ اتالیق نہایت مہذب شائستہ اور لائق فرد اور حتی الامکان اسی طبقے اور درجے کا ہو جس طبقہ کا بچہ ہے۔

اس کی اور دو تصانیف (On Human understanding) اور (On the conduct of understanding) (جو لاک کے بعد شائع ہوئے) اہم ہیں۔ ان میں اس نے اپنے خیالات کے اصول اور اُن کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اس میں وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ تعلیم ازدیاد معلومات کے لئے نہ دی جائے بلکہ اس لئے کہ اس سے ذہنی نشو و نما ہو۔

ان کے علاوہ لاک کی اور بھی تصانیف ہیں جن میں خصوصاً سیاسیات سے بحث کی گئی ہے۔ چونکہ تعلیمی خیالات سے ان میں بحث نہیں کی گئی ہے اس لئے وہ ہمارے لئے

زیادہ اہم نہیں ہے۔

لاک ایک آزاد خیال آدمی تھا۔ مدرسۂ وسٹ منسٹر ہی میں اس کے استاد بُش بی (Bushby) کی آزاد خیالی کا اثر پڑا تھا۔ ڈیکارٹ کے تصانیف بھی اس کی نظر سے گذریں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کی ہر تحریر میں آزادی کا انداز پاتے ہیں۔ مثلاً اس زمانہ کے قدیم خیال (Divine right of kingship) کا وہ قائل نہ تھا اور بادشاہت کی بجائے اُس نے آئینی حکومت کو فوقیت دی۔ یہی حال اس کا تعلیمی مسائل میں بھی ہے۔ وہ اپنے مقلدین رُوسُو وغیرہ کی طرح اپنے زمانے کے خیالات کو بغیر تنقید کے قبول کرنے سے انکار کرتا تھا۔ وہ مروجہ اور قدیم خیالات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے سے پہلے قبول کرنا غلطی سمجھتا تھا۔ صداقت ہمیشہ لاک کا مطمح نظر رہی ہے۔ اور اس کا خیال تھا کہ عقل کی رہبری ہی سے صداقت تک رسائی یقینی ہو سکتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہمارے تعصاب اور مروجہ خیالات ہم کو صداقت تک پہونچنے سے باز رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم ان قدیم چیزوں کا لحاظ نہ کریں اور ہر خیال کی تنقید کر کے عقل کی رہبری میں صداقت تک رسائی حاصل کریں۔ عقل کی رہبری پر اس کو کامل اعتماد ہے اور اس کو یقین ہے کہ اس طرح پر عمل کرنے سے انسان بھٹکنے سے محفوظ رہتا ہے۔ اس ایقان میں اس کو غلو ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اگر ایمانداری کے ساتھ مسائل پر معقول غور و خوض کیا جائے تو اختلاف پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ صداقت کی تلاش اور عقل کی رہبری پر اعتماد یہ دو، لاک کے خصوصیات ہیں۔

لاک کے تعلیمی خیالات دوسرے مصلحین تعلیم سے مختلف تھے، جو اس سے پہلے گذرے ہیں۔ وہ یہ کہتا ہے کہ تعلیم کا مقصد ذہنی نشو و نما ہے نہ کہ اضافۂ معلومات۔ نیز مُروجہ تعلیم میں طلبہ کو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ مفید نہیں ہوتیں کیوں کہ طلبہ ان خیالات کو اساتذہ سے سن کر یاد کر لیتے ہیں۔ ان پر غور و خوض کر کے جذب نہیں کرتے۔ اس کی رائے میں صرف وہی علم پختہ ہے جو اپنے حواس کی مدد اور ذاتی غور و خوض سے حاصل ہوا ہو۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچپن میں ذہن اس قدر پختہ نہیں ہوتا کہ خیالات پر اس طرح غور و خوض کرے۔ پھر اس زمانے میں کس قسم کی تعلیم دی جانی چاہئے؟ لاک کا خیال ہے کہ بچپن میں صرف جسمانی تربیت کا بطور خاص اہتمام کیا جائے اور دوسرے یہ کہ بچوں میں اچھے عادات پیدا کئے جائیں۔ اس باب میں بھی لاک کے خیالات اور ول

سے مختلف ہیں۔

بچے کے متعلق اس کا خیال ہے کہ اس کا ذہن ایک معرّا کاغذ کے مثل ہے یا بالفاظ دیگر موم کی طرح ہے اور وہ جس طرح چاہیں موڑا جا سکتا ہے۔ مگر لاک کا یہ خیال دوسرے ماہرین تعلیم سے بالکل مختلف ہے۔ چنانچہ کمینیس کا خیال ہے کہ فطرت نے ہم میں علم، نیکی اور پرہیزگاری کی صلاحیت رکھی ہے۔ تعلیم کی غایت یہ ہے کہ ان میں زیادتی اور پختگی پیدا کرے۔"

لاک نے ہمیں بتلایا ہے کہ بچے کی تعلیم وہی قابل لحاظ ہے جو وہ خود اپنے حواس اور عقل کی مدد سے حاصل کرے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک (Sense Realist) کی طرح تجربے اور مشاہدے پر زور دیتا ہے۔ لاک میں اس کے علاوہ Humanistic Realism بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ یونانی السنہ کو کلچرل فوائد کے خیال سے شامل نصاب کرنے کی سفارش کرتا تھا۔ کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ شرفا زادے یونانی تعلیم کے ذریعہ تہذیب و شائستگی حاصل کر سکیں گے۔ مگر وہ لاطینی زبان کی تحصیل کو غیر ضروری قرار دیتا ہے۔ بہر حال قدیم زبانوں کی تحصیل کی سفارش بھی اس لئے کی ہے کہ اس سے اہم اور مفید نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ لاک (Socialistic Realist) بھی تھا۔ تعلیم میں وہ ایسے مصروفیات اور مشاغل کی سفارش کرتا ہے جس سے طلبہ آگے چل کر علمی، سماجی اور سیاسی زندگی میں کامیاب طور پر حصہ لے سکیں۔ مثلاً وہ زمانۂ تعلیم میں سیر و سیاحت کو بھی ضروری خیال کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سیر و سیاحت ۱۶ سال سے پہلے کی جائے۔ کیوں کہ اس زمانے میں طلبہ غیر زبان آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔ یا ۲۱ سال کے بعد جب طلبہ اس قابل ہوں گے کہ وہ بیرون ممالک کے حالات پر غور کر سکیں۔ ۱۶ سے ۲۱ سال کا زمانہ، وطن ہی میں رہ کر حصول علم میں گذارنا چاہئے۔ لاک کی رائے میں یہ زمانہ سیر و سیاحت کے لئے مفید نہیں۔ اس کے خیالات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں مانٹین، ملٹن، بیکن، راٹکے اور کمینیس کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مانٹین نے بھی سیر و سیاحت کو طلبہ کے لئے ضروری قرار دیا ہے گو اس نے عمر کی کوئی قید نہیں عائد کی دوسری چیز جس میں ہم لاک کو مانٹین کا ہم خیال پاتے ہیں وہ نصاب تعلیمی سے متعلق ہے، دونوں عمرانی علوم کو زور دیتے تھے مثلاً سیاسیات، تاریخ اور قانون جس میں بین الاقوامی قانون

بھی شامل ہو۔

قدیم ادبی تعلیم کے متعلق لاک کے خیالات پر ملٹن کا اثر پایا جاتا ہے۔ دونوں قدیم کلچر کو پسند کرتے تھے اور دونوں کا خیال یہ تھا کہ یونانی السنہ جاننے سے مقصد یہ نہیں کہ طلبہ میں مشق پیدا کی جائے بلکہ یہ کہ قدیم تمدن سے واقف ہو کر اپنے زبان کے حالات میں مناسب اصلاحات کی جائیں۔ اس طرح لاک اور ملٹن دونوں یہ چاہتے تھے کہ ایسے خیالات و معلومات حاصل کرنے چاہئیں جو ہماری زندگی میں کام آئیں۔

کمینیس کی طرح لاک بھی وسیع بنیاد پر تعلیم دینے کا حامی تھا۔ اور دونوں دوران تعلیم میں مشاہدات و تجربات پر زیادہ زور دیتے تھے۔ ان کے خیال میں حواس کی تربیت اہم تھی۔ نصاب تعلیمی میں بھی ان میں ہم خیالی پائی جاتی ہے۔ مثلاً دونوں نیچر اسٹڈی پر زور دیتے ہیں گو اس باب میں لاک کے خیالات کمینیس کی طرح واضح اور صاف نہیں ہیں۔ طریق تعلیم میں بھی دونوں اس حد تک متفق ہیں کہ تدریس دل چسپ ہو اور ضبط ایسا ہو کہ اس میں نرمی اور صلاحیت پائی جائے۔

سب سے بڑی خدمت جو لاک نے کی وہ یہ تھی کہ سترہویں صدی میں اس نے موضوعی تربیت کے نظرئے کی بنا ڈالی۔ اس نظرئے کا تعلق اس کے فلسفے سے بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بچے کا ذہن بالکل ایک سادہ کاغذ کی طرح خالی ہوتا ہے جس پر تجربے اور مشاہدے کے اثرات حواس کے ذریعے ہوتے ہیں۔ جب ذہن میں خیالات آجائیں تو اُن کے صحت اور خوبی کی جانچ ضروری ہو جاتی ہے۔ اُن میں امتیاز محسوس کرنے کے لئے مشق اور تربیت درکار ہے۔ کیونکہ اُس کی رائے میں وہی آدمی اچھے اور معقول امتیازات کر سکے گا جس نے مشق بہم پہنچائی ہو اب رہا یہ سوال کہ یہ ذہنی تربیت اور مشق کس طرح بہم پہونچائی جائے تو اُس کے لئے لاک ریاضی کی تحصیل پر زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ریاضی کی تعلیم سے ان کو بڑے عالم ریاضی بنانا مقصود نہیں بلکہ ان میں معقول ذہنیت پیدا کرنا ہے۔ جس سے وہ دوسرے امور میں بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے (Sciences) کے اکتساب پر بھی زور دیتا ہے۔ تاکہ وسیع نظر اور امتیازی قوت پیدا ہو سکے جو طلبہ کی ذہنی تربیت کا باعث ہو۔

اخلاقی تربیت کے متعلق وہ کہتا ہے کہ انسان غلط اور مضر خیالات کو عقل

کی رہبری سے روک سکتا ہے۔ مگر اس کے لئے مشق کی ضرورت ہے۔ اس لئے ابتدا ہی سے اپنے نفس پر قابو حاصل کرنے کی تعلیم پر زور دینا چاہئے۔

جسمانی تربیت کے لئے وہ سفارش کرتا ہے کہ بچے کو سختیاں برداشت کرنے کا عادی بنانا چاہئے۔ اس پر بے ضرورت لباس لادنے اور جسم کو حساس بنانے سے پرہیز کیا جائے۔ بچھونا بہت نرم نہ ہو اور اس کو دھوپ میں کھیلنے کی اجازت ہو۔ اس طرح لاک کے تعلیمی خیالات میں جو اصول ساری نظر آتا ہے وہ تربیت (Disc ipline) ہے۔ ذہنی تربیت کے لئے وہ ریاضی اور دوسرے سائنسوں کی تحصیل پر زور دیتا ہے۔ اخلاقی تربیت کے لئے عقل کی رہبری پر اور جسمانی تربیت کے لئے سختیاں برداشت کرنے کی (Hardening Process) سفارش کرتا ہے۔

اس طرح لاک موضوعی تربیت کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ جس کے رو سے بعض مضامین کی تحصیل سے ایک عام ذہنی تربیت ہوتی ہے اور اس سے دوسرے تمام مضامین کے حصول میں مدد ملتی ہے۔ انیسویں صدی کے آخری حصے میں اس نظرئے کی بہت مخالفت کی گئی۔ مگر یہ ردِ عمل اب بہت کم ہو گیا ہے اور لاک کے خیالات کی خوبی ایک حد تک تسلیم کی جاتی ہے۔

لاک کے تعلیمی مقاصد کے ۴ حصے کئے جا سکتے ہیں۔ نیکی، فہم، تربیت اور تعلیم۔ مگر اس نے اپنی کتابوں میں اس امر کی وضاحت نہیں کی ہے کہ طلبہ کو نیکی کس طرح سکھائی جائے۔ اسی طرح فہم کے باب میں بھی کوئی وضاحت نہیں پائی جاتی۔ گو اس نے بیان کیا ہے کہ فہیم وہی شخص ہے جو روزمرہ زندگی کامیابی سے بسر کرے۔ بچوں کی تربیت کے متعلق بھی اس نے اپنے خیالات کی توضیح نہیں کی ہے۔ البتہ تعلیم کے متعلق ایک تفصیلی اور مقرون تجویز پیش کی ہے۔ اس نے نصاب تعلیم کے چھ حصے کئے ہیں۔ پہلے حصے میں پڑھنا، لکھنا اور نقشہ کشی شامل ہے۔ دوسرے حصے میں جدید و قدیم السنہ کی تعلیم شریک ہے۔ تیسرے حصے میں جغرافیہ حساب، ہیئت، تاریخ اور ہندسہ شریک ہیں۔ چوتھا حصہ وہ ہے جس میں اخلاقیات۔ ملکی اور بین الاقوامی قانون شامل ہیں۔ پانچویں حصے میں فن تقریر و تحریر اور ان کے لوازمات شریک ہیں اور آخری حصے میں گھوڑے کی سواری، رقص، دستی مشاغل باغبانی وغیرہ کے حصول کی سفارش کی گئی ہے۔

اس نصاب سے واضح ہے کہ لاک کے تعلیمی خیالات میں کافی وسعت تھی اس میں

میں وہ تمام مضامین شریک ہیں جو ہماری روزمرہ زندگی میں کار آمد ہوتے ہیں۔ البتہ اس نصاب میں قدیم السنہ پر زیادہ زور نہیں دیا گیا اور نہ فنون لطیفہ کو جگہ دی گئی۔ کیونکہ لاک اُن کی تحصیل کو نسبتاً کم مفید سمجھتا تھا۔ بجائے ان کے قانون اور عملی مصروفیات پر وہ زیادہ زور دیتا تھا۔

لاک کے خیالات کا اثر صرف انگلستان تک ہی محدود نہیں۔ سارے یورپ میں اس کے تعلیمی خیالات کا اثر پایا جاتا ہے۔ مثلاً فرانس اور جرمنی میں جسمانی تربیت کو جو اہمیت دی جاتی ہے وہ اس کے خیالات کا اثر ہے گو فلسفے کا ماہر ہونے کی حیثیت سے بھی اس کو کافی شہرت حاصل ہے۔ مگر تعلیمی خیالات کے لحاظ سے بھی نہ صرف انگلستان بلکہ سارے یورپ کا ایک قابل قدر ماہر تعلیم شمار کیا جاتا ہے۔

کارگذاری انجمن اساتذہ بلدہ

بابتہ ششماہی دوم ۱۳۴۳ف

(از مرزا ضیاء الدین بیگ صاحب بی۔اے۔بی ٹی ناظر تعلیمات بلدہ)

انجمن اساتذہ بلدہ کے حسابات بابتہ ۱۳۴۲ف کی تنقیح کے لئے مسٹر ڈینکٹ نرسمم و مولوی شرف الدین صاحب کو مقرر کیا گیا تھا، جنہوں نے بعد تنقیح ایک مبسوط رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ پر رائے ظاہر کرنے اور طریقہ کار کے متعلق مفید مشورہ دینے کے لئے ایک ذیلی کمیٹی جو ارکان ذیل پر مشتمل تھی مقرر کی گئی - جناب مولوی سید خیرات علی صاحب۔ جناب مولوی سعادت اللہ خاں صاحب و جناب مولوی عبدالوہاب صاحب معتمد عمومی۔

اس کمیٹی کے دو جلسے منعقد ہوئے۔ جس میں رپورٹ مرتب کرکے مرکزی انتظامی کمیٹی میں پیش کی گئی۔ جو بہ غلبۂ آرا منظور ہوئی۔ امید ہے کہ اس رپورٹ پر عمل پیرا ہونے سے کارپردازان انجمن کو سہولت ہوگی۔

آیندہ سالانہ کانفرنس کا اجلاس ماہ دے ۱۳۴۴ف کے ہفتہ اول میں منعقد ہونا قرار پایا ہے۔ کانفرنس کی تاریخ مقرر کرنے و دیگر ضروری انتظامات پر غور کرنے کے لئے حسب ذیل ارکان کی ایک ذیلی کمیٹی مقرر ہوئی۔ یقین ہے کہ ارکان کمیٹی کے مفید مشوروں سے کانفرنس نہایت کامیاب ثابت ہوگی۔

(۱) جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔اے میر مجلس انجمن۔
(۲) " " سید خیرات علی صاحب۔
(۳) " " عبدالستار صاحب سبحانی۔
(۴) " " سید مجتبیٰ حسین صاحب نقوی۔
(۵) " مس وبسٹر۔
(۶) " مسٹر جی۔ سندرم۔
(۷) " مسٹر چندراورکر۔
(۸) " مولوی نظیر حسین شریف صاحب۔
(۹) معتمد عمومی۔

جناب مولوی شیخ ابوالحسن صاحب اڈیشنل مددگار نظامت تعلیمات ملک سرکار عالی کا جو وائس پریسیڈنٹ انجمن تھے صدر مہتمم تعلیمات اورنگ آباد پر تبادلہ ہونے سے مرکزی انتظامی کمیٹی نے جناب مولوی عبدالستار صاحب سبحانی کو بہ غلبۂ آرا وائس پریسیڈنٹ مقرر کیا ہے۔

جناب مولوی سالم بن سعید صاحب کو جو بغرض تعلیم ولایت گئے ہیں مرکزی انتظامی کمیٹی نے آخر ماہ اگسٹ میں آل ورلڈ ایجوکیشن کانفرنس میں بہ مقام وانا (آسٹریا) شرکت کے لئے انجمن ہذا کی جانب سے نامزد کیا گیا ہے۔

سہ ماہی حال میں مختلف مراکز انجمن میں حسب ذیل عنوان مباحث کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔

(۱) کتب خانۂ مدرسہ اور طلبہ کا اُس سے استفادہ۔
(۲) یہ کہاں تک ممکن ہے کہ مروجہ تحریری امتحان کے ساتھ ساتھ تقریری آزمائش بھی شریک رہے۔
(۳) ہر مرکز میں عنوان کتب خانہ پر ایک لکچر ہو اور جناب سید محمد ہادی صاحب سے استدعا کی جائے کہ اس کا انتظام فرمائیں۔ (۴) مادری زبان کی تعلیم۔

مسٹر مترے صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ امدادی اعزہ کے انتقال پُرملال پر مرکزی انتظامی کمیٹی نے اُن کے پس ماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔

تنقید و تبصرہ

شہادت نامہ مولوی عبد السلام صاحب ذکی بی۔ اے (عثمانیہ) کی تازہ تالیف ہے۔ واقعہ فاجعہ کربلا کو نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں مستند تواریخ سے قلم بند کیا ہے، واقعات کا تسلسل اور اُن کی صحت نیز ارتقائے مضامین قابل تعریف ہونے کے علاوہ اسالیب بیان مُوثر اور پُر درد ہیں۔

قیمت ایک روپیہ سکہ عثمانیہ۔ حیدرآباد کے مشہور کتب فروشوں سے مل سکتی ہے۔

گلزار اطفال یہ مجموعہ جو ۲۵ نظموں پر مشتمل ہے۔ مولوی عبد السلام صاحب ذکی کی ذکاوت طبعی کا نتیجہ ہے۔ ننھے ننھے بچوں اور لڑکوں کی جبلتوں کو پیش نظر رکھ کر اُن کے مذاق اور استعداد کے مطابق خُوب خُوب نظمیں لکھی گئی ہیں۔ اردو ادب میں ایسی نظموں کی کمی ہے۔ جس خوبی کے ساتھ ذکی صاحب نے اس کمی کو پُورا کیا ہے وہ لائق داد اور قابل مبارکباد ہے یقین ہے کہ یہ مجموعہ قبول ہوگا اور نونہالان ملک اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

قیمت ۶ر حیدرآباد کے مشہور کتب فروشوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

راہ سعادت جماعت تحتانیہ کی اخلاقی تعلیم کے لئے سررشتہ تعلیمات کے ایک پختہ کار مدرس مولوی محسن خاں صاحب متین نے تالیف کی ہے۔ اس میں گیارہ عنوانات پر نہایت ہی سلیس اور سبق آموز حکایات قلم بند کی گئی ہیں جو ہندو اور مسلمان طلبہ دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ متین صاحب نے چھوٹے بچوں کے استعداد کے مطابق بالکل اُن کی سطح پر آکر یہ کتاب تالیف کی ہے۔ ایسی کتابوں کی اُردو ادب میں بہت کمی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب طلبہ کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

قیمت ۴ر ۶ر۔ مؤلف یا حاجی غلام دستگیر تاجر کتب حیدرآباد سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

اصول حفظ صحت مؤلفہ سید شرف الدین قادری ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

چونکہ مضمون حفظ صحت مدارس سرکار عالی میں داخل نصاب ہے اس لئے اس مضمون پر بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے رسالے تالیف ہوئے ہیں اُن میں سے "اصول حفظ صحت" مؤلفہ سید شرف الدین قادری ایم۔ اے۔ بی ٹی بھی ہیں ریویو کی غرض سے وصول

ہوا ہے اس رسالے کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ یہ مدرسین کی رہنمائی کے لئے بہ نسبت بچوں کے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ اس میں بیماری کے عام اسباب ہوا، پانی، غذا، روشنی، ورزش، صفائی، امراض متعدی وغیرہ کے متعلق بالکل سائنٹیفک طریقے پر بحث کی گئی ہے بچے خود اس کو پڑھ کر بغیر ایک قابل مدرس کی مدد کے سمجھ نہیں سکتے البتہ جماعت ہفتم کے بچے اس کو سمجھ سکیں تو سمجھ سکیں اگر انہیں مباحث کو جدید اصول تعلیم کے مطابق آسان اور عام فہم سوال وجواب کی شکل میں پیش کیا جاتا اور موقع بہ موقع بچوں کی دلچسپی کے لئے تصویریں بھی دی جاتیں تو طبقہ تحتانیہ کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوتا۔

حفظانِ صحت کی ترکیب صحیح نہیں ہے اس کی جگہ 'حفظ صحت' استعمال ہونا چاہیئے بررشتہ تعلیم کے ارکان کا فرض اولین ہے کہ الفاظ کی صحت کے متعلق کافی تحقیق سے کام لیں۔ گو عوام میں یہ غلط اصطلاح رائج ہے مگر ہمیں اس کی تقلید کی کیا ضرورت ہے۔ بجائے اصول حفظان صحت' اصول حفظ صحت' لکھنا درست ہوگا۔

آخر میں ہم قابل مؤلف کی تحقیق اور مضامین کی حسن ترتیب و اختصار کے معترف ہیں کہ انہوں نے ایک چھوٹے سے رسالے میں حفظ صحت کے متعلق کافی مواد جمع کر دیا ہے اور سب ضروری امور پر روشنی ڈالی ہے اور اس امر کی سفارش کرتے ہیں کہ جو اساتذہ صاحبان "حفظ صحت" پڑھاتے ہیں وہ ضرور اس رسالے کو اپنے پاس رکھیں گے۔

ضرب ۴۲۷ یہ ۴۷۸ سے تفریق کرنے پر باقی ۵۱ بچے۔ لہذا جواب ۶۷ اور باقی ۵۱۔

اس کے بعد متعدد سوالات اسی قسم کی مشق کے لئے دئے جائیں۔

اس کے بعد ایسی مثالیں پیش کی جائیں کہ خارج قسمت دریافت کرنے میں بچوں کو اور بھی مشکل محسوس ہو۔ یعنی مندرجہ بالا طریقوں پر صحیح خارج قسمت دریافت کرنے میں مشکل پیش آوے۔

مثال ۹۲ ÷ ۳۲

سوال مذکور کے حل میں یہ دیکھنا ہوگا کہ ۹ دہائیوں میں ۳ کتنی مرتبہ تفریق ہو سکتا ہے۔ جواب ۳ بار۔ اب ۳۲ کو ۳ میں ضرب دینے سے حاصل ضرب ۹۶ آتا ہے جو ۹۲ سے بڑا ہونے کی وجہ سے ۹۲ میں سے تفریق ہونا ممکن نہیں (حسابی لحاظ سے)۔ چونکہ ۹۲ میں سے ۹۶ تفریق نہیں ہو سکتا لہذا خارج قسمت ۳ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اب ۳۲ کو ۲ میں ضرب دینا ہوگا جس کا حاصل ضرب ۶۴ ہے یہ ۹۲ میں سے تفریق کرنے پر باقی ۲۸ رہے لہذا خارج قسمت میں بجائے ۳ کے دو لکھنا ہوگا۔ جواب ۲ باقی ۲۸

```
      ۲
۳۲) ۹۲
    ۶۴
    ۲۸
```

اسی نمونہ کا دوسرا سوال ۲۶۵۵ ÷ ۹۴ دیکر بچوں سے حل کروایا جائے۔ نہ آنے کی صورت میں مدرس واضح طور پر سمجھائے اور مشق کرائے۔

چھوٹی تقسیم میں باقی ظاہر کرنے کا طریقہ

چھوٹی تقسیم میں باقی ظاہر کرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔

مثال۔ ۲۴۷ ÷ ۷ کا عمل و جواب دو طرح سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

(ا) ۷) ۲۴۷ — ۳۵ - ۲ باقی

(ب) ۷) ۲۴۷ — ۳۵ $\frac{۲}{۷}$

یا خارج قسمت ۳۵ اور باقی ۲ یا ۳۵ $\frac{۲}{۷}$ جواب

ان میں سے طریقہ (ا) چھوٹی جماعتوں کے لئے استعمال میں لایا جائے۔ اور جماعت چہارم کے طلبہ کے لئے جن کو کسر کا تصور دلایا گیا ہو طریقہ (ب) بتایا جائے تو کچھ عیب نہ ہوگا۔ بعض طلبہ باقی کچھ اور ہی طریقہ سے ظاہر کرتے ہیں جو بالکل غلط ہے وہ مندرجہ بالا سوال کو حسب ذیل طور پر بتاتے ہیں۔ ۷) ۲۴۷ — ۳۵ + ۲ اس طریقہ سے باقی ظاہر کرنے میں ۳۵ اور ۲ کے درجے بالکل ہی نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ شاید اُن کا یہ خیال ہوگا کہ علامت + سے اور کے معنی ظاہر ہوتے ہیں لہذا ۳۵ + ۲ سے مراد

ان کے خیال سے خارج قسمت ۳۵ اور باقی ۲ ہوگا۔ اور باقی ۲ رہتے ہیں، اس جملہ کے بجائے مختصر طور پر ۲+ لکھ دیتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔

بعض طلبہ جواب لکھنے میں ایک اور غلطی کرتے ہیں وہ یہ بتاتے ہیں کہ جواب = ۳۵ باقی ۲۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ خارج ۳۵، باقی ۲ یا ۳۵ ۲/۷ (جن کو کسر سے واقفیت ہو)

ایسی صورت میں طلبہ کو یہ بتایا جائے کہ ۳۵ + ۲ کے معنی ۳۷ ہوتے ہیں لہذا خارج قسمت اور باقی کو علامت + سے کبھی مربوط نہ کیا جائے۔ اُن کو علامت ، سے الگ کیا جائے اور لفظ باقی استعمال میں لایا جائے۔

تقسیم بذریعہ اجزاءِ ضربی

بعض وقت اجزاءِ ضربی کے ذریعہ تقسیم کا عمل زیادہ آسان ہوتا ہے۔

مثال۔ ۳۳۶ ÷ ۴۲

سوال مذکور کو اگر بذریعہ اجزاءِ ضربی حل کرنا ہو تو پہلے ۴۲ کے اجزاءِ ضربی دریافت کرنے ہوں گے۔

۴۲ کے اجزاءِ ضربی ۲ × ۳ × ۷ ہیں ان اجزاءِ ضربی پر ۳۳۶ کو متواتر تقسیم کیا جائے۔

$$42 \left\{ \begin{array}{l} 2\,)\,\underline{336} \\ 3\,)\,\underline{168} \\ 7\,)\,\underline{\ \ 56} \\ \quad\ \ 8 \text{ جواب} \end{array} \right. \qquad \begin{array}{r} 8 \\ 42\,)\,\overline{336} \\ \underline{336} \\ \text{خارج قسمت } 8 \end{array}$$

تقسیم بذریعہ اجزاءِ ضربی مندرجہ ذیل شکل سے زیادہ واضح ہو سکتی ہے۔

تقسیم کرنے سے ہر ایک حصہ ۸ کا ہوگا لہذا ۳۳۶ ÷ ۴۲ = ۸
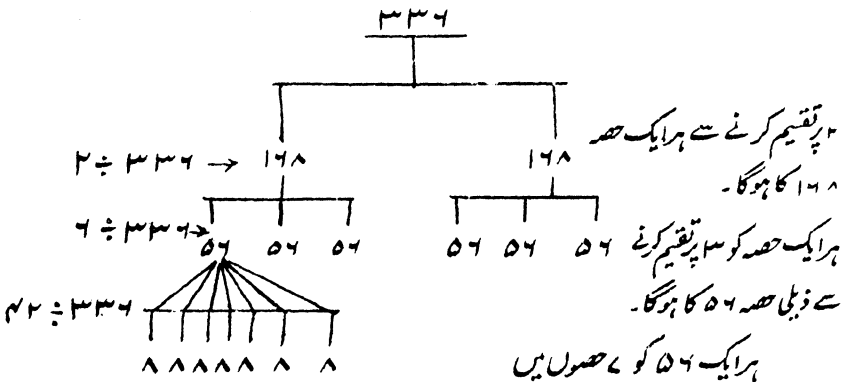
تقسیم کے بغیر باقی کے سوالات اجزاءِ ضربی کے ذریعہ حل کرنا کسی قدر آسان ہے۔ مگر ایسے سوالات جن میں باقی بچے۔ حل کرنا مشکل ہے۔ ہر ایک جزوِ ضربی پر تقسیم کرنے سے باقی بچے تو جملہ باقی دریافت کرنا

چھوٹے بچوں کے لئے ایک پیچیدہ کام ہے۔ لہذا ایسے سوالات حل کرنے کا اور کل باقی دریافت کرنے کا قاعدہ احتیاط سے سمجھایا جائے۔ اور سہولت سے کام لیا جائے۔ عجلت سے کام لینا فائدہ مند نہ ہوگا اجزاء ضربی کی تقسیم میں باقی دریافت کرنے کا مسئلہ پریشانی پیدا کرتا ہے۔ اور یہ طریقہ عام طور پر رائج بھی نہیں ہے۔ لہذا بالکل چھوٹے بچوں کو یہ قاعدہ سمجھانے میں زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے۔ البتہ بڑی (اعلیٰ) جماعتوں کو حسب ذیل طریقہ پر یہ قاعدہ سمجھانا مناسب ہوگا۔

مثال۔ ۴۷ ÷ ۶ بذریعہ اجزاء ضربی ۶ کے اجزاء ضربی ۲ × ۳

۲	۴۷
۳	۲۳ ← ڈھیر ہر ایک ڈھیر دو دو کا باقی ۱ اکائی
	۷ ← ڈھیر ہر ایک ڈھیر چھ چھ کا باقی ۲ ڈھیر دو دو کے

جواب خارج قسمت ۷ کل باقی ۴ + ۱ یعنے ۵ اکائیاں یا ۴ اکائیاں

۲) ۴۷
۳) ۲۳
۷ ۔ ۲ × ۲ باقی ۱ باقی ۲ } = ۱ + ۴

∴ کل باقی ۱ + ۴ = ۵

مثال ۴۷ ÷ ۶

۴۷
باقی ۱ اکائی ۲۳ ۲۳
باقی ۲ × ۲ = ۴ اکائیاں ۷ ۷ ۷ ۷ ۷ ۷
باقی ۲ باقی ۲

۷ خارج قسمت
۶) ۴۷
۴۲
۵ باقی

خارج قسمت ۷ باقی کل ۵ (= ۴ + ۱)

مثال۔ ۳۷ ÷ ۱۵ بذریعہ اجزاء ضربی

۱۵ کے اجزاء ضربی ۳ × ۵

۲ خارج قسمت
۱۵) ۳۷
۳۰
۷ باقی

۳	۳۷
۵	۱۲ ← ڈھیر تین تین کے باقی ۱ اکائی
	۲ ← ڈھیر پندرہ پندرہ کے باقی ۲ ڈھیر تین تین کے یعنے ۶ اکائیاں

∴ کل باقی ۶ + ۱ = ۷

∴ جواب خارج قسمت ۲ اور کل باقی ۷

مثال ۔ مذکور کو بذریعہ شکل زیادہ واضح کیا جاسکتا ہے۔

۰۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲

۱ ۲ ۶ + ۱ باقی

∴ جواب خارج قسمت ۲ باقی ۶ + ۱ یعنی ۷

۱۵)۳۷(۲
۳۰
۷

مثال ۔ ۲۳۷ ÷ ۴۲ کو بذریعہ اجزار ضربی حل کرو۔

۴۲ کے اجزار ۲ × ۳ × ۷ عمل حسب ذیل ہوگا۔

۲ | ۲۳۷
۳ | ۱۱۸ — باقی ۱
۷ | ۳۹ — باقی ۱
۵ — باقی ۴

اگر سوال کا حل اس طرح بتایا جائے تو بچے کل باقی کو ٹھیک طور پر نہیں بتاسکیں گے۔ ہر ایک باقی میں باقی کا درجہ (اصل مقدار) اگر معلوم ہو تو کل باقی دریافت کرنا آسان ہوگا۔

متذکرہ بالا سوال میں ۲۳۷ کو ۲ پر تقسیم کرنے سے ۱۱۸ حصے ہوں گے ہر ایک حصے میں دو دو اکائیاں ہوں گی اور باقی ۱ اکائی رہیگی ۱۱۸ حصوں کو ۳ پر تقسیم کرنے سے ۳۹ حصے بڑے ہوں گے اور ہر ایک ایسے حصے میں ۲ × ۳ یعنی چھ چھ اکائیاں ہوں گی اور باقی ایک حصہ دو اکائیوں کا رہے گا یعنی یہاں ایک کی اصل قیمت ۱ × ۲ = ۲ ہے یعنی دوسری تقسیم میں دراصل ۲ اکائیاں باقی رہیں۔ ۳۹ بڑے حصوں کو اور ۷ بہت بڑے بڑے حصوں میں تقسیم کیا تو ایسے حصوں کی تعداد ۵ ہوئی۔ لیکن ہر ایک حصہ کی مقدار دراصل ۲ × ۳ × ۷ = ۴۲ ہوئی اور باقی ۴ بڑے حصے رہے۔ اُن ۴ حصوں کی اصل مقدار ۴ × ۶ = ۲۴ اکائیاں ہے۔ یعنی تینوں تقسیم میں اصل باقی بالترتیب ۱، ۲، ۲۴ اکائیاں رہی یعنے کل باقی ۱ + ۲ + ۲۴ = ۲۷ اکائیاں ہوئیں جس کی تصدیق لمبی تقسیم سے کی جاسکتی ہے۔

۴۲)۲۳۷(۵ خارج قسمت
۲۱۰
۲۷ باقی

∴ خارج قسمت ۵، باقی ۲۴ + ۲ + ۱ = ۲۷

∴ جواب ۵ باقی ۲۷

مثال مذکور کی تصدیق بذریعہ شکل۔

۲۳۷					
۱۱۸			۱۱۸		
۳۹	۳۹	۳۹	۳۹	۳۹	۳۹
۵ ۵ ۵ ۵ ۵ ۵ ۵	۵ ۵ ۵ ۵ ۵ ۵ ۵	۵ ۵ ۵ ۵ ۵ ۵ ۵	۵ ۵ ۵ ۵ ۵ ۵ ۵	۵ ۵ ۵ ۵ ۵ ۵ ۵	۵ ۵ ۵ ۵ ۵ ۵ ۵
باقی ۴	باقی ۴	باقی ۴	باقی ۴	باقی ۴	باقی ۴

خارج قسمت ۵ باقی ۱ + ۲ + ۲۴ = ۲۷

اجزاء ضربی کے ذریعہ تقسیم سمجھنے اور سمجھانے میں کسی قدر مشکل تو محسوس ہوگی۔ اس کے عادی ہونے کے لئے بہت کچھ مشق کی ضرورت ہے۔ چھوٹے ہندسوں کی حد تک یہ طریقہ آلات تعلیمی کے ذریعہ سمجھایا جا سکتا ہے۔ بڑے بڑے اعداد کی تقسیم کے لئے صرف الفاظ اور علامات ہی کام میں لانے پڑتے ہیں۔ مدرس صبر سے کام لے تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ جس قدر دیگر قاعدوں کے سوالات عجلت اور صحت کے ساتھ حل کرنا مشق پر مبنی ہے اسی قدر اس میں بھی سوالات عجلت اور صحت کے ساتھ حل کرانے کی غرض سے کافی مشق کی ضرورت ہے۔

لمبی تقسیم کا ایطالوی (Italian) یا آسٹریائی (Austrian) طریقہ

مندرجہ ذیل مثال کا عمل لمبی تقسیم اور ایطالوی طریقہ تقسیم سے بتایا جاتا ہے۔

مثال۔ ۱۴۹۷۸۹ ÷ ۶۵

معمولی طریقہ

خارج قسمت　۲۳۰۴

```
        ۲ ۳ ۰ ۴
۶۵) ۱۴۹۷۸۹
    ۱۳۰
    ----
     ۱۹۷
     ۱۹۵
    ----
       ۲۸۹
       ۲۶۰
    ----
       ۲۹ باقی
```

ایطالوی یا اسٹریائی طریقہ

```
        ۲ ۳ ۰ ۴
۶۵) ۱۴۹۷۸۹
     ۱۹۷
       ۲۸۹
باقی   ۲۹
```

ایطالوی طریقہ تقسیم میں ضرب اور تکمیلی جمع کے عمل دل ہی میں ہی کرنے ہوتے ہیں صرف باقی نیچے اتارا جاتا ہے۔ ایطالوی طریقہ تقسیم کا عمل الفاظ میں ذیل میں درج ہے۔

(ا) ۲ پنجے ۱۰ اور ۹ ۱۹ حاصل آیا ۱
۲ چھکے ۱۲، ۱۲ اور ۱، ۱۳ اور ۱ ۱۴ } پہلی باقی ۱۹ اوپر لئے ۷

(ب) ۳ پنجے ۱۵ اور ۲ ۱۷ حاصل آیا ۱
۳ چھکے ۱۸ اور ۱ ۱۹ اور صفر ۱۹ } دوسری باقی ۲ اوپر لئے ۸

(ج) ۲ کے ساتھ ۸ رکھنے سے ۲۸ ہوتے ہیں جو ۶۵ سے کم ہیں لہذا خارج قسمت میں صفر۔ ۲۸ کے ساتھ ۹ لئے۔

(د) ۴ پنجے ۲۰ اور ۹ ۲۹ حاصل آئے ۲
۴ چھکے ۲۴ اور ۲ ۲۶ اور ۲ ۲۸ } آخری باقی ۲۹

یہ طریقہ بالکل مختصر اور سادہ ہے اور حقیقت میں بڑی عمر کے طلبہ کے لئے کافی مشق ہونے پر یہ طریقہ آسان اور تیز بھی ہے۔ چھوٹے بچوں کو یہ طریقہ بتانا گویا اُن کو پریشان کرنا ہوگا۔

ایطالوی طریقہ سے تقسیم کے سوالات حل کرنے کے لئے بالکل ایک ہی طرف متوجہ رہنے کی ضرورت ہے ورنہ غلطی کا اندیشہ ہے۔ معمولی طریقہ سے سوالات حل کرنے میں غلطی اگر ہو تو اُس کو جلد معلوم کرسکتے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک ذیلی اور جزوی عمل وہاں موجود ہوتا ہے۔ لیکن ایطالوی طریقہ میں غلطی ہو تو سوال پھر ابتدا سے کرنا پڑتا ہے۔ بعض وقت یہ طریقہ زیادہ طول طویل بھی ہوتا ہے۔ مثلاً تقسیم کے کسی سوال میں اگر خارج قسمت میں ۴ ۳ ۴ ۳ عدد آجائے تو طریقہ مذکور میں ۴ مرتبہ زبانی ضرب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن معمولی طریقہ میں ۳ اور ۴ کی ایک مرتبہ کی ہوئی ضرب کی نقل اُتارنے سے کام ہوسکتا ہے یعنی صرف دو ہی مرتبہ ضرب

کا عمل کرنا پڑتا ہے۔

بعض لوگ تقسیم کے سوالات حل کرنے میں حسب ذیل طریقہ اختیار کرتے ہیں۔
مقسوم علیہ میں جو عدد ہو اُس کے ا سے ۹ تک کے حاصل ضرب کاغذ کے ایک طرف لکھ رکھتے ہیں اور اُن میں سے جس حاصل ضرب کی ضرورت ہو اُس کو تفریق کے لئے اتار لیتے ہیں۔ مثلاً مندرجہ بالا مثال میں ۶۵ ÷ ۱۴۹۷۸۹ کا عمل کرنے کے لئے ۶۵ × ۹ تک کے حاصل ضربوں کا ایک تختہ تیار کرتے ہیں اُن میں سے جس حاصل ضرب کی ضرورت ہو لیتے ہیں اور مقسوم میں سے تفریق کرتے ہیں۔ اس طریقہ سے غلطی ہونے کا اندیشہ کسی قدر کم ہو سکتا ہے۔

۱	۶۵
۲	۱۳۰
۳	۱۹۵
۴	۲۶۰
۵	۳۲۵
۶	۳۹۰
۷	۴۵۵
۸	۵۲۰
۹	۵۸۵

تقسیم کے مختصر طریقے بعض صورتوں میں تقسیم کے عمل میں ضرب کی مدد سے کسی قدر تخفیف ہو سکتی ہے۔ مثلاً

(۱) اگر کسی عدد کو ۵ پر تقسیم کرنا ہو تو اُس عدد کو ۱۰ پر تقسیم کیا جائے اور خارج قسمت کو ۲ میں ضرب دی جائے۔ یا پہلے ۲ میں ضرب دیکر بعد میں ۱۰ پر تقسیم کی جائے۔

مثال۔ ۲۶۵ = ۲ × ۱۳۲٫۵ = ۵ ÷ ۱۳۲۵

۲۶۵ = ۱۰ ÷ ۲۶۵۰ = ۱۰ ÷ (۲ × ۱۳۲۵) =

(۲) اگر کسی عدد کو ۲۵ پر تقسیم کرنا ہو تو اس عدد کو ۱۰۰ پر تقسیم کیا جائے اور خارج قسمت کو ۴ میں ضرب دی جائے یا پہلے ۴ میں ضرب دے کر بعد میں ۱۰۰ پر تقسیم کی جائے۔

مثال۔ ۵۳ = ۴ × ۱۳٫۲۵ = ۲۵ ÷ ۱۳۲۵

۵۳ = ۱۰۰ ÷ ۵۳۰۰ = ۱۰۰ ÷ (۱۲٫۲۵ × ۴) =

(۳) اگر کسی عدد کو ۱۲۵ پر تقسیم کرنا ہو تو اس عدد کو ۱۰۰۰ پر تقسیم کیا جائے اور خارج قسمت کو ۸ میں ضرب دی جائے یا پہلے ۸ میں ضرب دے کر بعد میں ۱۰۰۰ پر تقسیم کی جائے۔

مثال۔ ۱۶۲۵ ÷ ۱۲۵ = ۱٫۶۲۵ × ۸ = ۱۳

= (۱۶۲۵ × ۸) ÷ ۱۰۰۰ = ۱۳۰۰۰ ÷ ۱۰۰۰ = ۱۳

ضرب کے مختصر طریقے

اب اُن کو ضرب کے بھی مختصر طریقے بتائے جاسکتے ہیں۔

(۱) اگر کسی عدد کو ۵ میں ضرب دینا ہو تو اُس عدد کو ۱۰ میں ضرب دے کر حاصل ضرب کو ۲ پر تقسیم کیا جائے۔

مثال۔ ۵ × ۱۲ = (۱۰ × ۱۲) ÷ ۲ = ۱۲۰ ÷ ۲ = ۶۰

(۲) اگر کسی عدد کو ۲۵ میں ضرب دینا ہو تو اُس عدد کو ۱۰۰ میں ضرب دیکر حاصل ضرب کو ۴ پر تقسیم کیا جائے۔

مثال۔ ۲۵ × ۲۴ = (۱۰۰ × ۲۴) ÷ ۴ = ۲۴۰۰ ÷ ۴ = ۶۰۰

(۳) اگر کسی عدد کو ۱۲۵ میں ضرب دینا ہو تو اُس عدد کو ۱۰۰۰ میں ضرب دیکر حاصل ضرب کو ۸ پر تقسیم کیا جائے۔

مثال۔ ۱۲۵ × ۱۱۲ = (۱۰۰۰ × ۱۱۲) ÷ ۸ = ۱۴۰۰۰

تقسیم میں ذیل کے چار اعداد ہوتے ہیں

(۱) مقسوم علیہ (۲) مقسوم (۳) خارج قسمت (۴) باقی
اِن میں سے مقسوم علیہ اور خارج قسمت آپس میں تبدیل کئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ باقی ہر دو سے کم ہو۔ لہٰذا مشق کے لئے مندرجہ ذیل قسم کے سوالات دیکر مُعرّا خانوں کی تکمیل بچوں سے کرائی جائے تو مناسب ہوگا۔

مقسوم علیہ	مقسوم	خارج قسمت	باقی
۲۳	۶۸۱۴	؟	؟
۲۷	؟	۱۳	۲۵
؟	۴۹۸۱	۲۷	؟
؟	۱۰۰۰	۱۲	۲۸

مرکب قاعدے

سکے۔ وزن۔ ناپ۔ طول وغیرہ کے پیمانوں کا تصور پیمانے سکھاتے وقت مندرجہ ذیل اصول مدنظر رکھے جائیں۔

(۱) پیمانے حساب کی کچھ الگ شاخ نہیں ہیں۔ چند پیمانوں کا تصور پہاڑے سکھاتے وقت بھی دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ۴ پیسے کا ایک گنڈہ یا ۴ انگریزی (کلدار) پیسے کا ایک آنہ

وغیرہ پیمانے ۴ کا پہاڑہ سکھاتے وقت بتائے جا سکتے ہیں۔ اور اُس پر سوال بھی کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ۴ پیسے کا ایک گنڈہ ہوتا ہے تو ۲۴ پیسوں کے کتنے گنڈے ہوں گے؟ کلدار ۴ پیسوں کا ایک آنہ ہوتا ہے تو ۲۰ پیسے کلدار کے کتنے آنے ہوں گے؟ ۶ کا پہاڑہ پڑھاتے وقت اُن کو یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ۶ پیسے حالی کا ایک آنہ ہوتا ہے ۱۲ پیسے حالی کے دو آنے ہوں گے ۱۸ پیسوں کے ۳ آنے وغیرہ اور اُس پر سوالات بھی کئے جا سکتے ہیں جو ۶ کا پہاڑہ استعمال میں لاکر بچے حل کر سکیں گے۔ مثلاً ۶ پیسے کا ایک آنہ ہو تو ۳۰ پیسے کے کتنے آنے ہوں گے۔

جہاں تک ہو سکے پیمانوں کی تفہیم بذریعہ اشیا متعلقہ دلائی جائے۔ مثلاً تولہ کا تصور روپیہ یا آدھا آنہ بتا کر دلایا جائے۔ اوزان کا تصور دلاتے وقت ترازو کا استعمال بچوں سے کرایا جائے انہیں کی کوشش سے چیزیں تُلوا کر پیمانہ اخذ کرایا جائے۔ ترازو کا استعمال کرکے ایک پلڑے میں ۵ تولے (روپے یا آدھے آنے) اور دوسرے پلڑے میں چھٹانک کا بٹ رکھ کر اُن سے دونوں وزنوں کا مقابلہ کرا کے یہ نتیجہ اخذ کرایا جائے کہ ۵ تولے کا وزن ایک چھٹانک کے وزن کے برابر ہوتا ہے۔ یعنی ۵ تولے = ایک چھٹانک یہ پیمانہ ۵ کے پہاڑے کے ساتھ بتایا جا سکتا ہے تاکہ ۵ کے پہاڑے کی مشق اور چھٹانک کا تصور دونوں باتیں آسانی سے وقت واحد میں تکمیل کو پہونچ جائیں۔ ۲ آنہ کی ایک دوانی۔ چار آنہ کی ایک چوانی ۲ چونیوں کی ایک اٹھنی ۴ چونیوں کا ایک روپیہ وغیرہ کے پیمانے پہاڑوں کے ساتھ بھی بتائے جا سکتے ہیں۔

(۲) پیمانے ایسے ہی بتائے جائیں کہ جو روزمرہ کاروبار میں یا لین دین میں استعمال میں آتے ہوں۔ جماعت اول کے طلبہ کو پنس۔ شلنگ۔ پونڈ وغیرہ کے پیمانے بتانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ کیوں کہ یہ سکے ہندوستان میں رائج نہیں ہیں اور وہ اکثر طلبہ کے دیکھنے میں بھی نہیں آتے۔ البتہ پیسہ۔ پاؤ آنہ (کلدار)۔ آنہ دوانی وغیرہ سکے وہ ہر روز دیکھتے ہیں لہذا ان پیمانہ کی تفہیم دینے میں کچھ ہرج نہیں ہے۔ اسی طرح دوسری جماعت کو اونس۔ پونڈ۔ کوارٹر وغیرہ ٹن تک کا پیمانہ بتانا بھی بے سود ہے کیونکہ یہ اوزان اُن کے دیکھنے میں نہیں آتے۔ البتہ ماشہ۔ تولہ چھٹانک۔ پاؤ سیر۔ سیر وغیرہ اوزان و ناپ بتا کر پیمانہ سکھایا جائے۔

(۳) پیمانوں کی لفظی تعلیم ہرگز نہ دی جائے۔ کیوں کہ محض لفظی معلومات دل پر نقش نہیں ہو سکتے۔ اور جلد بھول جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ لہذا اُن کی تعلیم حتی الامکان بذریعہ اشیا متعلقہ ہی دی جائے۔ سکوں کا پیمانہ بتاتے وقت سکے بتائے جائیں۔ ہاتھ میں دئے جائیں

بچوں میں مختلف سکے تقسیم کرا کے آپس میں اُن کا تبادلہ کرایا جائے مثلاً کسی کے پاس ۴ چونیاں ہوں وہ جس کے پاس ایک روپیہ ہو اس کو ۴ چونیاں دے کر اُن کے عوض میں ایک روپیہ لے لئے ۔ ۴ دوانیاں جس کے پاس ہیں وہ اٹھنی والے کے پاس جا کر ۴ دوانیاں دے کر ایک اٹھنی لے گا۔

اوزان کے پیمانے سکھاتے وقت ترازو اور مختلف اوزان پیش کرکے بچوں سے تلوایا جائے ۔ پیمانوں سے نپوایا جائے ۔ تاکہ ان کو آیندہ زمانہ میں تقریباً اندازہ لگانے میں سہولت ہو ۔ وزن کرنے کے لئے ریتی ۔ مٹی ۔ کنکر وغیرہ کا استعمال کیا جائے ۔

(۴) اگر ایک ہی پیمانہ میں بہت سی ذیلی باتیں بتانی ہوں تو وہ پیمانہ ایک ہی روز میں پورا نہ بتایا جائے ۔ بلکہ سبق مذکور کے چند حصّے کئے جائیں اور ایک ایک حصہ وقت واحد میں بتایا جائے ورنہ اُس پیمانہ کا پختہ تصور نہ ہوگا۔

(۵) پیمانے سکھانے کے بعد بچوں کو اس طرح عادی بنایا جائے کہ وہ وزن ۔ بلندی عرض طول وغیرہ اندازہ سے بتا سکیں ۔

طول (قدمی پیمانے) وغیرہ کا تصور دلاتے وقت انچ ۔ فٹ ۔ گز وغیرہ کا تصور بچوں سے پیمائش کراکے دلایا جائے ۔ محض ۱۲ انچ کا ایک فٹ ۳ فٹ کا ایک گز یہ کہہ دینا کافی نہ ہوگا ۔ جب تک انچ کیا چیز ہے ۔ نہ معلوم ہو بچوں کو فٹ کا تصور نہیں ہو سکتا جب تک ایک فٹ کا اندازہ معلوم نہ ہو بچے گز کا خیال نہیں کر سکتے ۔ میز ۔ کرسی ۔ فرش ۔ تختہ سیاہ سلیٹ وغیرہ کا طول و عرض بچوں سے بنوالیا جائے ۔

تحویل نزولی

ابتدا میں تحویل نزولی کے سوالات زبانی حل کرائے جائیں اور اس کی تصدیق اشیاء متعلقہ کے ذریعہ کرائی جائے۔ مثلاً بچوں کو مروجہ سکوں کا تصور اگر کافی طور پر دلایا گیا ہو تو مندرجہ ذیل قسم کے سوالات حل کرنے کے لئے دئے جاسکتے ہیں۔

۲ آنے کے کتنے پیسے ہوتے ہیں؟ ایک آنہ = ۶ پیسے حالی یا ۴ پیسے کلدار

حل۔ ۲ × ۶ = ۱۲ پیسے حالی یا ۲ × ۴ = ۸ پیسے کلدار

۳ دوانیوں کے کتنے آنے ہوتے ہیں ایک دوانی = ۲ آنے

∴ ۳ دوانیاں = ۳ × ۲ = ۶ آنے

اس قسم کے سوالات حل کرا کے اُن سے یہ بات اخذ کرائی جائے کہ آنوں کے پیسے بناتے وقت ایک آنے کے جتنے پیسے ہوتے ہیں اُس سے آنوں کی تعداد کو ضرب دی جائے تو آنوں کے پیسوں کی تعداد معلوم ہوسکتی ہے۔ اسی طرح روپیوں کے آنے بناتے وقت ایک روپیہ کے جتنے آنے ہوتے ہیں اس عدد سے (یعنی ۱۶ سے) روپیوں کی تعداد کو ضرب دیتے ہیں تو روپیوں کے آنوں کی تعداد معلوم ہوسکتی ہے۔

اسی طرح اوزان کے متعلق بھی مندرجہ ذیل قسم کے سوالات دئے جائیں۔

۲ سیر میں کتنے پاؤ سیر ہوتے ہیں ایک سیر = ۴ پاؤ سیر

∴ ۲ سیر = ۲ × ۴ = ۸ پاؤ سیر

۳ سیر میں کتنے آدھ سیر ہوتے ہیں۔ ایک سیر = ۲ آدھ سیر۔

∴ ۳ سیر = ۳ × ۲ = ۶ آدھ سیر

۴ سیر میں کتنے چھٹانک ہوتے ہیں۔ ایک سیر = ۱۶ چھٹانک ∴ ۴ سیر = ۴ × ۱۶ = ۶۴ چھٹانک۔ زبانی سوالات حل کرنے پر تحریری مثالیں اُن سے حل کروائی جائیں۔ اُوپر کی مثالوں سے اُن کو یہ معلوم ہوگا کہ ایسی مثالیں حل کرنے میں ضرب کا عمل کرنا پڑتا ہے۔

اس کے بعد ایسے سوالات دئے جائیں کہ ادنیٰ درجہ کی اکائیوں میں تحویل کرنے کی ضرورت ہو۔ مثلاً ۱۲ روپیہ ۳ آنہ کے کُل کتنے آنے ہوں گے؟ یہاں بچوں سے بذریعہ

سوال وجواب طریقہ عمل دریافت کرایا جائے۔ اور اُن سے یہ بات اخذ کرائی جائے کہ پہلے روپیوں کے آنے بنائے جائیں (جو روپیوں کی تعداد کو ۱۶ میں ضرب دینے سے معلوم ہوسکتے ہیں) اور ان آنوں کی تعداد میں اصلی آنے جو سوال میں دئے ہوئے ہیں جمع کئے جائیں۔ اور جواب بتایا جائے عمل حسب ذیل ہوگا۔

روپیہ	آنے
۱۲	۳
×۱۶ ←	۱۹۲
	۱۹۵ آنے جواب

اس کے بعد ایسے سوالات دئے جائیں جن میں اعلیٰ درجہ کی دو سے زیادہ اکائیوں کو ادنیٰ درجہ کی اکائیوں میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہو۔ مثلاً ۴ من ۱۶ سیر ۸ چھٹانک میں کل کتنے چھٹانک ہوں گے۔ عمل

من	سیر	چھٹانک
۴	۱۶	۸
×۴۰ ←	۱۶۰	↓
	۱۷۶	
	×۱۶ ←	۲۸۱۶
	جواب	۲۸۲۴ چھٹانک

یہاں پر یہ بات بتائی جائے کہ من کے سیر بنانے کے بعد وہ مقدار سیر کے درجہ میں لکھ دی جائے اور سیر میں اصلی سیر جمع کئے جائیں اور سیر کے چھٹانک بنانے کے بعد چھٹانک کے درجہ میں لکھ دئے جائیں اور اُن چھٹانکوں میں اصلی چھٹانک جمع کئے جائیں حاصل جمع سوال کا جواب ہوگا۔ اس قسم کے اور سوالات مشق کے لئے دئے جائیں جن میں بچوں کی قوت متخیلہ اور استدلال کی تربیت ہو۔

مشقی مثالیں۔ (۱) ایک ایک آنے والے ٹپہ کے ٹکٹ ۴ روپیہ ۸ آنہ میں کتنے ملیں گے (۲) ہر ایک فقیر کو دو دو پیسے کے حساب سے ۴ آنے کتنے فقیروں میں تقسیم ہوں گے۔ (۳) آدھ آنہ کو ایک سیب کے حساب سے آٹھ آنے میں کتنے سیب آئیں گے۔ (۴) ایک گوالی کے پاس ساڑھے چار سیر دودھ تھا وہ پاؤسیر کے ناپ سے دودھ دیتا تھا۔ تو اُس نے کتنے پاؤسیر دودھ ناپ کردئے۔

اعلیٰ درجہ کی اکائیوں کو ادنیٰ درجہ کی اکائیوں میں تبدیل کرنے کے عمل کو تحویل نزولی کہتے ہیں۔ یہ تعریف بچوں کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ اصطلاحات بتانے کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ سوال کے مضمون سے جواب نکالنے کے لئے طریقہ عمل معلوم ہو تو کافی ہے۔

ments which are frequently conditioned by them. They refer to character more than academic achievements and are difficult to appraise, but it can be done as certain schools have shown. The entrance qualifications for the Army, Navy, Church etc., attempt to do this as these qualities are all-important in those professions, but they are really just as important in other professions, e. g., a boy by his unselfishness, initiative and service given to school activities generally may prejudice his success or distinction from an academic point of view, yet these are all-important traits in his general training. Such aspects of his training are considered very little, if at all, in the ordinary examination, yet they are vital in connection with true citizenship.

The consideration of these facts would merge our enquiry into the much larger question of the true aim and end of all education, which can not be considered here. It would certainly appear, however, that an examination award gained by narrow concentration on examination work to the total neglect of the more human and social affairs of life should not, on any real criterion based on the implications of the very word University, be the sole passport to entrance there. At any rate, such characteristics as have been indicated should at least be considered along with the purely academic ones in estimating a boy's fitness or otherwise for a University career.

REVIEWS

THE FIELD—Madras. (Annual subscription Rs. 5.)

The Sporting public of India will welcome the appearance of *The Field-Madras* as there has been a long felt want for a sporting journal in this country. It is not only well got up but contains useful and instructive matter on all forms of sport. It publishes a short life sketch of one of the well known sportsmen of India every month, gives a full account of recent sporting events and publishes articles written by persons who are considered authorities on various games. The Board of Cricket Control in India and the All India Lawn Tennis Association have rightly thought it fit to make it their official organ.

We recommend *The Field* to all the educational institutions in the Hyderabad State and to the sporting public at large. S. M. H.

The New Era English Readers.

The New Era English Readers are an addition to the set of Readers that are now being written with certain definite aims in view. They contain many phrases and sentences that are used in everyday speech, in the class-room and outside it. Teachers will find them useful for teaching English conversation in the lower classes. M. A. R.

but for some it is difficult, as we still need tests of attainment as well as of capacity. Hence mental tests can never wholly replace examinations but they could be incorporated in such a way as to balance the extreme variability of the ordinary examination method. It certainly would help to do away somewhat with the subjective variation in marking, almost unavoidable under present conditions.

Such mental tests have been included in the Leaving Certificate examination of certain countries—and they are especially useful in border-line cases where decisions have to be made between a pass and failure. This would mean additional staff for such an examination and a staff trained in such tests, but eventually this could be done, just as it has been accomplished in other countries.

A recent enquiry conducted in England by an educational expert tended to prove that there was a considerable discrepancy between the early success of students in the Leaving Certificate examination and their later performance at College: here again the prognostic value of the examination was at fault. Whereas at Columbia University, for instance, the performance of students' intelligence tests given on entry proved a more reliable prophecy of their success at the end of their first years' work than did the results of the Entrance examination. To quote the expressed opinion of the college "From an attitude of healthy if not severe, scepticism towards the use of intelligence tests for this purpose, the whole College administration came within the space of two years, to consider the intelligence tests as an indispensable part, not only of the admission machinery, but also of the administration of the College in the Dean's Office."

Further there are certain kinds of ability which examinations do not test. They are very important in later life and in school also and often determine success or failure at the University and in life far more than academic attain-

Editorial

The question of the reliability of examinations in estimating a student's knowledge and capacity is one of constant interest and with every published list of examination successes the question is put with ever increasing emphasis.

We must first ask what is the aim of certain examinations e. g. the Leaving Certificate. Presumably it is to indicate that a student has reached a certain standard of education which should enable him to enter any ordinary occupation and carry on the business of life generally. At any rate it denotes a certain standard which has come to be thought sufficient for the ordinary purposes of life. This appear to be the general estimate held by the public regarding the examination.

But as things are at present, it also has another purpose to fulfil and that is to decide whether or not a pupil is fit to receive higher education, especially at the University. It is this second aspect, in as much as failure blocks a university career, that seems open to question. Further, as scholarships are often awarded on its results and this involves public money, efforts should be made to see that the adjudications are made as correctly as possible.

There are so many variable factors in an examination that to make a boy's whole professional career stand or fall by a few hours concentrated work does not seem the most equitable way of settling the question. The variable factors are :— the form of the candidate on the particular day, different standards of examiners, the subjective variations in marking, luck in question etc. etc.

This instability of the ordinary examination has of late years been thrown into relief by the remarkable constancy achieved in the marking of Mental Tests. If such tests could be applied to every subject it might be a solution,

Statement showing the number of candidates in various English High Schools of the Dominions who appeared and passed in the H. S. L. C. Public Examination of 1934.

NAME OF SCHOOL.	Appeared.	Passed. I	Passed. II	Passed. III	Total.	Percentage of Passes.
Osmania Intermediate College, Aurangabad	43	2	14	12	28	65
Chaderghat High School	77	0	19	21	40	52
Govt. City College	66	1	11	18	30	45
Osmania Intermediate College, Gulburga .	30	1	4	8	13	43
Jagirdars' College, Begumpet	12	0	2	0	2	17
Madrasaei Aliya	19	0	4	3	7	38
Osmania Intermediate College, Warangal .	23	2	10	7	19	83
Osmania University College for Women...	3	0	2	1	3	100
All Saints' High School	19	0	2	10	12	63
Bolarum High School	13	0	2	7	9	69
Dharamwant High School	12	0	3	3	6	50
Hamdard High School	5	0	0	1	1	20
Islamia High School	11	0	3	2	5	45
Madrasai Aizza	3	0	0	0	0	0
Mahboob College	59	0	18	19	37	63
Methodist Boys High School	33	0	4	5	9	27
Mufidul Anam High School	18	0	3	7	10	56
Nutan Vidyalay High School, Gulbarga ...	36	1	7	9	17	47
S. P. G. High School, Secunderabad ...	10	0	2	2	4	40
Vivek Vardhini High School	94	2	22	25	49	52
Keye's High School, Secunderabad ...	13	0	5	4	9	69
Wesleyan High School, do ...	52	0	18	12	25	48
Stanley Girls High School	17	0	1	8	9	53
Private Males	214	0	10	69	79	37
Private Girls	14	0	0	6	6	43
Teachers	8	0	0	2	2	25
Grand Total.	904	9	161	261	431	48

Serial No.	NAME OF SCHOOL.	Amount received. O.S. Rs.	A.	P.
44	Govt. Jangammeth Primary School ...	6	5	0
45	,, Gosha Mahal Middle School	19	8	8
		B.G. 0	1	0
46	,, Chandrayangutta Primary School ...	1	4	0
47	,, Dabirpura Primary School	4	3	0
48	,, Osman Shahi ,, ,, ...	4	0	0
49	Anjuman Khadimul Muslmin School ...	5	10	0
50	Govt. Golconda Middle School	15	12	9
51	St. George's Grammar School	531	0	0
52	Govt. Tarbund Primary School	1	4	0
53	,, Chowrahe Jinsi Primary School ...	1	9	0
54	,, Lingampalli Primary School ...	8	12	2
55	Faizul Anam Primary School	5	0	0
56	Govt. New Nampalli Primary School ...	6	11	2
57	,, Chelapura Primary School	4	6	0
58	Poor School, Ghansi Bazar	5	3	0
59	Govt. Daire Barhane Shah Primary School ...	2	6	4
60	Anwarul Uloom High School	2	2	0
61	Poor School, Daricha Mata	0	12	0
62	Sitaram Patha Shala	1	0	0
63	Rifae Am Middle School	9	7	0
64	Govt. Darus Shifa High School	31	14	0
65	Govt. Kala Dera Primary School	4	13	0
66	,, Shah Ali Bunda Middle School ...	18	6	10
67	,, Chanchalguda High School	49	4	0
68	Aided School, Mewatipura	0	14	0
69	Shamsul Uloom School	1	0	0
70	Meerajul Uloom School	1	1	0
71	Ashraful Madaris School	4	4	0

TOTAL. O. S. Rs. 1571 11 0+B. G. Rs. 2 3 0.

List of schools in the Head Quarters Division which have contributed to His Excellency The Viceroy's Bihar Earthquake Relief Fund.

Serial No.	NAME OF SCHOOLS.	Amount received. O.S. Rs.	A.	P.
1	Mufidul Anam High School	20	0	0
2	Vivek Vardhini High School	187	13	2
3	Govt. Begam Bazar Primary School... ...	10	10	6
4	Rifae-Ul-Muslmin School, Filkhana... ...	4	12	3
5	Govt. Kotla Akbar Jah Primary School ...	8	9	4
6	,, Amirpet Primary School	5	13	4
7	,, Sultan Bazar Middle School	74	0	10
8	,, Panjagutta Primary School	1	12	4
9	Kayasth Patha Shala	6	8	0
10	Govt. Mouzam Shahi Primary School ...	10	0	6
11	Aizza High School	31	11	6
12	Govt. Sultan Shahi Primary School... ...	6	3	8
13	,, Narayanguda ,, ,, ...	8	10	10
14	,, Shah Gunj Middle School	42	13	0
		B.G.0	2	0
15	,, Urdu Sharif ,, ,, ...	54	5	2
16	,, Yaqootpura Primary School	10	6	6
17	,, Chaderghat ,, ,, ...	14	7	10
18	Dharamwanth High School	25	0	0
19	Govt. Nampalli ,, ...	62	15	8
		B.G.2	0	0
20	,, Daricha Bawahir Primary School ...	4	1	0
21	,, Rein Bazar Primary School	2	11	2
22	,, Alave Yatiman ,, ,, ...	7	14	2
23	,, Afzal Gunj ,, ,, ...	7	8	10
24	Poor School, Lalamian Lane	1	10	0
25	Kadaria School	0	12	0
26	Kanzal-Uloom School	0	12	0
27	All Saints High School	30	0	0
28	Hashimia School, Sultan Bazar	3	10	0
29	Govt. Chudi Bazar Primary School	12	5	0
30	,, Chilkalguda ,, ,, ...	4	7	0
31	Govt. Darul Uloom High School	33	12	0
32	Govt. Pahadi Sharif Primary School ...	2	0	0
33	Asafia High School	28	2	6
34	Govt. Aliabad Primary School	6	10	0
35	,, Lal Darwaza Primary School ...	2	2	8
36	,, Fateh Darwaza Primary School ...	2	0	0
37	,, Gowlipura Primary School	1	9	4
38	,, Khairatabad ,, ,, ...	18	15	2
39	,, Mogalpura ,, ,, ...	12	8	6
40	,, Kachiguda Middle ,, ...	33	0	0
41	,, Kulsumpura Primary ,, ...	4	1	2
42	,, Mustaidpura Middle ,, ...	13	9	10
43	Excelsior Middle School	3	1	0

The Hyderabad Teachers' Association Educational Exhibition, 1934.

The following classification has been decided upon for the Educational Exhibition to be held during the second week of November, 1934 :

Classification.

High Section Boys & Girls.

1. Pencil Drawing.
2. Geographical and Historical Charts and Models (class work).
3. Manual work (Boys). Fancy sewing (Girls).

Middle Section.

1. Pencil Drawing.
2. Map-drawing books.
3. Geographical and Historical Charts and Models (Class work.)
4. Manual work (Boys).
   Plain sewing (Girls). (Fancy sewing will not be accepted).

Primary Section.

(8 to 11 years).

1. Urdu Handwriting Copy books.
2. English Handwriting Copy books.
3. Drawing Books.
4. Hand work.

(6 to 8 years).

1. Drawing.
2. Hand work.
3. Group work.
   (a) Geography.
   (b) Nature Study.
   (c) Drawing.
   (d) Hand work.

Kindergarten (6 years and under).

1. Best set of Hand-work Exhibits from Kindergarten schools.
2. Best set of Drawing Exhibits from Kindergarten schools.

Teachers.

1. Illustrative Drawing for schools use.
2. Teaching Aids.
3. Art, (Drawing and Painting).

Industrial Schools Exhibits.

Non-competitive Display.

There will also be a School Gardens Competition, and the judging will take place early in October.

Nazir Husain Sharif,
Secretary, Exhibition Committee.

11. The Doctrine of Lapse was followed by (Bentick, Wellesly, Dalahousie).

It is difficult to prepare questions of this type. The value of this test lies in the fact that it is objective, and no two examiners can give varying marks.

The Completion Test.

Rewrite the following sentences, filling up the blanks :—

1. The oldest books in India are the.................
2. Seleukos sent an ambassador named.................to live at the court of Pataliputra.
3. ....may have been one of the learned men who were called the "Nine gems" of Vikramaditya's court.
4. ....took for the first time the Rajput capital and fortress of Chitor.
5. ....built the lovely pearl mosque at Agra.
6. Aurangzeb captured the fort of Golconda from..............
7. ....rounded the Cape of Good Hope and landed at Calicut.
8. By the treaty of..............Raghoji Bhonsle ceded Orissa to the British
9. .... imprisoned the English in the Black Hole of Calcutta.
10. The Raja of Benares during the time of Warren Hastings was.................
11. Coorg was annexed by.................

While the new examination is superior in many ways, it fails to "test the power to initiate trains of thought and to express himself in words. The new Examiner cannot measure originality and he cannot measure felicity of expression. But even the Old examiner had no objective way of measuring these adequately.

When mathematicians want to find the degree of resemblance or "correlation" between two types of examinations, they indicate it by a decimal figure or percentage. If the orders were exactly the same, the figure would be 1·0· A high degree of resemblance between two types of examinations would be indicated by 0·7· A very slight degree of resemblance is indicated by the figure 0·2 or 0·3".

Statisticians have found out that a True-False test resembles an intelligence test more nearly than any other single test. The coefficient was ·406, as compared with ·344 for the essay and ·255 for the written work, thus showing that the True-False test measures intelligence more accurately than any other test.

In the recent Middle School Examination of the Methodist Boys' High School centre other types of tests were given :—

The Multiple-Choice Test.

Rewrite the following sentences, completing them, with the correct word within the brackets.

1. Chandragupta Maurya was helped by (Fa Hian, Sivaji, Chanakya).
2. Asoka conquered (Nepal, Kashmir, Kalinga).
3. Malik Kaffir invaded (Chitor, Dwarasamudra, Somnath).
4. Delhi was ruined in 1739 by the invasion of (Timur, Allauddin, Nadir Shah).
5. The British General at the battle of Wandiwash was (Sir Hector Munro, Sir Eyre Coote, Col. Monson).
6. Delhi was made the capital of India by (Queen Victoria, Edward VII, George V).
7. The first Viceroy of India was (Curzon, Warren Hastings, Canning).
8. The Great European war was waged when the Viceroy was (Lord Hardinge, Lord Minto, Lord Chelmsford).
9. The Subsidiary System was begun by (Dalhousie, Cornwallis, Wellesley.)
10. The Permanent Revenue Settlement was started by (Warren Hastings, Cornwallis, Bentick.)

Example :— (T) F The Khaiber Pass is an important route from India to Afghanistan.

T F 1. Nepal is a province of India.

T F 2. Ceylon has a distinct Government from that of India.

T F 3. The rainfall in the Indus Plain is adequate for agriculture.

T F 4. Amritsar is the sacred headquarters of the Hindus.

T F 5. Karachi exports a great deal of wheat.

T F 6. Gaya in Bengal grows rice and poppy seeds.

T F 7. Calcutta is not a great port because of the difficulties of navigation due to shifting shoals.

T F 8. Berar, formerly a part of Hyderabad, was long ago leased for ever to the British Government.

T F 9. The population of Hyderabad State is about thirty millions.

One of my friends, a teacher of several years' experience stood up and made a very vehement speech condemning the new examination as child-play. The chief criticism of the True-False test is that it is largely a game of chance. It must be admitted that this type of a test measures knowledge more accurately when there are 50 or 100 questions.

Suppose an examination of 50 questions is given to a student, and he knows the answers to 40 questions, which bring him 40 marks. Let us assume that he guesses the remaining questions and five of his guesses are correct and five wrong. His total marking will be $40+5-5=40$, so that the element of chance has not affected his total marking. Actual experience has shown this to be true, for when a student guesses, he guesses as many correctly as he guesses incorrectly.

Suppose another student is more lucky and knows definitely the answers of 40 questions correctly, and guesses 6 correctly and 4 incorrectly. Even in this case, his total marks are $40+6-4=42$, so that he gets only 2 marks more than he deserves.

Question 9. By selling an electric table-fan for Rs. 50 a merchant makes a profit of Rs. 10. Find his gain per cent. 7 marks.

Examinations have several purposes: they classify pupils, they diagnose their strong and weak points, and they evaluate the efficiency of instruction. For all these purposes the little problem with a definite point is of more value than the large and complicated problem. The unrealiability of the big question may become apparent from the experiences of my friend who did not know any Persian but was permitted to appear for his B. A. Examination. He memorised and learnt how to write three essays, hoping one of them would be asked in the examination. The examiner asked him to write an essay of six pages on how he proposed to spend his summer vacation. As this was not one of the three essays expected, he was very worried for a few minutes. A bright idea then struck him. He wrote in bad Persian that he was planning to go to Delhi in summer and then began his masterly and well-prepared essay on Delhi. The examiner declared that he had passed in the second division.

The True False Test.

The new examiner uses several devices of which the most common is the True-False test. At a recent teachers' meeting, I gave the following test :—

Geography of India.

Instructions :— Read these statements and put a circle around T if you think it is true, and a circle around F if you think it is false. Each statement marked correctly gives you a credit of one point; each incorrectly marked statement counts as a penalty against you, and is subtracted from your score; omitted statements count neither for nor against you. Your score will be based on True or False circles; do not waste time writing anything else. First, go through the list quickly and mark all that you know for certain at once; then go back and study out the harder ones. Do not guess; the chances are against you on guessing. Do not endanger your score by gambling on those questions about which you know nothing.

Twelve long questions of this type constituted the examination; the candidate was asked to solve eight questions, and if three of them were correct, he was declared to have passed the examination. Such a test has several defects. The question quoted above can be reduced to three or more simpler sums, and a student can commit a mistake at one of three or four stages, and there is bound to be great variation in correction.

In such long sums, examiners sometimes introduce "a catch", which may muddle the mind of the student. Then the examiner finds out what the student does not know rather than what he knows. In the type of examination quoted above, a student passes if he answers correctly three sums, with the result that many students lay special emphasis on a small part of their work. Students appearing for the High School Public Examination have often passed their examinations in Mathematics by mastering the chapters on compound interest, the solution of equations by graphical method and a limited knowledge of the geometry of circles.

The New Method

The function of the examination is to measure accurately. As the old type of questions did not enable us to do this, we gave last year 25 questions, including the subdivisions, for the Arithmetic examination of the third form students. The students were asked to do 23 of them. A larger portion was covered, and as a student had to do at least 16 sums to pass in the examination, the element of chance was considerably decreased. As the problems were simple and direct, the variation in marking was greately reduced.

The following are some of the questions.

Question 5. If ghee is sold at 14 chataks a rupee, how much have I to pay for $3\frac{1}{2}$ seers of ghee? (1 seer=16 chataks) 4 marks.

Question 8. Find the interest on Rs. 300 for $2\frac{1}{2}$ years at 10% per annum. 7 marks.

inspiring faith for him than the desire to acquire the necessary technique of education that will enable him to achieve at least in some measure this great aim and purpose of education.

Modern Methods of Examinations

BY

G. SUNDARAM, B. A.

Principal, Methodist Boys' High School, Hyderabad-Deccan.

The story is told of a rajah and his queen who were entertained by a strong man who could lift a cow. Turning to his queen, the raja said, "What wonderful strength !" The queen was somewhat cold and said that if she was given time, she too could perform the same feat. To prove it, she bought a calf which she could lift, and continued to lift it every day. As time rolled on, the calf became a large cow, and the queen could lift it and exhibit the feat before her royal master.

The new examiner believes in the principle of doing easy problems to master the more difficult ones. Ballard reminds us that the athletes of a former generation used heavy dumb-bells, some of them weighing seventy pounds. Their big biceps was formed at the expense of a weak heart. The modern gymnast is trained with light exercises and light apparatus.

The Old Method.

A few years ago, we gave for our Third Form boys the following question for their annual examination :—

A merchant buys oranges wholesale at Rs. 15 per thousand. He has also to pay Rs. 2-8-0 per thousand for railway and other charges, and he finds that 16% of the oranges get so much damaged in transit that they are unsaleable. At what rate per dozen must he sell his oranges so as to make a profit of 25% on his outlay ?

these natural, instinctive desires, is worse than useless. It will produce only misfits in life, for real fulfilment and achievement beneficial to society becomes possible only if the individual is helped to live in harmony with his environment and not when he is put in continual opposition to it. The upward and downward directions of these urges may be illustrated as follows:—

The Creative Urge
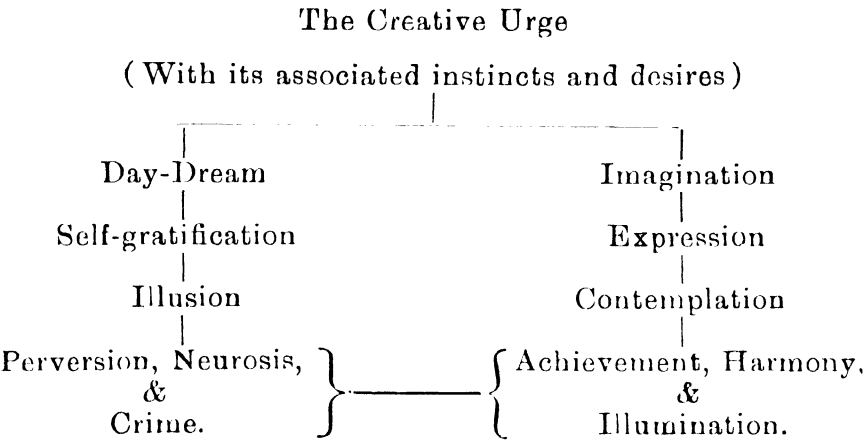
What do these facts briefly discussed above mean for educational practice? How are the truths of human psychology to be made a reality in education and through it for mankind as a whole? They just mean this: that if only the inhibitions and obstacles which work so much injury in the development of childhood could be removed by a more enlightened understanding of the needs of the child, and if parents and teachers through that understanding cease to fashion the children after their own pattern, and if we could achieve a dynamic synthesis of educative theory and practice, we would then release a vital power which will enable humanity through its youth to fashion itself in a better, finer and more beautiful pattern. The hope of the educator to-day is that the new-sprung desire for knowledge and enlightenment, will lead to a progressive realisation of freedom and creative power first in the homes, then in the schools and then spread through all human institutions. There can be no finer ideal for the teacher and no more

severely alone. In his latest book, "A Study in Synthesis" * Dr. Cousins says, "Life must find release in creation. The higher the point of release, the less urgently will it operate at lower levels, and the nearer will it appproach true spiritual creation and its accompanying joy"[1]. This is what Prof. L. P. Jacks means by his well-known phrase, "The Education of the Whole Man" which is also the title of one of his most illuminating books. The instinctive urge for aspiration and creation expressing itself in Religion and Art is not given any scope for fulfilling itself in our system of education, and as Dr. Cousins says, "Aspiration and creation cannot be omitted from life without impoverishment perhaps, disaster................They are of crucial importance in approaching the formulation of a true education"[2]. We often forget that the child is not only a "thinker", but also a "feeler" and a "doer".

From the foregoing remarks it is clear that a properly directed or "educated" (used in its etymological sense) wish or desire may, if opportunity arises, motivate actions of great value to society. The fantasy of hero-worship, for example, may, if motivated and guided wisely, result in a healthy ambition to be great and so on. Each different "wish" has its own positive (beneficent) as well as its negative (harmful) direction. The desire to be a Bradman may either dissipate itself in futile, undirected activity, or may result in creditable achievement in the realm of sport. The child living in the fantasy of his favourite cinema "star" may either become a great actor himself or waste his life in a futile dream of an unattainable ideal. Modern Psychology has proved very convincingly that all youthful delinquency, and we may add, delinquency and crime in after life, is self-expression "with a downward curve"[3]. Any system of education that does not provide the proper motive or the proper environment for the healthy realisation of

* "A Study in Synthesis" by Dr. James H. Cousins. (Ganesh & Co., Madras.)
1. pp. 406
2. pp. 373
3. "A Study in Synthesis" by Dr. J. H. Cousins, pp. 447

investigation into the common forms of "fantasy" among children will reveal the fact that in all cases the tendency to run away from reality was the result of some "urge" within the child which persistently seeks expression; it may be the urge for love, for companionship, for sympathy, for some creative action denied its proper satisfaction in the real world. The curriculum should utilize this urge by providing projects which will satisfy to some extent the desire for self-expression, the suppression of which is the main cause of "wish fantasies".

But the mere expansion of the curriculum can not solve the problem of day-dreaming completely, for it turns upon the whole conception of the educative process. Neither is it advisable, nor even desirable, to eradicate the habit of "day-dreaming" fully. After all, the imaginative faculty is one of the most valuable gifts of the human race. We all are given to day-dreaming in some form or other. All our actions proceed from a desire to do something that would satisfy us. We all want to assert ourselves; in fact, the instinct of "self-assertion" or the "power instinct" is the irrepressible motive of all human actions and in the sphere of artistic creation, day-dreaming is a necessary step. Shakespeare's famous lines about the poet and the faculty of imagination will perhaps give us an idea of the value of "creative" dreaming or "imagining' in the realm of beauty:

> And, as imagination bodies forth
> The forms of things unknown, the poet's pen
> Turns them to shapes, and gives to airy nothing
> A local habitation and a name.

All this simply shows that the Day-dream is not necessarily an evil, and it is the business of education to direct this "creative" urge into channels that will lead the child, not to the world of imbecile fantasy, but to the achievement of something beautiful and creative. Our present system of education, unfortunately, is satisfied with doctoring the mind; it leaves the other faculties

may lead to one or another of the many forms of mental abnormality or "fantasy", as it is known in analytical psychology. In all these forms of "fantasy", we will find that the dominating motive is always an irrepressible desire to escape from a world where the personality of the child is repressed, to an imaginary or fantastic world which is in harmony with his unsatisfied urge for self-assertion.

Interest in work depends upon many factors. But essentially, I think, it depends upon two of the most important of them —the personality of the teacher, and the suitability of the curriculum and its elasticity to "draw out", not one or two, but all the innate faculties of the child, *cognitive*, *emotional*, *intuitional* and *expressive*. In regard to the personality of the teacher, I think it is necessary to remember that personality does not necessarily mean only mental capacity or academic brilliance or even mere physical magnetism, but that it also depends upon many subtle, intangible factors which go to make up an individual's character. Ultimately, the teacher has to realise that teaching is a creative art, and requires a creative mind to give it its natural, spontaneous expression. The really good teacher is he who through his personality helps to create in the class-room and elsewhere an atmosphere against which a normal child will have no temptation to protest.

Apart from that, the whole technique of teaching and the planning of the curriculum require a thorough re-orientation. The curriculum that limits itself to the performance of dry routine of teaching and learning, can hardly satisfy the urge of the child to express himself in congenial activity. And if we realise that the habit of day-dreaming is more prevalent among boys and girls who are not successful in their normal scheduled work in the class-room, than among those who distinguish themselves, we will realise the need for an elastic system of education that will give every child an opportunity to feel that he is good at something. An

does not give any scope. The process of building this imaginary or "make-believe" world is generally known as Day-dreaming. This habit, when carried too far, becomes a great obstacle in after life, when the child grows older and has to shoulder life's responsibilities. Of course there are many men who are able to act consciously and intelligently, even in the midst of the day-dream, thus living simultaneously in two worlds, as it were. But often the habit so overmasters the mind, that the man abandons himself to the contemplation of the imaginary world and loses touch altogether with the real world.

The child who gets easily bored and whose attention wanders during a lesson is the most common type in the class-room. The educational waste that such children cause is a problem that has to be tackled with patience, intelligence and understanding by the teacher. And the first principle to be borne in mind by the teacher is that "interest" is essentially dependent upon "pleasure". Pleasurable activity, especially in a child, is that which is approved both by the conscious mind and the sub-conscious "wish" of the individual. Where the motive of the conscious mind is in conflict with that of the sub-conscious, the result is a dislocation of concentration, a disintegration of will and action, and as the human mind always seeks refuge from the unpleasant, the child creates a world of "make-believe" where he can take shelter from the unpleasant, discordant realities of his environment.

What is the solution that education can give to this significant problem and how is the teacher to tackle it in the course of his daily work? Without going into details, we can say that everything should be done to create proper "interest" in one's work, for interest is the first step in the realisation of that harmony between the child and his environment which is, after all, the most important purpose of education. The tendency to run away from "reality", when allowed to develop without restraint, as pointed above,

The "Day-Dream" Among Children: Its Significance in Education.

BY

H. SUNDER RAO, M. A.

(Madanapalle College).

The observation of children and the study of their behaviour in its cognitive, emotional and expressive (active) aspects is an essential part of the teacher's task. But it is not enough to understand in a general way a few obvious truths about what is vaguely termed as "Child Psychology". The knowledge that is being discovered about the nature of the child makes it abundantly clear that each child is a unique personality, an individual problem, and it is the primary task of the educator to study the various questions arising out of this truth and apply himself assiduously to their satisfactory solution. One of the most interesting of the problems of education in general and of child education in particular, on which the New Psychology throws a deal of light, is that connected with "Day-dreams".

The Day-dream is, in many cases, both among children and adults, a refuge from boredom and as such every one is prone to it. But in a child it also arises from causes that are deeper than mere boredom or lack of "interest". Often it is the result of bad treatment at home. The child is peculiarly sensitive to his environment and is able to preceive more keenly than the adult any jar that may be produced in his immediate surroundings. His emotional response to this jar or discord is a through dissatisfaction with the circumstances which produced it, and, being a creative artist, "of imagination all compact", he builds in his mind a world where he can satisfy those wishes and aspirations for whose fulfilment the real, work-a-day world

But the training in real thought was in some cases negligible. I was told that in Eastern Colleges the objective type of question papers only comprised one half of the marks allotted to any subject. The essay type so familiar to Indian students was insisted upon for the other half.

But the vastness of the continent has resulted in very different demands in the respective states, so that what I saw at Greeley must not be taken as representative of all.

All Colleges, however, seem marked by the spirit of co-operation between staff and students. The opinion of even the most immature is listened to with respect by the Faculty. This results in more initiative on the part of the taught, and as the modern world is so complex, the American Colleges seem to aim at keeping very closely in touch with life. The long distances from which their students are drawn mean that they become very adaptable, for often they are away for years at a time, boarding either alone or with friends.

Untrained teachers are compelled to attend summer courses at definite stated periods, and at Greeley some others like myself had years of experience and training behind them. The consequent discussion of matters of common interest was not the least valuable of the results of my stay there, and the friendly interest taken in "the stranger within their gates" will always remain with me as a very pleasant memory and truly typical of the usual attitude of hospitality so generously bestowed upon visitors from overseas.

the papers, and before leaving are again tested. These results are filed and will in time supply valuable data on which to base future estimates of new students' peculiar aptitudes and will aid the appointments committee hugely in the guidance they can give to generations yet to come.

The ideal in the past has been for all high school students to go on to College. Some however are not fitted. A State College will not refuse an applicant who passes the tests, but if great weakness is shown, and the leeway not made up the first few months, the student is seen by the Dean and advised to withdraw.

The problem of marking hundreds of papers is surmounted to a large extent by objective questions, *i. e.* questions in which the personality of the examiner can play no part. The answers may take different forms. They may be of the Yes or No type, or may be the multiple choice answer, or the true or false. In the first kind Yes or No alone is the right answer. Pure guess work is allowed for by the correct score being the number of answers right $= \frac{\text{Number wrong}}{\text{Number of choices} - 1}$. In a multiple answer type of paper a number of alternatives are given, one of which is the right one and must be selected. The last type explains itself, as a choice must simply be made as to whether the statement given is true or false.

Tests were given almost daily on the reading prescribed for the next day, and the final examination consisted of a very large number of questions, often exceeding a hundred on the course covered in the term. The final position was the algebraic sum of the daily and the final tests.

The setting of a really satisfactory paper was a task which demanded much thought and skill on the part of the examiner, but the marking was mere clerical work and rapidly accomplished. This method of examination seemed to me to be peculiarly suitable for laying sound foundations in any subject. Either a student knew the work or did not.

where they get a real pick-me-up among the great ranges of the Rockies. At college they choose for themselves how they will live. Many hire a room which they look after entirely themselves, and do as well all their own cooking. Others prefer to get their meals at an hotel, as we should call it here. Others again go, as I did, to a recognised hostel. But the hostel provides no meals whatever. In common with many others, I went out to all meals to a nearby house where the lady catered at a flat rate for some thirty mealers. She had one lady to help her, and a couple of students earned their meals by serving and washing up afterwards. Breakfast was from 7 to 8-30 a. m., dinner from 12 to 1, and supper at 6. Everyone was punctual in the evening. At other times one stated when lectures ended and at what time it would be possible to arrive. Harford House, the hostel where I lived, and the nearest College block were a bare five minutes' walk apart, and in summer it was very pleasant strolling down under the trees to work, and feasting on the glorious expanse of green grass. Everywhere in the States the people take no end of trouble giving a daily hosing to the grass, which in better class houses always surrounds the building and runs down to the side walk, being continued again in a broad belt between walk and road.

Education almost everywhere in the U. S. A. is co-educational. There are many optional subjects, and the numbers attending certain lectures depend largely on the personality of the professor.

I heard the most stimulating course of history lectures at Greeley on "Problems of the Far East" that I have ever listened to anywhere.

The system of entrance examinations at Greeley interested me greatly. President Frasier has just succeeded in persuading his Council to allow him to accept students almost solely on the results revealed in a most comprehensive intelligence test. All students on entering must take

Dr. Terman himself lectured at Greeley for two and a half weeks, and to a large assembly of students. I attended his course, but my chief time was given up to three lectures daily on the Terman adaptation of the Binet tests, general Class tests in all subjects, and lastly the preparation of graphs and statistics which revealed at a glance the results obtained, and could also be easily tabulated and filed for reference.

Greeley Teachers' College, I learned later, is in status second only to Columbia as a Teachers' Training centre. Owing to the prevailing depression, the numbers attending had fallen last year to little over 800. Some classes in consequence had been eliminated, but for all prescribed courses (which teachers working for degrees were taking) the numbers were from fifty upwards.

As I wished to absorb the atmosphere of University life as far as possible, I decided to live in one of the College hostels. My first visit on arrival was to the Dean of Women. This official acts as adviser-in-chief to all women studying in an American College. She was not hard to find, for Greeley is only a small town and has really grown up round the College as its numbers have grown and its various economic needs increased.

Teachers' College comprises the older original building and the Training school a five minutes' walk away. Then in a new block there are the new classrooms, the large Assembly Hall where in winter net ball is played under cover, and the gymnasium and swimming pool. All teachers must take the prescribed course in physical instruction and organised games, and women take dancing as well. Staff quarters were also built on the Campus, as College grounds in the States are called.

Greeley is forty miles from Denver, the great mining town of Colorado, and the climate in summer is delightful. As Greeley is less than a hundred miles from the Colorado range, students usually go once a term at least to Estes Park

abreast, and everywhere as wide as the Bund leading to Secunderabad. I travelled by car some ten thousand miles in the U. S. A. last year, and except for some hundreds of miles, never left a paved highway. My chief purpose in going to the States was to study at first hand American methods in education. I knew I was returning to Hyderabad, and America with its large percentage of non-English speaking peoples would, I felt, be able to give me a host of fruitful suggestions.

On leaving England my ideas as to the best College to which to go were vague. I knew the work of Dr. Terman and his collaborators had resulted in a perfect mine of information on the psychology of genius, and I therefore wrote to Berkeley University to ask advice regarding the best College to which to go for my special needs. I had a very kind letter from Dr. Terman in which he pointed out that the numbers studying psychology alone at Berkeley ran into hundreds and that in consquence I could only do the usual set course prescribed for their students, which being, I think, a two years' one, I could not complete. I had suggested as an alternative Teachers' College, Greeley, Colorado, and he agreed with me that it would offer me in its vacation course all I needed. Even I knew that whatever I got would need considerable adaptation to suit Indian conditions, and as my time was limited, all I could hope to do was to get a firm grip of the fundamental principles, and for this a short intensive course would prove most satisfactory.

Summer courses are a feature of American University life. Skilled teachers for them are engaged from all over the States, and sometimes even from further afield. Miss Gullan, "the English" pioneer in verse speaking, was for example on board "the Georgic" on which I crossed to the U. S. A. She was on her way to give a ten weeks' course at Berkeley, California, in Speech work and Verse speaking.

Pestalozzi and others followed the lead of Rousseau and stimulated interest in the problem of the child and his education. Froebel adopted the motto: *"Come, let us live for our children"*. His Kindergarten is only the happy 'garden' of 'children'.

The Kindergarten is more a play-house than a work-house; Froebel gave "the gifts" to the child and taught the world that only by his own activity can the child learn anything. Dr. Montessori has carried the movement further and has formulated a complete scheme of sense-training and child-education.

The modern systems of child education are based on love and sympathy for the child, for "know you what it is to be a child? It is to have a spirit streaming from the waters of baptism; it is to believe in love, to believe in loveliness, to believe in belief: it is to turn pumpkins into coaches and mice into horses, lowness into loftiness and nothing into everything.

It is

To see a world in a grain of sand,
And Heaven in a wild flower,
Hold Infinity in the palm of your hand
And Eternity in an hour."

Life in an American Teachers' College

BY

Miss. F. N. WOOKEY, B. A. (Dublin), M. R. S. T.

The immensity of everything in the United States is probably the most outstanding feature to an overseas visitor. New York, one's first sight of the States, startles one with its towering skyscrapers, then the vast railway terminus, and as the journey is continued, the magnificent motor highways, wide enough where the traffic is heavy for four lines of cars

Charles Dickens was a humanitarian and his sympathetic pictures of children deserve to be studied. He had seen for himself the condition of many schools in England and had been struck with horror at the treatment meted out to boys. Mr. Squeers of Dotheboys Hall (in "Nicholas Nickolby") is a scoundrel whose cruelty and villainy was exceeded only by that of Mrs. Squeers. The boys were flogged within an inch of their lives by the ignorant and brutal schoolmaster and served by his termagant wife. We doubt if the picture can be true to life and we begin to suspect that the novelist has laid on the colours thick. Yet Dickens himself asserted that " Mr. Squeers and his school are but faint and feeble pictures of an existing reality, purposely subdued lest they should be deemed impossible."

George Eliot gives us a picture of Tom Tulliver's tutor in her book "The Mill on the Floss." The Rev. Mr. Stelling said that Tom's brain was impervious to Latin etymology and " was, therefore, peculiarly in need of being ploughed and harrowed by this patent instrument." He made the boy's life miserable by his cruel persecution.

All these illustrations are from the past and let us hope that no masters to-day are so brutal or so stupid as the Rev. Dr. Busby or Rev. Stelling.

Let us now turn to the other picture. It was in the nineteenth century that the child was first "discovered". Jean Jacques Rousseau in his "Emile" pleaded for sympathy and understanding in dealing with children and advocated a "natural education". He said, " Love childhood, indulge its sports, its pleasures, its delightful instincts", for as Wordsworth sang:

" Not in entire forgetfulness,
And not in utter nakedness,
But trailing clouds of glory do we come
From God who is our home:
Heaven lies about us in our infancy!"

bury and Prior! We all remember Mr. Spectator's allusion to Dr. Busby. Sir Roger de Coverley told Mr. Spectator "Dr. Busby! a very great man! He whipped my grandfather!" Another master, Keate, once flogged seventy-two boys at one sitting and on another occasion flogged a whole school of boys all night! Southey called these men "the phlebotomists" or "blood-letters!" There is a story of the painter Sir John Everett Millais, which, though of a later date, is apposite here. He had been at school only for two days when a master began to flog him, at which the boy was so incensed that he bit the hand of the master.

Doctor Johnson was considered a great authority on all subjects and particularly on the subject of education, for, had he not kept "an Academy at Edial near Lichfield for young gentlemen?" (The Laird of Auchinleck, father of James Boswell, who did not share his son's reverence for Johnson, once remarked sneeringly that "he kept a school and ca'd it an academy!") Well, Dr. Johnson believed that boys should be flogged before they could learn. His reminiscenses of his master, Mr. Hunter, are very interesting. This worthy gentleman whipped his young boys saying that he did so "to save them from the gallows!" Dr. Johnson himself had suffered at his hands, yet he bore him no malice. He said, "My master whipped me well; without that I should have done nothing."

Even the gentle and warm-hearted Goldsmith expressed himself to the same purpose. "I know of no passion that can conquer a child's natural laziness but fear of the rod." We remember the "noisy mansion" ruled by the village school-master, and how?

> "Full well the busy whisper circling round,
> Conveyed the dismal tidings when he frowned."

Goldsmith himself had played truant from school many a time and even when he was at the university suffered a thrashing at the hands of a brutal tutor by name Theaker Wilder.

From the literature of the Age of Elizabeth we catch a few glimpses of their systems of child education and of their attitude towards the child. Books like Ascham's "Schole-master" tell us some details of the manner and the method of a boy's education in those days. Classical studies were held in great esteem and every boy was sent to a Grammar school. Here children probably learnt "little Latin and less Greek" in spite of all the merciless use of birch and rod. In those days the child was valued for the promise of his future years. He was not an object of interest or of sympathy in himself and for his own sake. He was prized for his precocity, and fathers were proud of their children when they showed an interest in their studies beyond their years. Here is an interesting quotation from Evelyn the diarist. He lost a child aged five and he writes of him, "At two and a half years he pronounced English and Latin exactly. At five years he had got by heart almost the entire vocabulary of Latin and French roots, he could turn English into Latin and did the government and use of relatives, verbs, substantives, ellipses and tropes and had a strong passion for Greek!" This is learning indeed for a child of five! While we admire the precocity of this unfortunate child, we must feel eternally grateful to the spirit of the Age in which we live which does not expect or encourage so much weight of learning in a child.

In the Age of Addison boys and girls were trained for society and it was considered more important that they should learn manners than morals. Chesterfield advised his son, "The graces, the graces, remember the graces." Some one wittily remarked of Chesterfield's Letters that in these epistles his lordship taught his son "the manners of a gentleman and the morals of a dancing-master!". In those days masters were respected in proportion to their ability to punish. Dr. Busby, Headmaster of Westminster School, had the reputation of having flogged every great man of his generation. Among his pupils were Dryden, Locke, Atter-

tional theory or practice is so notable as the recognition of the true meaning and the true ideal of education. This recognition has brought about an entire and almost revolutionary change in the attitude to and treatment of the child in the school.

It is my purpose, in this article, to give a brief history and a few interesting stories illustrative of the attitude towards the child and his education from the dawn of the Christian era to our own day.

When Jesus was born in Bethlehem, 'the child' was the object of worship and adoration and Holy elders came with gifts of myrrh to worship the Christ. (The tradition of this adoration of the child survived throughout the Middle Ages but did not inspire sympathy or love in the hearts of men towards all children. Of this more hereafter.) Christ rebuked his disciples when they prevented children going up to Him and said, "Suffer little children to come unto me, for of these is the Kingdom of God." Again, He said, "Except a man have the heart of a child, he shall never enter into the Kingdom of Heaven."

St. Augustine, however, propounded the doctrine of Original Sin and said that "the baby new to earth and sky" inherits the sin of Adam. His instincts are essentially evil and education meant the repression of these evil instincts. "The offending Adam" should be whipped out of the child! Educational theory adopted this doctrine, and, throughout the Middle Ages and for three centuries after it, the education of the child was merely negative and consequently futile. The child was told 'not to do this' and 'not to do that' and all his instincts and impulses were "crabbed, cabined and confined", his imagination was never allowed to develop and his innocent curiosity was severely repressed or punished. "Spare the rod", they said, "and spoil the child". Their treatment of the child was almost brutal compared to ours.

entirely, and that, therefore, attempts be made to recognise them also in some suitable way;

(ii) that, as far as possible, examinations be made objective so that marking may not depend on personal whims and fancies;

(iii) that, marks be recorded at least four times a month, and that at least three of those occasions be unexpected by the pupils;

(iv) that, a five division scale involving letters or words be employed whenever possible in order to simplify valuation and secure a more even distribution of students in the scale.

(v) that, with a view to preparing more satisfactory examiners, provision be made in the Training College course for the theory and practice of evaluation work, and effective instructions be given to examiners on the ethics and technique of valuation work.

The Child Through the Ages.

BY

M. S. DORAISWAMY, M. A., L. T.

"*Look here upon this picture and on this*".

The contrast between the two pictures in Hamlet was perhaps not so striking as the contrast between the picture of the child and his environment yesterday and to-day. Barely a century ago the child was considered the embodiment of all evil instincts and wicked impulses, and child education consisted in the stern repression of these instincts. That 'education' really means a 'drawing out' (from the Latin *educare*) or a development of all the best instincts of the child was hardly understood by the wisest men of any age down to the nineteenth century. Nothing in recent educa-

the ordinary run of examiners should be obvious to any thinking person. Is it fair or reasonable to deduct marks for no cause at all, or to keep back more marks for what has not been written than one is prepared to give for what has been written ? When marks are withheld, it should be necessary for examiners and teachers to point out the missing points or facts as well as indicate the points or facts dealt with for which marks have been assigned. This will cure some of their unwholesome fear of approaching 100 or A. If marks are assigned for what a boy has written, no teacher need hesitate to be as liberal with his A's and B's as with his D's and E's or be afraid of losing the aweful regard and respect of his pupils.

As a rough check upon the total distribution of marks in various divisions of the scale for large numbers of students, it is suggested that one should find from five to ten per cent. A's, twenty to twenty five per cent. B's as with 25 to 40 per cent. C's, 20 to 25 D's and 5 to 10 per cent. E's. After assigning marks in a given term or examination, such a device will be found very helpful in making one critical of the accuracy with which one has distributed the marks. It is necessary to remember that a percentage distribution of pupils in five divisions ought to approximate, but not invariably to follow rigidly any specific set of percentage. Any teacher who awards an unusually large number of high or low marks should make sure that he is dealing with an unusual group of pupils. Extremes should be used sparingly. If the variability with which teachers mark is to be cut down and their marks made consistent in form of distribution with the abilities which they are supposed to measure, the marks will have to be distributed in rough accordance with the normal curve.

Summarising, it is suggested

(i) that, whenever marks be employed in the evaluation of a pupil's work, many splendid qualities, abilities and achievements are being ignored and left out of the picture

division. Basing marks upon rank or class, instead of on some fancied or imaginary standard of perfection, will help considerably to eliminate the results of temperamental differences in teacher and examiner.

There is always a wide variation in the distribution of marks in the different subjects of the same school, and among different teachers of the same subject or department. This lack of uniformity is shown in the fact, that whereas one teacher "fails" one-third of his students, another gives excellent marks to a third, and distributes the others almost equally among the other four divisions. This becomes a matter for interference from the authorities when teachers are discovered with a desire to win a reputation for rigid requirements, and who delight in a multitude of low marks. Certain studies show that of the instructors in the same department and institution, one gave none failure marks, and the other gave none the mark of "Excellent". And yet there must have been a few very good pupils, and a few very bad pupils in that group.

Many teachers fight shy of giving more than 70%, but they never hesitate at the lower end of the scale. Asked, what it is that the student might have or should have written to deserve the other 30 marks, they have often nothing to say, beyond that it is the standard of the valuation of the public examination for which the boys are being prepared. This explanation, while not carrying justification with it, serves to point out the urgent and absolute need that there is for seeing that examiners are given an effective course of training for their job, and are instructed very definitely about their duties and responsibilities. The influence they exert for good or for bad on school work and teaching technique is often greater by far than that of all the instruction of the regular training college. Hence the desperate need of ensuring a satisfactory supply of trained examiners. The injustice being done to the candidates by

A		
B		(A
C	or	(B - being average or medium.
D		(C
E		

A slight variation of the same is used in some schools providing for six groups or classes instead of five or three.

AI		A plus
A2		A minus
BI	or	B plus
B2		B minus
CI		C plus
C2		C minus

the 'pass mark' being B2 or B minus.

The percentage numerical scale is misleading and fallacious. Unfortunately, it is the only universally understood system, and is preferred by students and parents because of its apparent definiteness. The chief defect is that it directs attention towards the absolute rather than towards the relative standing of pupils. This system also lends itself to unprofitably fine distinctions. Who can conscientiously distinguish between two rival papers getting 59% and 60%? And yet, so much depends on that. It is doubtful if the ordinary run of teachers can distinguish with a fair amount of certainty differences smaller than five points or marks. In view of the difficulty, if not impossibility of making fine distinctions, it is suggested that the alphabetical or letter marking be adopted wherever possible. The degree of disparity between the standards of two teachers of the same subject or in the school will be much smaller than if they used the percentage basis. The securing of this larger amount of agreement is no small gain. In the valuation of class essays as well as at the end of an examination marking, it will be found distinctly advantageous to decide where the boy falls, in the A., B., C., D., or E.,

There is considerable difference not merely in the frequency, but also in the matter of regularity. Some schools set apart a day every week or month. Others believe that it is better to take the pupils by surprise, and therefore have no specified time or times for the purpose. If four or five estimates are to be made a month, one of them may well be based on a regularly announced review of the month's work. The others may be unexpected, oral or written tests, so that the students may get into the habit of being always prepared. This 'ever-readiness' is one of the ways of mitigating the danger to students' health sometimes caused by annual and public examinations.

What Marks?

Since marks are only signs indicating the teachers or examiner's estimate of the student's performance, some variety is noticeable in this also.

The most common practice seems to be to adopt the percentage basis, or what is not very different from it, marks on a maximum of ten or five. This numerical evaluation seems to be most popular, and is probably the oldest.

Not so common in India, though fairly universal abroad, are verbal indications of quality. Some institutions adopt the classification:—

1. Excellent E
2. Good G (Good.)
3. Fair F or (Fair-being the medium or average.)
4. Poor P (Bad.)
5. Bad B

and either use these words or the first letters.

Not so common just now (or different) but increasingly common are alphabetical marks of evaluation.

coverable and unmeasurable by those producing them, for it must not be forgotten that the work of a school lies in changing pupils along several distinct lines, ideals, attitudes, skills, habits, knowledge and appreciation. Only the easily measurable have been given prominence, if not exclusive attention, in our testing and marking, and we have often behaved as though these fields either did not exist, or at any rate, did not matter. Schooling was meant for the mind, and especially for that part of the mind responsible for the recalling or reproducing ability. It is time that increasing attention were given to those other aspects of a pupil's being, and that attempts were made more frequently to devise ways of recognising and evaluating progress along the above mentioned lines.

Mark When ?

The frequency of assigning marks appears to depend on what they are given for. Sometimes students' work is evaluated only once a year ; more often, three times a year at the terminal examinations ; oftener, monthly. Still more commonly, marking is done two or three times a month. And there are many institutions where teachers make use of their marks registers almost daily.

If the purpose of marking is to register the quality of a pupil's work, there is much to be said in favour of taking records about four or five times a month. This frequency will give a general picture of the boy's average performance ; and its infrequency will rob it of its wasteful and deadening aspects. There is more likelihood of a fairly correct measurement being obtained if the occasions for recording are multiplied, and yet not so much that most of the time of the class and the teacher is spent in marking. It is suggested that each boy should be given at least one chance a week for registering his work, and that marking be spread over four or five days. This refers, of course, to class marks only, which usually constitute the chief item in the marks register.

scores are secured if the test or essay is valued by different examiners. Awarding "marks is, therefore, the very antipodes of true measurement." The investigations of Starch and Elliot in America prove that teachers differ to a surprising extent in marking the same piece of work on a percentage scale, and an experiment performed in Mysore some years ago confirms this belief.

The chief solution for this difficulty lies in making the tests objective by adopting the newer forms of examination rendered familiar by the Intelligence Test movement. A good deal of the work in certain subjects requiring marking could be reduced to such forms. When that is done, there will be no question of the personal equation, or different examiners being interested in different things. The answers will then not beg for marks but demand them. Marking will be more or less automatic and impersonal.

Marks for What ?

At the present time, it is found that marks are usually given for:—

(1). Written examinations of all kinds—Annual, terminal, periodical (monthly, weekly, daily);

(2). Oral examination—varying in importance and the quantity covered ;

(3). Exercises of all kinds—essays, translations, records etc.,

(4). General or abstract matters—conduct, neatness, regularity etc.,

The chief limitation of measuring the progress of a pupil or the work of a school is to be found in the infinite complexity of the elements involved. It is a sobering reflection for marking enthusiasts that not only are many results of education long deferred, but some of the most important are now, and perhaps, will always remain, undis-

Why Marks?

Marks of some kind are considered to be necessary for several purposes. From the point of view of the pupil, they indicate the quality of his performance and reveal the progress made by him from time to time. They show the standing of a boy in relation to his fellows and to the standard expected. They, therefore, serve as a great incentive to greater industry, ambition and perseverance. Last, but not least, it is such appraisal which determines the pupils' fitness for promotion to the higher class.

So far as the teacher is concerned, marks enable him to know the effect and results of his work, for his success or failure is often mirrored in the marks the pupils get. It provides the teacher with a means for judging the comprehension and intelligence level of the pupils. In a sense, therefore it also gives the authorities a basis for estimating the efficiency of the instruction and the work done during the year. In marking his pupil's work, the teacher, it may be said, is marking his own work. More than this, there is diagnostic value in marks, for they can reveal defects which must be set right.

There are other parties besides pupils and teachers and school authorities who are interested in marks. The parents desire to know what their children are achieving. Employers demand information regarding the academic achievements of candidates who go to them for appointments, and in a world of competition, the degree of success often acts as a determinant. The public is keen on knowing how different classes and schools fare in the great annual and general tests as judged by the marks obtained by the students.

By way of criticism, it must be pointed out that marking being almost invariably an indication of a personal estimate, there is most often no objectivity. Marking can be said to be objective only when practically the same

(5). The amount of pension depends upon the total income of the teacher. It is not calculated on the last year's income, but upon the average income of the five years before retiring.

(6). Widows of teachers are also entitled to a pension, which generally amounts to 1/8 of the husband's average income during the last five years of his service. Widows get this pension whether the husband dies in service or after retirement.

Teachers' children, as a rule, do not get any pension, but in certain cases they are provided from a special fund reserved for the purpose.

Women Teachers.

The same rules and regulations exist for women teachers as for men, the only difference being that, when employed they get a lower salary than men. Before they enter the teaching profession, they have to receive the same type of training as men, the conditions of admission to training institutions being exactly the same as for men. The course of training for women is the same as for men, the only difference being that handwork comprising sloyd and needle-work is compulsory for women.

Remarks on Marks.[1]

BY

Dr. G. S. KRISHNAYYA, M. A., Ph. D., H. E. H. the Nizam's Educational Service.

The subject of this paper is probably as old as instruction and as universal as evaluation. From the time that children were brought together for formal education, and their performance had to be appraised, from that time marks of some kind have been given. There is, therefore, nothing new in the subject. In fact, the reason which has prompted the undertaking is this very universal prevalence, and the necessity, therefore, to take stock of present practice. The object here, then, is to critically survey the marking system as it obtains commonly now, and briefly to discuss ways and means of improving it.

---

1. A paper read at the 9th. All India Educational Conference held at Karachi in December, 1933.

Drill Masters.

There are no special Drill Masters in the Elementary schools; ordinary teachers take drill. In the Gymnasium and Middle schools attached to the Gymnasium, there are gymnastic teachers. These teachers, if they are able to teach other subjects, are paid like other ordinary high school teachers, otherwise these salaries are a little lower at the start and rise only to about 2/3 of the salary of the ordinary gymnasium teacher.

So far we have described the teachers' emoluments which they receive from the State. Now we shall say a few words about the reward of their labour that they get from the public. Their reward from the public does not come in form of material support, but moral support and their high position in society.

Teachers in Denmark are a highly respected class of society. They have a distinct place in society. In rural area they are the moving spirit, being leaders of the community, its friends and advisers. It is recognised in every village and city that it was through the untiring services of teachers that Denmark regained its lost power and prosperity.

Pension.

Pension rules are very liberal. General rules concerning pensions are: —

(1). Permanently employed teachers only are entitled to pensions. Assistant teachers temporarily engaged, hour-teachers and apprentice-teachers cannot claim any pension.

(2). The applicant must show at least 5 years' service.

(3). The age of applicant must be at least 30 years. Pension is usually given for old age, but teachers above 30 years can also ask for pension on account of constitutional weakness, ill-health, etc.

(4). No pension is given to such teachers as are young and fit and wish to retire to take up some other occupation as a means of livelihood. Exception to this rule is made only in favour of those who are compelled to leave the teaching profession owing to some infectious disease such as tuberculosis.

reaches the maximum of 9000 kroners in two increments of 600 which he receives every 3 years.

Lecturers.—A lecturer starts on 5400 kroners and reaches the maximum of 7200 kroners with an increment of 600 kroners every 3 years.

Assistant Lecturers.—An assistant lecturer starts on 3480 and gets an increment of 360 kroners every 3 years until the maximum of 5640 kroners is reached.

Teachers.—A teacher starts on 3000 kroners and reaches to the maximum of 4800 kroners with an increment of 360 kroners every 3 years. From these salaries 3% are deducted as contributions to pensions.

Besides their salaries, all the teachers are entitled to a supplementary allowance, which is called dear-time allowance, the amount of which depends upon the conditions of the town in which they are posted. Usually, the amount of this allowance is 216 kroners a year for married teachers, 108 kroners for unmarried teachers of above 35 years of age, and 72 kroners for unmarried teachers under 35 years. Then there is another allowance called the "local supplement" which for teachers living in Copenhagen is 495 a year, in other big towns 450 kroners and in middle-sized provincial towns 330 kroners per year. It will be seen from the above figures that the teachers of the high schools are highly paid servants of the State.

Drawing Teachers.

There is no special training for Drawing-teachers. Every teacher knows drawing. In the elementary schools no special drawing-masters are employed, ordinary teachers being required to teach the subject. In the Middle Schools a part-time drawing teacher is employed and he is paid according to the number of hours he works. The rates are rather low. No drawing is taught in the high schools.

	Kroners.
Salary from Commune.	1000
State increments.	1000
House rent.	300
Garden.	50
Fuel.	150
Church.	100
Total.	2600

It might be mentioned that the scale of salaries varies in different communes, but the variation is very slight. It must be remembered that living in Denmark is not so expensive, especially in the country, as in England or some other countries of Europe or America. In a country place of Denmark one can keep a decent little house of 6 or 7 rooms with a servant and live respectably on about Rs. 200 a month.

Middle School Teachers.—The scale of salaries for teachers of Middle Schools is the same as for those of Elementary teachers.

High School Teachers.—It has been already mentioned that a high school teacher must be a University graduate having taken the 6 or 7 years of training in the University. In view of the higher qualifications and the longer period of preparation, his remuneration is much higher than that of the elementary or middle school teachers. There are 4 types of teachers in a high school :—

1. Headmaster 2. Lecturer 3. Assistant Lecturers 4. Teachers.

By the operation of the act of public functionaries of 27th June 1927, the annual salaries of the high school teachers are as follows :—

Headmasters.—The Headmaster's salary is $7800\text{-}\frac{600}{3}\text{-}9000$.

That is, a headmaster starts on 7800 kroners per year and

150 kroners per year. The area of a garden for the head teacher is generally from ½ to 1/3 acre. In case a garden cannot be provided, the head teacher is given from 250 to 300 kroners per year.

Under the law all teachers are entitled to the fuel allowance. This is for heating the house and for kitchen purposes, which for head teacher is 120 kroners per year. Besides, they get 120 to 200 kroners per year from the Church for being in charge of the choir.

The annual income of a head teacher of a Danish Elementary School who has finished 20 years' service and who is not provided with a house or garden but is paid for these, will be something like the following:—

	Kroners.
Salary from Commune	1400
Amount of increment from the State. ...	1000
House Rent.	500
Fuel.	300
Garden allowance.	150
From Local Church.	120
Total	3070

In Indian currency this works out roughly at Rs. 225 a month.

Assistants:—Assistants in Elementary Schools start usually on 1000 kroners and by increments get another 1000 kroners from the State, which brings the maximum salary to 2000 kroners. Like the head teacher, an assistant is entitled to a house and a garden. If these are not provided, then he gets a house allowance of at least 380 kroners and for his garden 50 kroners. For fuel he gets nearly 150 kroners. The Church pays him 100 kroners per year for playing the organ. Thus an assistant who finishes 20 years' service and who is not provided with a house gets the following:—

Teachers' Salaries and Allowances.

Now, I come to the most important part of the subject, *i. e.* salaries. As such elaborate preparation is required of all teachers, the State in return pays for the services in a way commensurate with the time spent and effort made in preparation. The people of Denmark recognise that their regeneration has been due to teachers. All the wealth and population that were lost in the disastrous German Wars were regained chiefly through the efforts of school masters. Realising this, they give them as a reward high social rank. They respect them, serve them and also obey them as their leaders. There are two scales—higher and lower.

Salaries of Elementary Teachers.—The ordinance of 1908 made very satisfactory provision for the care and keep of teachers, especially the rural teachers. Now in Denmark the Headmaster, called "The First Teacher," usually starts on a salary of 1400 kroners per year from the commune and the State adds to this two hundred kroners every 4th year until the total of 1000 kroners per year is reached. So if a teacher starts on 1400 kroners, he gets a total of 2400 kroners per year at the end of 20 years. Supposing a teacher starts on 1400 kroners, his salary for the first 4 years will be the same which he will get from the commune funds. At the end of the 4th year he will receive an increment of 200 kroners per year from the State and thus his salary will be 1400 from commune, 200 kroners from the State, *i. e*, 1600 kroners for another year. He will go on like this getting increments from the State till the maximum of 2400 kroners is reached. It should be clearly understood that the commune pays the initial salary of 1400 kroners and the increments are paid by the State.

Besides this salary, the head teacher gets a decent house and where a house cannot be provided, which is very rare, an allowance of at least 500 kroners per year is paid for the house. It might be even more. For a garden they get

3. That they have been trained in a seminary and passed the examination.

4. They must have served for at least one year as assistants, substitutes, etc., in provisional, private or winter schools. For Principalship 2 years' teaching experience is required.

Length of tenure and age of teachers.

Permanent teachers hold office during life and good behaviour. This has many advantages. The teacher from the first feels that he has entered upon life in the community and finds it worth while to "grow up with place". Teachers may be expelled from their positions on account of gross immorality or misfeasance, but such cases are very rare. They are suspended for neglect of duty.

Teachers' Transfers.

In Denmark early transfer is a thing unknown, the minimum time a teacher remains in one place being ten years. If it appears that the teacher has outgrown his usefulness in a given community on account of incompatibility of temperament or by having "got into a rut" or some other reason, he may be transferred to some other school where he will fit better.

As to the age of teachers, no one is employed below 20, and several continue in service up to the age of 70 and over.

Number of hours per week teachers have to work.

Teachers of Elementary Schools have to work 36 hours per week. Teachers between the ages of 55 and 60 work only 30 hours. Teachers of Middle Schools work 27 hours a week.

Out of these any one subject can be selected as major and any other as minor. Gymnastics & Religion are compulsory for all. The time required is 11 semisters.

Although, as a rule, in all these groups one major and one minor subject are taken, still the students have the option of taking two minor subjects in each group.

Examinations.

The examination is conducted by the University and is always a very fair test of ability. The students have to satisfy the examiners that they have studied the subjects thoroughly and have a fair command over them.

The theoretical course is followed by a half-year's course in practical training in a gymnasium under the guidance of experienced teachers, at the end of which the candidate gives two lessons in the presence of the examiners. A student after passing both the theoretical and practical examination has the right to call himself "Candidatus Magisterii" or Magisterii Artium". When he secures a position in a gymnasium, he is called "Adjunct". When he gets older, he is called "Lector".

How one Becomes a Permanent Teacher.

Graduation from the seminaries does not necessarily carry with it a government appointment to a permanent position. Before he secures a permanent call, a candidate must fulfil the following conditions :—

1. A candidate for the principalship and teachership of an elementary one-room school must have attained the age of 25 years. Others, i. e., assistants, must be 21 years of age.

2. They must present a certificate from a reputable physician that they are not suffering from tuberculosis or any other infectious disease.

teachers in high schools join the University after completing the Gymnasium Course and take either literature faculty, historical faculty or mathematical and scientific faculty, according to the course which they have studied at the gymnasium. A few years ago it took one nearly 8 years—7 years theoretical and one year practical work—before one qualified oneself for the post of a teacher in a high school, and in each faculty one had to take one major subject and 2 minor subjects. As this led to a rapid decrease in the number of graduates, the university had to reduce the time to about 6 years. It is now officially 10 semisters of seven months each, but in practice the time taken is 12 semisters or 7 years. The degree can now be taken with one major subject and one minor subject. The course of study is as follows :—

1. Language Course.—1. Greek and Latin. 2. French or English. 3. German. 4. Danish. 5. History. 6. Religion. 7. Gymnastics.

Out of the first 5, the student can choose any one as major and the other one as minor subject. 6 & 7 are compulsory and must be taken by every one.

2. Historical Course.—*a.* History. *b.* Geography. *c.* Religion. *d.* Gymnastics.

Out of 1 and 2, the student can take any one as a major and the other as a minor subject. Religion & Gymnastics are compulsory for all.

3. *Mathematical & Scientific Course.*—This consists of two groups—A. & B.

a. In Group A are the following subjects :—

1. Mathematics. 2. Astronomy. 3. Physics. 4. Chemistry.

Out of these any one can be taken as the major subject and another as a minor subject. Religion and Gymnastics should be taken by all. The time required for this is 10 semisters.

b. Group B consists of the following subjects :—

1. Zoology. 2. Botany. 3. Physiology. 4. Geology.

As has been mentioned already, every Danish teacher must know music, which plays an important part in the daily school programme. Most of the lessons begin with a song and end with a song.

Writing is done during the first year for one hour per week. Danish teachers generally write a very good hand and expect the same from their pupils. It was a pleasure to me to see the neat copies of the Danish school boys and girls with their clear handwriting therein. On the whole, the teaching and the training in the Seminaries are thorough and the discipline is very strict.

The policy in the Danish Normal Schools is to teach a large number of subjects by reducing the number of hours in a week to a minimum for each subject, instead of finishing certain subjects in one year and substituting the others in another year. The same subjects are continued during all the three years so as to keep them fresh in the minds of the teachers.

At the end of the third year, a very stiff examination is taken, which is controlled by the Ministry of Education.

In the Seminaries the would-be elementary teachers are also thoroughly trained for country life, which they learn to love and appreciate.

Middle School Teachers.

There are no separate Seminaries for the training of Middle School teachers, but they are trained in the same Seminaries as are intended for elementary schools, the only difference being that they have an additional course in certain subjects. Those who have had university training are also appointed as teachers in the Middle Schools.

Gymnasium Teachers.

The teachers for the high schools are trained at the University of Copenhagen. Those who wish to become

Drawing.	2
Music.	2
Gymnastics.	3
Study of Human Body.	1
German.	1

2ND YEAR.

Religion.	2
Danish.	5
Pedagogy.	2
Geography.	3
Natural History.	3
Physics.	3
Mathematics.	4
Accounting.	3
Writing.	1
Drawing.	1
Music.	2
Gymnastics.	3
German.	1
English.	1

3RD YEAR.

Religion.	5
Danish (History of Literature, Study of Classics).	5
Pedagogy.	6
Practice teaching in Practising Schools. ...	10
European History.	4
Music.	3
Gymnastics.	3
Drawing.	1

It should be noted that during the first year most of the time is devoted to general cultural subjects and very little time is given to Pedagogy, which is taught for two hours per week. In the third year the time for other subjects is reduced and 16 hours are given to Pedagogy. Gymnastics is taught throughout the course to keep the teachers in a fit condition and to train them to be of help in the primary schools.

The subject called "Accounting" consists of mental arithmetic and the teachers are expected to be fairly strong in this subject, as much importance is attached to mental and practical arithmetic in the Danish elementary schools.

1. They must have served one full year's apprenticeship in some school recognised by the Ministry of Education and must have received a certificate from the head of that school testifying that the candidate has an aptitude for the teaching profession and is a desirable person. In case a person is not found fit for teaching, the certificate is withheld, and he cannot get admission into any normal school and consequently can never become a teacher. This step is taken to protect the Department from inefficient and incapable persons.

2. They must furnish Baptismal, Confirmation and Vaccination Certificates.

3. Must be 18 years of age.

4. Must produce evidence of good moral character and a certificate of health.

5. Finally, the candidate must pass the Admission Examination in the following subjects :—

a. Arithmetic and Elementary Algebra.
b. Outlines of Natural History.
c. Geography with special reference to Denmark.
d. History of North or Outlines of General History.
e. Test in reading Danish and writing Danish Composition.
f. Elements of Danish Grammar.
g. Bible History.
h. Test in Knowledge of Music—must be able to play the violin.

Courses of Study in Normal Schools.—The course is of 3 years. Below are given the subjects taught and the hours allotted to each subject per week:—

1st Year

Subjects.	No of hours.
Religion.	4
Danish.	5
History.	3
Geography.	2
Natural History (Botany and Zoology). ...	3
Mathematics.	3
Arithmetic.	2
Accounting (Mental Arithmetic.) ...	3
Writing.	1

The Danish Educational System

BY

SYED MOHAMED HUSAIN JAFERI, B. A. (Oxon),

Deputy Director of Public Instruction, Hyderabad-Dn.

(Continued from the previous issue.)

IV

Teachers

The Danish teachers are thoroughly trained, well paid, and content with their lot. They rank highly socially and in most cases make use of their opportunities to become community leaders and organisers.

In Denmark, as elsewhere in Europe, teaching is as much a profession as Law, Medicine or Engineering. No one can get a permanent job as a teacher in any school who is not a graduate of a normal school or who does not hold a university degree. Non-graduates may hold such places as those of apprentice teachers, hour-teachers and substitute teachers, but they are not considered as teachers in the real meaning of the word.

Elementary School Teachers

The Elementary School Teachers are trained in Seminaries or Teachers' Colleges, of which there are about 29 in all. Four of these Seminaries are managed by the State, while the other 15 are private. Private Seminaries receive liberal grants from the State. The work in all of them is under the strictest state supervision. Entrance requirements, courses of study and final examinations are similar in all the schools-State as well as Private. Every Seminary has an elementary school attached to it to serve as a practising school.

Candidates for admission must satisfy the following conditions before they can enter the 1st year class :—

THE HYDERABAD TEACHER

CONTENTS.

PAGES.

THE DANISH EDUCATIONAL SYSTEM BY SYED MOHAMED HUSAIN JAFERI, B. A., (OXON), Deputy Director of Public Instruction, Hyderabad, Dn. 153

REMARKS ON MARKS BY DR. G S KRISHNAYYA, M. A., Ph. D., H. E. H. The Nizam's Educational Service 165

THE CHILD THROUGH THE AGES BY M. S. DORAISWAMY, M. A., L. T. 173

LIFE IN AN AMERICAN TEACHERS' COLLEGE BY MISS F. N. WOOKEY, B A., (DUBLIN) M. R. S. T. 178

THE "DAY-DREAM" AMONG CHILDREN ITS SIGNIFICANCE IN EDUCATION BY H. SUNDER RAO, M. A, (Madanapalle College). ... 184

MODERN METHODS OF EXAMINATIONS BY G. SUNDARAM, B. A., Principal, Methodist Boys' High School, Hyderabad-Dn... 190

THE HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION: EDUCATIONAL EXHIBITION, 1934. 196

List of Schools in the Head-Quarters Division which have contributed to His Excellency The Viceroy's Bihar Earthquake Relief Fund ... 197

H S. L. C. Public Examination Results, 1934. 199

EDITORIAL 200

REVIEWS 202

VOL. VIII. REGISTERED ASAFIA NO. 47. NO. 4

THE

HYDERABAD TEACHER

APRIL—JUNE, 1934.

Quarterly Magazine of the Teachers' Association,
Hyderabad-Deccan

Under the Patronage of
Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M. A.,
Director of Public Instruction.

Editorial Staff

SECUNDERABAD-DECCAN.
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.
1934.

Annual Subscription Rs. 3.

VOL. VIII No. 4.

THE HYDERABAD TEACHER

APRIL—JUNE, 1934.

Editorial Staff

S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab.) *Chief Editor.*
F. C. PHILIP, M. A.
M. ATAUR RAHMAN, B. A.

SECUNDERABAD-DECCAN,
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.
1934.